بڑا آدمی
نسیم سحر قریشی
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PP
پاکستانی پوائنٹ

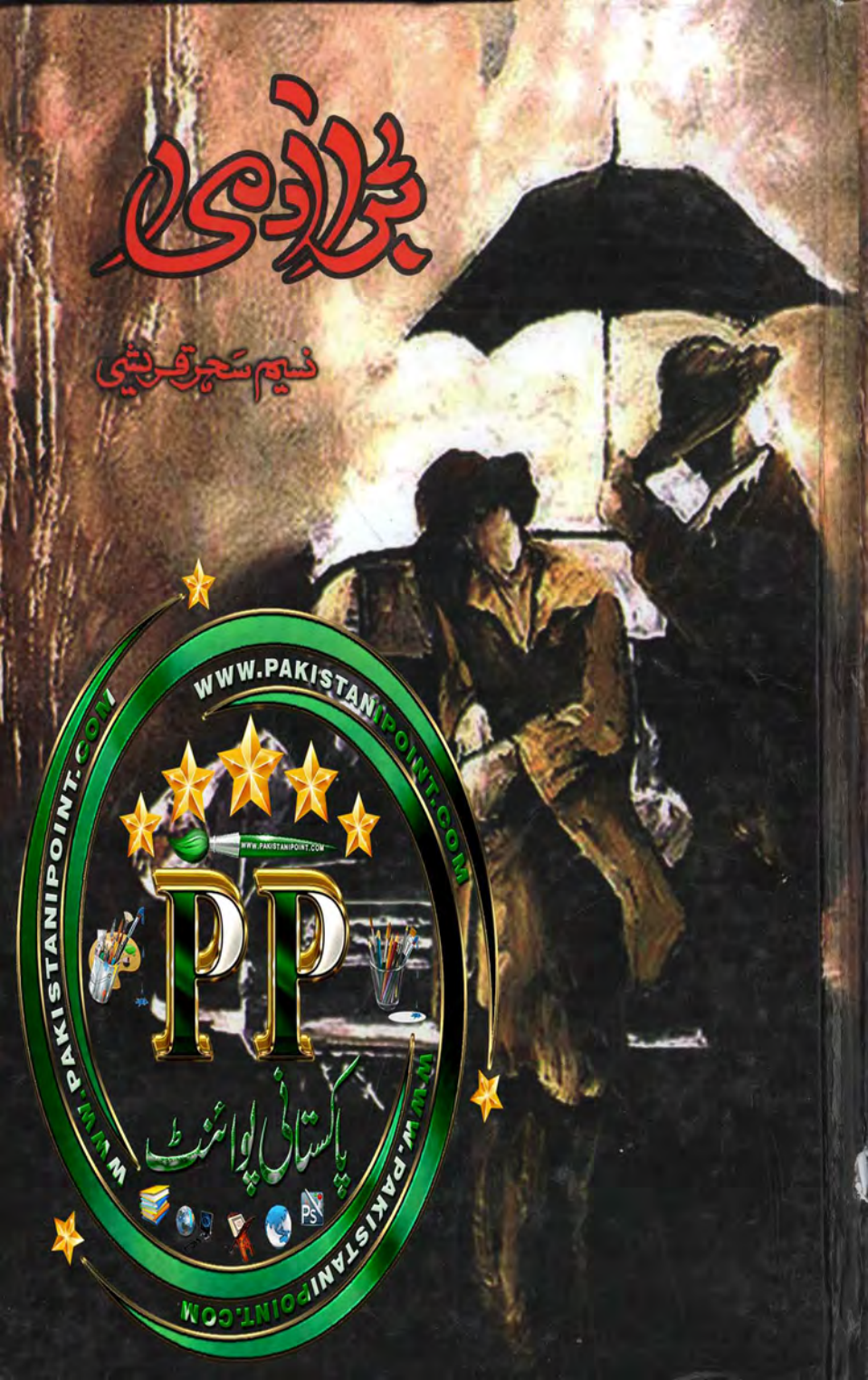

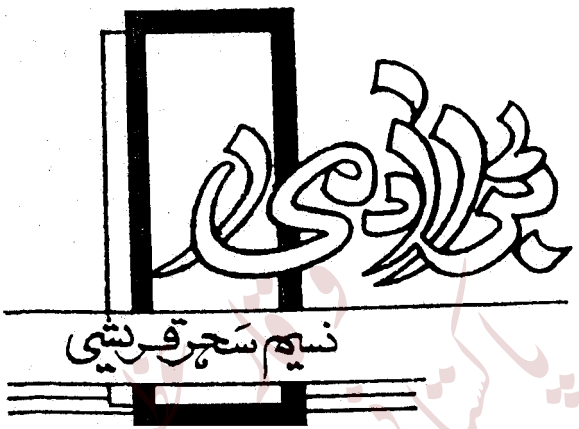

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

خواتین ڈائجسٹ
37۔اُردو بازار، کراچی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اول 2013ء
ناشرین ..... خواتین ڈائجسٹ
پریس ..... پرنٹ لائن
قیمت ..... 300 روپے

مکتبۂ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار کراچی

بڑا آدمی

سنگی حویلی کا آہنی گیٹ بھی خوش بختی کے دروازوں کی طرح بند تھا۔ چھت کی ہیڈ لائٹس آن تھیں۔ گیٹ کی اڑی اڑی نیلی رنگت ویرانی کی ساری داستانیں سنا رہی تھی۔ فضا میں چار سو بکھری چاندنی خاموشی کی بنا پر پُراسرار لگ رہی تھی۔ خاموشی کی اس چادر کو مسلسل بجتے ہارن نے تار تار کر ڈالا تھا۔ یہ جوہر آباد تو نہ تھا نہ ہی رنگینیوں سے بھرپور لاہور کہ رات کے نو بجے بھی دن کا سماں ہوتا۔ شہروں میں رات اُترتی ہی کہاں ہے۔ وہاں تو ہنگامے برپا رہتے ہیں۔ زندگی جواں رہتی ہے۔ گاؤں میں تو دن چڑھتا بھی جلدی ہے اور شام کے سائے ڈھلتے ہی کھیت اور پگڈنڈیاں ویران ہو جاتی ہیں۔

وہ دروازہ کھول کر نیچے اتر آئے۔ ہارن کی آواز اندر کی دنیا میں کوئی ہلچل نہ مچا سکی تھی۔ پچیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اس در پر کوئی دستک ان ہاتھوں نے نہ دی تھی۔ اُن کے ہاتھ کانپ کانپ گئے۔ قدم رُک رُک گئے۔ احساسِ جرم ساری قوتیں زائل کر دیتا ہے نا۔ اُن میں بھی دستک دینے کی جرأت نہ تھی۔ حالانکہ چار سو میل کا سفر طے کر کے وہ یہاں پہنچے تھے پھر بھی کچھ دیر پہلے وہ ذرا بھی تھکن محسوس نہ کر رہے تھے لیکن اب یوں لگا کہ جسم و جاں، دل و دماغ سب تکان زدہ ہی ہیں۔ ان کے ہاتھ بڑھے۔ اور دستک کی آواز سناٹوں کو چیر گئی۔ ایک بار، دو بار، تین بار۔

بڑی دور سے کسی کے کھانسنے کی آواز سن کر ان کا دل تیزی سے دھڑکا۔ اور جیسے پھر ایک دم رُک گیا۔ بڑھتے قدموں کی آواز کانوں میں آتی رہی۔ آنے والا شاید کوشش بسیار کے بعد بھی اُن تک نہ پہنچ پا رہا تھا۔ پھر آہنی گیٹ کی زنجیر کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی دروازہ کھلتے ہی ایک نحیف و نزار وجود جھکی کمر کے ساتھ اُن کے سامنے آ گیا۔

بھرپور چاندنی میں بھی اُنہیں آنے والے کو پہچاننے میں خاصی دقت ہوئی۔ بوڑھے آدمی نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے انہیں بغور دیکھا۔ ماہ و سال نے گو ہزاروں تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ لیکن ایک خادم اپنے مالک کو کیسے نہ پہچان پاتا۔ جبکہ عمر گزری ہی اس دن کے انتظار میں ہو۔ فرطِ مسرت سے کانپتی آواز اُن کے کانوں میں آئی۔

''چھوٹے مالک۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ چھوٹے مالک ہی ہیں نا۔ میری بوڑھی

نظروں نے دھوکا تو نہیں کھایا۔'' آواز کانپ کانپ گئی۔

''یہ ہم ہی ہیں امداد حسین۔ یہ ہم ہی ہیں۔'' وہ بے اختیار امداد حسین کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گئے آقا و غلام کے فرق کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے، بے اختیار ہی بوڑھے امداد حسین کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُن کا دل تو مسلسل چار دن سے رو رہا تھا اب بھی دو موٹے موٹے قطرے آنکھوں سے نکل کر بوڑھے کی میلی پگڑی میں کہیں جذب ہو گئے۔

وہ جیپ میں آ بیٹھے اور تھوڑی دیر بعد وہ اندر احاطے میں جیپ لا چکے تھے۔ قدم قدم کے ساتھ ایک یاد وابستہ تھی۔ برآمدے کی کشادہ اور اونچی اونچی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے وہ راہداری کی طرف بڑھے تو یوں لگا ابھی ایک مترنم آواز اُن کے کانوں میں جلترنگ سا بجائے گی۔ ابھی فضاؤں میں کوئی رنگین آنچل لہرائے گا۔ ابھی کوئی مضطرب ہو کر اُن سے دیر سے آنے کا سبب پوچھے گا۔ سب کچھ یاد تھا۔ ایک ایک لمحہ۔ ایک ایک پل۔ ہر ادا، ہر انداز، بھولے تو نہ تھے۔

''چھوٹے مالک۔ رک کیوں گئے؟ اندر چلیے نا۔''

وہ ہڑبڑا کر چونکے۔ ''آں۔ ہاں امداد حسین۔ اندر چلنا چاہیے۔''

دیوان خانہ اُسی طرح آبنوسی فرنیچر سے سجا تھا۔ قدیم طرز سے آراستہ اس کمرے میں آ کر انہیں یوں لگا۔ وہ کہیں بھی نہ گئے تھے۔ ہمیشہ سے اسی جگہ آباد تھے۔ ماضی اور حال میں بس دن اور رات کا فرق تھا۔ یہ جگہ انہوں نے دن کے اجالے میں چھوڑی تھی۔ اور رات ہوتے ہی تاریکیوں سے گھبرا کر یہاں پناہ لینے آ گئے تھے۔

کتنی دیر وہ دروازے میں کھڑے کمرے کا جائزہ لیتے رہے۔ ایک ایک چیز صاف ستھری قرینے کے ساتھ اپنی جگہ موجود تھی۔ قالین کے دیدہ زیب رنگ زمانے کے حوادث کا مقابلہ شاید حوصلے کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ انہوں نے قدم بڑھائے اور ایک صوفے پر بڑے تھکے تھکے سے گر گئے۔ امداد حسین باہر چلا گیا تھا۔ موم شمعوں کی روشنی میں۔ وہ خود اپنے آپ کو پراسرار لگنے لگے۔

چند لمحوں بعد پوری حویلی گویا جاگ اٹھی تھی۔ ڈھیروں اجنبی چہرے اُن کے سامنے تھے۔ ادب سے اُنہیں سلام کرتے۔ حیرت سے اُنہیں دیکھتے۔ ان کی موجودگی کا یقین اپنے آپ کو دلاتے۔ اندر کمرے میں آتے ہی انہوں نے بھاری لانگ کوٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ کمرا بے حد گرم تھا۔ آتش دان میں دہکتے کوئلے اس بات کے گواہ تھے کہ اُن سے قبل اس کمرے میں کوئی رہا تھا۔ امداد حسین نے ایک نوکر سے آتش دان دوبارہ جلانے کو کہا اور خود ان کے قدموں میں قالین پر بیٹھ گیا۔

''اشتمال اراضی ہو رہی ہے نا سرکار۔ تحصیلدار صاحب اور ان کا عملہ دو دن حویلی میں ہی مقیم رہے ہیں ابھی آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے نور پور کی طرف گئے ہیں۔'' امداد حسین نے اُن کی خاندانی روایات میں فرق نہ آنے دیا تھا۔ مہمان داری بھی تو ان کا ایک پرانا اصول تھا۔ انہیں خوشی ہوئی۔

''اچھا کیا تم نے امداد حسین۔ انہیں یہاں ٹھہرایا۔'' وہ بولے۔

''میرا کیا ہے چھوٹے مالک۔ سب کچھ آپ کا ہے۔ اوپر والے کا دیا ہوا۔ خدا آپ کا اقبال بلند کرے۔ یہ حویلی تو پھر آپ کے لیے ترستی رہی لیکن آپ اس طرف آئے ہی نہیں۔''

اب وہ کیا بتاتے۔ مصروف زندگی کے ہنگاموں نے انہیں باقر پور کو فراموش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لڑکپن کا وہ دور ایک خواب سے زیادہ اہم نہ رہا تھا۔ وہ اس طرف کیسے آتے۔ روشنیوں کی بہتات میں یہ دور افتادہ تاریک سا گاؤں انہیں کس طرح یاد رہتا۔

امداد حسین قریب آ کر اُن کے پاؤں سے جوتے اتارنے لگا تو انہوں نے پاؤں کھینچ لیے۔

''امداد حسین۔ تم میرے بزرگ ہو۔ اس قدر گناہ گار تو نہ کرو۔''

''نہیں چھوٹے مالک۔ یہ تو میرا فرض ہے۔'' ایک نیچ ذات کے غیر تہذیب یافتہ ناخواندہ کو اپنا فرض یاد تھا۔

''میرا فرض کیا تھا۔ جو میں نے کیا۔ وہی نا۔ جو میں نے کیا۔''

اندر کوئی چیخ اٹھا۔ اندر کے باغی آدمی سے وہ گھبرا گئے۔ بڑی اونچی شان تھی اُن کی۔ بڑا عہدہ تھا۔ بہت بڑے آدمی تھے وہ۔ ایسی ویسی کوئی بات ان کے شایانِ شان کب تھی لیکن کیا کرتے۔ بغاوت کسی اور نے کی ہوتی تو اب تک وہ اس کا سر کچل چکے ہوتے لیکن بغاوت تو اندر کے آدمی نے کی تھی۔ اُن کے دماغ نے کی تھی اُن کے ضمیر نے کی تھی۔ اپنا مقابلہ بے حد مشکل تھا۔

''ارے نہیں امداد حسین۔'' وہ زبردستی ہنسے۔ ''کچھ فرض میرا بھی ہے اب تم بوڑھے ہو چکے ہو۔ اب تو تمہاری خدمت ہم سب پر فرض ہے۔''

''چھوٹے مالک۔ اتنا کم ہے کہ آپ کو یہاں آنا یاد رہا۔ جہاں آپ نے لڑکپن کے ایام گزارے تھے۔'' امداد حسین بے طرح خوش تھا۔

تھوڑی دیر میں کھانے کا انتظام ہو گیا۔ انڈوں کا خاگینہ، گرم گرم پراٹھے، ٹھنڈا ٹھنڈا مکھن، سرسوں کا ساگ، اور سویوں کی بنی ہوئی کھیر۔ سب چیزوں سے اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ ایک خادم سلفچی اور لوٹا لے آیا۔ اور وہیں ہاتھ دھلا دیے۔ راستے میں باوجود خواہش کے انہوں نے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا۔ سوائے دو بار چائے کے۔ سیر ہو کر کھانا کھایا۔ ان کھانوں سے، اس ماحول سے جدا ہوئے انہیں پچیس سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن ان کی دلکشی آج بھی اُسی طرح قائم تھی۔

امداد حسین اسی اثنا میں کمرے سے جا چکا تھا۔ وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو دوبارہ آ گیا۔

''چلیے چھوٹے مالک کمرا کھلوا دیا ہے میں نے۔ سردی کافی ہے آپ بستر میں آرام کریں۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے امداد حسین۔ آؤ میرے پاس بیٹھو۔ مجھ سے باتیں کرو۔'' وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے۔

''آپ سرکار اُدھر ہی چلیے۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل ضرور کروں گا۔''

خواب گاہ میں آئے۔ اور کتنی دیر دروازے میں ہی رُکے رہے۔ کمرا اسی نفاست سے آج بھی رونق دے رہا تھا۔ جیسے کوئی ماہر ہاتھ مسلسل اسے سنوارتے رہے ہوں۔ مغربی دیوار کے ساتھ لگا بیڈ، جنوبی دیوار کے ساتھ رکھی ڈریسنگ ٹیبل، مشرقی سمت باغ میں کھلنے والے دریچوں کے ساتھ پڑی رائٹنگ ٹیبل اور بیرونی دروازے کے ساتھ والی دیوار سے لگا صوفہ۔ سب کچھ اسی طرح ہی تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ دیوار میں لگی وال روا اپنی جگہ قائم و دائم تھی۔ دروازے کے اندر قدم رکھتے ہوئے وہ کئی بار

چونک چونک سے گئے۔ بے اختیار دریچے کی طرف آئے اور دونوں پٹ کھول دیے۔ چاندنی رات کا سحر چاروں طرف چھا چکا تھا۔ باغ سے تھوڑے فاصلے پر حدِ نظر تک کپاس کی فصل ہی نظر آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا گویا کپاس کے پودوں میں اولے آ کر اٹک گئے ہوں۔ سفید براق روئی کے گالے چاندنی میں بہت بھلے لگ رہے تھے۔ آم اور جامن کے پیڑ سر نیہوڑائے کھڑے تھے۔ امرود اور سنگترے کے درخت شاید بعد میں ہی اگائے گئے تھے۔ قطار اندر قطار کھڑے یہ لدے پھندے درخت بھی بے حد دل فریب لگ رہے تھے۔ دور کہیں سے ایک پُر سوز آواز آ رہی تھی کوئی لوک گیت تھا۔

توڑ نبھاون توں ڈٹھے لکھاں گھبراویندے

(عمر ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والے اکثر بے وفائی ہی کر جاتے ہیں۔) جانے کون تھا جس کے دل کے درد نے اظہار کا راستہ اس طرح ڈھونڈ لیا تھا۔ ضمیر نے ایک بار پھر انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔ انہوں نے دریچہ بند کر دیا۔ بریف کیس کھولا اور لباس تبدیل کر ڈالا۔ کافی دیر امداد حسین کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ پھر بستر پر آ گئے۔ اور لحاف اپنے اوپر ڈال کر تکیوں کے سہارے بیٹھ گئے۔ گو وہ عام حالات میں اتنی تھکن کے بعد ایک لمحہ بھی بیٹھنا گوارا نہ کرتے لیکن آج نیند اُن کے پاس کہاں تھی۔ مسلسل کئی راتوں سے وہ جاگ رہے تھے۔ خواب آور گولیوں کا سہارا لے رہے تھے۔ حالات سے فرار حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ ضمیر کی سزا بہت تلخ ہوتی ہے۔ بے حد دردناک بے حد خوف ناک۔ اپنی نازک صورت حال سے گھبرا کر وہ یہاں چلے آئے تھے۔ ماضی حال سے مربوط رہتا ہے اس کا اندازہ انہیں چند دنوں میں ہوا تھا۔ جوانی کے سہانے ایام اب بڑھاپے کی خشک زندگی کے قریب آ کر دم توڑ چکے تھے۔ لیکن دل اس عمر میں اس حالت میں ضدی بچے کی طرح مچل اٹھا تھا۔ اور انہیں ان فضاؤں میں کھینچ لایا تھا۔

''چھوٹے سرکار مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ معذرت چاہتا ہوں۔ اختر کے بوڑھے ہاتھ اب اتنے توانا نہیں رہے سرکار۔ پھر بھی وہ اپنے ہاتھوں آپ کے سارے کام کرنا چاہتی ہے۔''

امداد حسین اندر آتے ہوئے ان سے مخاطب تھا۔ وہ جو بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔ اختر کا نام سُن کر چونک چونک گئے۔ دل کی بات لبوں تک آتے آتے رہ گئے۔ بے قراری سے صرف اُن کا دل ہی آگاہ تھا۔ لیکن وسوسوں نے شرمندگیوں نے لبوں کو مقفل کر دیا تھا۔ الفاظ باہر آنے کی جرأت ہی نہ کر پا رہے تھے۔

امداد حسین نے دودھ والا جگ ساتھ پڑی چھوٹی سی تپائی پر رکھ دیا۔ اور خود قالین پر بیٹھ گیا۔ وہ بیٹھے نہ رہ سکے۔ پہلو پر پہلو بدل رہے تھے۔

''گھر میں کوئی اور نہ تھا امداد حسین جو سارا کام اختر کو ہی کرنا پڑا؟''

بڑی آس اور امید کے ساتھ انہوں نے ایک سوال میں پچیس سال کا احوال پوچھ لینا چاہا۔ امداد حسین نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور ان کے سراپے پر جما دیں۔

''نہیں سرکار۔'' امداد حسین کے یہ الفاظ برق کی طرح ان کے وجود پر گرے۔

''نہیں۔۔۔ نہیں امداد حسین۔'' وہ بے اختیار کہہ اٹھے۔ اُن کا جسم خاک ہونے لگا۔

جانے وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ کیا بتانا چاہتے تھے۔
ہونٹ کاٹتے ہوئے، آنسوؤں کی یلغار کو روکتے ہوئے۔ لحاف ایک طرف پھینک کر وہ بستر
نیچے اتر آئے۔
اس اثنا میں امداد حسین کے آنسو اس کی سفید ریش کو بھگو چکے تھے۔ بلکہ دھاڑیں مارنے لگا تھا۔
کیا وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی غیر کے آنگن میں جا اتری ہوگی۔
نہیں۔ اتنی تو نادان نہ تھی وہ۔
میں تو آج تک اُس جیسی ایک بھی لڑکی نہ دیکھ سکا۔ اُس جیسی سمجھ بوجھ اُس جیسی ذہانت کہیں
پا سکا۔ کیا اُس نے کسی اور کی رفاقت قبول کر لی ہوگی۔
اُف۔۔۔! وہ چکرا کر رہ گئے۔
''وہ کہاں ہے امداد حسین۔ کیا تم نے اس کی کہیں شادی کر دی۔ کیا اُسے بیاہ دیا؟''
انہوں نے دیوانوں کی طرح امداد حسین کو جھنجھوڑ ڈالا۔
امداد حسین اور بھی زور و شور سے رونے لگا۔ آنکھوں سے ندیاں بہنے لگیں۔
''ایسا خوش نصیب کب تھا چھوٹے سرکار۔ وہ مر گئی۔ میری بٹیا رانی مر گئی چھوڑے سرکار۔ میر
بٹیا رانی موت کا شکار ہو گئی۔ میری بدنصیب شبو۔ جانے کیسے اُس کے مرنے کے بعد بھی یہ بدنصیب ز
ہے۔''
''امداد حسین نہیں۔ نہیں اتنا سنگین مذاق نہیں کرو۔ کہہ دو۔۔۔ کہہ دو تم نے اُسے کسی سے بیا
ہے۔ وہ کسی گھر میں آباد ہے مگر مجھے یہ خبر نہ سناؤ۔ امداد حسین میرے ضبط کی انتہا یہی تھی۔ اگر وہ اس
میں نہیں ہے تو زندہ میں بھی نہ رہوں گا۔''
امداد حسین نے روتے روتے چونک کر اُن کی طرف دیکھا وہ حیران سا سوچ رہا تھا اُسے تو
ایک روگ دے گئی تھی کہ وہ اس کی لاڈلی ''بٹیا رانی'' تھی لیکن یہ چھوٹے سرکار جن کی رعیت میں مجھ
بیسیوں بلکہ سینکڑوں ملازم ہیں۔ میری بٹیا کی موت پر چھوٹے سرکار کا یوں دیوانہ ہونا۔ بڑی عجیب با
تھی کہیں وہ بٹیا رانی کے۔۔۔ وہ آگے نہ سوچ سکا۔
''یہ سچ ہے سرکار۔ لیکن آپ اس غم میں اس قدر پریشان کیوں ہو گئے ہیں کیا آپ کو علم ہو گیا
کہ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔'' کچھ کہتے کہتے وہ رُک گیا۔ مصلحت نے جذبوں کے آگے بند باندھ دیا۔ وفادار
اس کی زندگی کا اولین مقصد تھا۔ پل بھر میں کئی سو چیں دامن سے لپٹ گئیں۔
''تم نہیں جانتے امداد حسین۔ تم نہیں جانتے۔ اب تمہیں بتاؤں بھی کیا بس اپنی بیٹی کے بد
مجھے مار ڈالو۔ قتل کر دو۔ گلا گھونٹ دو میرا۔ میں مجرم ہوں۔ تمہارا مجرم امداد حسین۔ بڑے آدمی ا
چھوٹے آدمی کی زندگی تاریک کر کے بھی میری طرح پچیس سال خوش و خرم زندگی گزار لیتے ہیں۔ ر
لمحوں کے کھیل کو فراموش کر دیتے ہیں۔ رنگا رنگ زندگی اُن سے ماضی چھین لیتی ہے۔ میں کیا کہوں ا
حسین۔ جانتا ہوں۔ تمہاری غیرت نے اپنے دامن کے داغ کو گوارا نہ کیا ہوگا۔ تم نے اُسے مار
ہوگا۔ یا اگر ایسا نہ ہوا ہوگا تب اُس معصوم سی لڑکی نے خودکشی کر لی ہوگی۔ بولو امداد حسین؟ تم نے اُسے

''ہاہاہا اُس نے خودکشی کر لی؟''

''آپ۔۔۔آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟ چھوٹے سرکار!'' امداد حسین کے آنسو منجمد ہو گئے۔

بڑا ایران تھا وہ۔

''اس لیے کہ۔۔۔۔دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ مجھ جیسے نوجوانوں کے ہاتھوں فریب کھانے والی لڑکیاں ان ہی حالات کا شکار ہو جاتی ہیں۔''

''مگر اس معاملے سے آپ کا کیا تعلق ہے؟''

''میرا تعلق؟'' انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا۔ پھر خود کلامی کے انداز میں بولے۔

''کیا تھا میرا تعلق؟ کیا تھا میرا تعلق؟ دیکھو امداد حسین!'' انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے پاؤں پر رکھ دیے۔

''امداد حسین ازالہ تو ممکن ہی نہیں۔ جان دے کر بھی حالات میں تبدیلی نہیں لا سکتا۔ میں نے کہا نا کہ میں مجرم ہوں مجھے سزا دو۔ میں مسلسل جان کنی کے عالم میں ہوں۔ مجھے دار پر لٹکا دو۔ سولی چڑھا دو۔ مجھے بھی مار ڈالو کہ اس معصوم کا قاتل میں ہوں۔ صرف میں۔'' وہ ہذیانی انداز میں کہے جا رہے تھے جانے کیا کچھ۔

''چھوٹے سرکار۔ خیر تو ہے؟'' وہ رونے لگے۔ پھر اس کے قدموں میں گر گئے۔

''امداد حسین۔ ضمیر کی آواز ایک مجرم کو پچیس سال بعد تمہارے حضور لے آئی ہے۔ جب تک سزا نہ دو گے چین ہی نہیں آئے گا۔ اب مجھے بھی جینے کی آرزو نہیں ہے۔ میں بھی اپنی شبنم کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ بزدل ہوں ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنا گلا خود نہ گھونٹ سکوں گا۔ مجھے مار ڈالو امداد حسین۔ سرِ عام مجھے سنگسار کرا دو۔ تاکہ دنیا کو عبرت حاصل ہو اور آئندہ کوئی امیر زادہ محبت کا فریب دے کر کسی غریب کی بیٹی کی امنگیں اور آرزوئیں پامال نہ کر سکے۔''

''یہ آپ کیا کہے جا رہے ہیں چھوٹے سرکار۔ کیا یہ سچ ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟'' امداد حسین کی آنکھیں کسی اور سوچ میں گم تھیں۔ اُس نے اُن کی کوئی بات نہ سنی۔ کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

''چھوٹے سرکار۔ کاش آپ نے میری بٹیا رانی سے ایسا کھیل نہ کھیلا ہوتا۔ آپ نے میری آنگن کی بہار لُوٹ لی۔ چھوٹے سرکار مالک تو اپنے غلاموں کو زندگی دیتے ہیں لیکن آپ نے مجھ سے زندگی چھین لی۔ میری بچی کیسی صابر تھی۔ کیسی عظیم تھی۔ اس کے لبوں پر تو آپ کا نام تک نہ آیا۔ کتنے سنگ دل تھے آپ۔ کبھی پلٹ کر پوچھنے تک نہ آئے۔ وہ خط شاید آپ کے نام ہی تھا۔ جو یہاں سے جاتے ہوئے اس جہاں سے رخصت ہوتے ہوئے میری بچی چھوڑ گئی۔''

''وہ کیسے مر گئی؟ امداد حسین!''

''میں جو اُسے عمر بھر انگلی کا شارہ نہ کر سکا کیسے مار ڈالتا۔ ایسے بیس گناہ اور بھی اس کے ذمے ہوتے تب بھی مجھ میں یہ جراُت نہ ہوتی۔ اس نے تو مجھے کچھ بتائے بغیر ہی عدم کا سفر اختیار کر لیا۔ بس کاغذ کے دو ٹکڑے چھوڑ گئی جن میں سے ایک میرے نام تھا اور ایک اُس کے نام جس نے اس ساری کہانی کو جنم دیا۔ تو وہ آپ تھے چھوٹے سرکار۔ کاش آپ نے ایک بار امداد حسین سے کہہ کر دیکھا ہوتا۔ صرف ایک

بار۔ وہ جان پر کھیل کر بھی آپ کی خواہش کی تکمیل کرتا۔ مگر سرکار آپ بٹیا رانی کے ساتھ یوں دھ
کرتے۔ عورت خواہ کسی بھی طبقے کی ہو سرکار قابلِ رحم ہی ہوتی ہے۔ اور میری بٹیا تو ایک ان کھلا پھو
سرکار ازلی بدنصیب تھی وہ!'' وہ سسک اٹھا۔ اور روتے روتے ہی کمرے سے نکل گیا۔

جب واپس آیا تو وہ سرد دونوں ہاتھوں میں تھامے گریہ وزاری میں مصروف تھے۔

''یہ لیجیے چھوٹے سرکار۔ یہ آپ کی امانت۔''

ایک بوسیدہ کاغذ تہہ کیا ہوا امداد حسین کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔

ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اس کا لہجہ بھی کانپ رہا تھا۔

اس کی نم آنکھیں پھر آنسوؤں کے سمندر بہانے پر تلی تھیں۔

اس کا کمزور وجود اب کچھ اور بھی ناتواں لگنے لگا تھا۔

امداد حسین کو جوان بیٹی کی موت نے، رسوائیوں نے اتنا بوڑھا کر دیا تھا۔ وہ تو بمشکل ساٹھ سا
تھا لیکن کسی سو سالہ بوڑھے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

اس کے وجود سے ہوتی نظریں شبنم کی تحریر پر ٹک گئیں۔ ایک ایک لفظ حسرتوں کی مکمل داست
تھا۔

خط ایک بار نہیں کئی بار انہوں نے پڑھ ڈالا۔ اور ہر بار ایک نیا درد اُن کے اندر اتر کر اذیت د
لگا۔ انہیں یقین ہو گیا۔

لمحے گزر گئے تھے اب کہاں سے ہاتھ آتے۔

اک معصوم وجود ان کا تھا۔ مگر اب کہاں۔

ایک زمانہ اُن کی ٹھوکر میں تھا وہ انجان بنے رہے تھے۔

نئے زمانے کھوجنے چلے گئے تھے۔

پھر وہ ان کو کیسے ملتا۔

وہ قدر ناشناس تھے۔

وقت ان کا انتظار کیسے کرتا؟

اُن کی شبنم اُن کی دسترس سے دور تھی۔

دونوں کے درمیان۔ ازل اور ابد کا نہ ختم ہونے والا فاصلہ تھا۔

اب تو موت ہی انہیں شبنم کے پاس لے جا سکتی تھی۔

انہیں یوں لگا کہ شبنم نے ابھی ابھی اُن کے سامنے ہی دم توڑ دیا ہو۔ وہ وارڈ روب کی طرف
بڑھے۔ اپنے ہاتھوں اس کا قفل کھولا۔

کم خواب کا سرخ بوسیدہ جوڑا اسی طرح ہینگر میں لٹکا تھا۔ ایک دراز میں سرخ ریشمی چوڑیاں اُ
طرح موجود تھیں۔ سوکھے پھول گلابی رومال میں ہنوز بندھے تھے۔ انہوں نے تمام چیزیں نکال لیں او
ان سب کو سینے سے لگا کر رونے لگے۔ جیسے یہ سب شبنم کے وجود کے حصے ہوں۔ ٹوٹے ہوئے بکھر
ہوئے۔

وہ بلک بلک کر روئے۔ امداد حسین اُن کی بے بسی کا تماشا دیکھتا رہا۔ انہیں روک نہ سکا۔ چپ کرانے کو تسلی کا ایک لفظ نہیں کہہ سکا۔

کیا پچیس سال کسی کو فراموش کر دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں؟ اگر ایسا تھا تو آج وہ یہاں کیوں آئے تھے۔ اس گمنام سے علاقے میں پسماندہ علاقے میں ایک معروف آدمی کا کیا کام تھا۔

''بابا حضور! کاش آپ نے مجھے کچھ نہ بتایا ہوتا۔ کاش آپ اپنے سینے کے بوجھ کو اپنے ساتھ ہی لے گئے ہوتے۔''

انہوں نے بے چین و بے قرار دل کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

عجیب تھا یہ دل۔ اُسے بھولا تو پچیس برس گزر گئے۔ فراموش ہی کیے رہا۔ یاد کرنے پہ آیا تو پھر کہیں بہلا ہی نہیں۔

نہ شہر بانو کی خوب صورت اداؤں میں۔

نہ بیلا اور انیلا کی معصوم باتوں میں۔

نہ اس خوب صورت باوقار نوجوان حسن کی قربتوں میں۔ نہ کورٹ کی مصروفیات میں۔ نہ دوستوں کی رنگا رنگ محفل میں۔

ان کے قہقہے نہ جانے کہاں کھو گئے۔ توانا چہرے کی سرخیاں جانے کس غم کی نذر ہو گئیں۔

اس کا اندازہ خود ان کی اپنی ذات کے سوا کسی کو نہ ہو سکا۔ بابا حضور کے سوئم کے بعد ہی وہ دردِ دل کی واحد دوا کے لیے گھر سے نکل آئے۔ شبنم تو ہمیشہ ان کے دل میں آباد رہی تھی۔ اسے فراموش تو نہیں کیا تھا انہوں نے۔ بس بزدل تھے حالات سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ زمین و آسمان کو یکجا کرنا اُن کے بس میں نہ تھا۔ بڑی امنگیں دل میں سجائے، آرزوؤں کا ایک جہاں آباد کیے وہ جاگیر پر آئے تھے۔ گناہوں کی معافی مانگنے، زیادتیوں کی تلافی کرنے، دکھوں کا مداوا کرنے، لیکن وہ ان کی دنیا سے بہت دور چلی گئی تھی۔ جزا اور سزا سے بے نیاز تھی۔ اب تو معاملہ صرف اسی منصف کے ہاتھ میں تھا جو اس کائنات کا مالک تھا۔

رات بہت بھاری تھی۔ انہیں یوں لگا کہ شبنم ابھی ابھی مر گئی ہے۔ ابھی ابھی اُن سے روٹھ گئی ہے۔ گریہ وزاری میں ہی ڈھیروں لمحے گزر گئے۔ پچھتاوا سیاہ ناگ بن کر ڈسنے لگا۔ ایک گراں قدر سرمایہ اپنے ہاتھوں کھو بیٹھے تھے۔ حفاظت نہ کر سکے تھے۔ حالات کی نذر کر کے بھول گئے تھے۔ ان کا دل درد کی شدت سے پھٹ جانے کو تھا۔ ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ ایک ایک منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ روزِ اوّل سے روزِ آخر تک۔ ایک ایک انداز، ایک ایک ادا، سب کچھ عیاں تھا۔ لمحوں کے تعاقب میں وہ اندھا دھند چل پڑے۔ لیکن شبنم کا نشان پھر بھی کہیں نہ مل سکا اور وہ مایوس سے دوسرے دن واپسی کا سوچ کر نیند کی وادیوں میں جانے کی کوشش کرنے لگے۔

❁❁❁❁

''اے۔۔ اے لڑکی! یہ بندروں کی طرح درختوں پر چڑھتے ہوئے تجھے خوف نہیں آتا۔''

آفاق احمد نے کچی سڑک سے پگڈنڈی کی طرف رُخ کیا تو سامنے حدِ نظر تک کپاس کی فصل کے

سامنے ہی بائیں طرف باجرے کا کھیت بھی نظر آیا۔ ایک درخت کے ساتھ بندھی مچان پر وہ لڑکی بڑی مزے سے بیٹھی تھی۔

''کون ہو تم۔ مجھے بندر کہنے والے۔'' ٹانگیں نیچے لٹکاتے ہوئے اُس نے تیکھی نظریں آفاق احمد پر جمائیں۔ تو وہ رک گئے۔

''بتاؤں گا لیکن پہلے میرے سوال کا جواب۔'' مسکراتے ہوئے آفاق احمد نے پھر وضاحت چاہی۔

''میرا اپنا شوق ہے۔ خوف کی کیا بات ہے۔ ویسے تم اپنی راہ لو۔ مجھے کسی اجنبی سے باتیں کرنے کا کوئی شوق نہیں۔''

''ہاں اس لیے تو راہ روکے بیٹھی ہو۔'' آفاق احمد وہیں کے وہیں کھڑے متواتر اس مجسمۂ حسن کو عالم بے خودی میں دیکھے جا رہے تھے۔

یہ سن کر وہ چلا اٹھی۔

''میں نے راہ روکی؟ کس کی؟''

''میری اور کس کی۔ سچ بتاؤ تمہیں علم تھا کہ آج میں آ رہا ہوں حسین لڑکی۔''

''منہ دھو رکھو۔ میں تو روزانہ یہاں آتی ہوں۔ دیکھتے نہیں یہ باجرے کا کھیت ہے اور میں اس کی نگرانی کرتی ہوں۔''

''مگر وہ کیوں؟'' آفاق نے خوامخواہ کہا۔

''اس لیے کہ یہ میرے بابا کا کھیت ہے۔ اور کچھ۔''

آفاق احمد مسکرائے۔ ''ایک بات بتاؤ۔ تمہارے بابا نے تمہیں تو باجرے کی نگرانی پر مقرر کر دیا لیکن تمہاری نگرانی کے لیے کس کو رکھا۔''

''کیوں؟ میں بھی کوئی چوری ہونے والی چیز ہوں۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''اور نہیں تو کیا۔ اب تک تو کچھ نہ ہوا۔ لیکن لگتا ہے آج کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ حسین لڑکی آج کے بعد یہاں نہ آنا۔''

''واہ! آؤں گی سو بار آؤں گی۔ کون مجھے روک سکتا ہے۔''

''میں اور کون، میں نے کہہ دیا ہے کہ تم آج کے بعد یہاں نہیں آؤ گی۔''

''تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے، جاؤ اپنی راہ لو۔ شاید تم مجھ سے واقف نہیں ہو۔'' ایک ہی جست میں وہ نیچے اُتر آئی۔ اور دوسرے لمحے وہ ان کے مقابل کھڑی تھی۔ آسمانی رنگ کے سادہ سے شلوار قمیص میں۔ بڑا آسمانی دوپٹا نیچے زمین پر پڑا تھا اور وہ قمیص کی آستینیں چڑھائے گویا مرنے مارنے پر تیار تھی۔

''بہت بدتمیز لڑکی ہو۔ شاید تم بھی مجھ سے واقف نہیں۔ ورنہ تمہاری یہ جرات۔ امداد حسین نے جانے کیسے بدتمیز لوگوں کو جاگیر پر اکٹھا کر رکھا ہے۔''

آفاق سچ مچ طیش میں آ گئے۔ جوان خون کھول اٹھا۔ مالک ہونے کا احساس ہر جذبے پر حاوی

ہوگیا۔

''کس کی بیٹی ہو؟'' بڑے دھڑلے سے انہوں نے پوچھا۔

''اور تم کس کے بیٹے ہو؟'' اسی انداز میں جواب دیا گیا۔

''اوہ یو شٹ اپ، فوکش گرل۔''

''کیا سمجھ کر رعب جما رہے ہو۔ میں بھی ان پڑھ دیہاتی لڑکی نہیں ہوں۔ جواب دینا اچھی طرح جانتی ہوں۔ مڈل کے امتحان میں ضلع بھر میں اول آئی ہوں۔ انڈر اسٹینڈ۔'' وہ زور سے چلائی۔ انگریزی کا ایک لفظ شاید اس نے آفاق کو جتانے کے لیے بولا تھا تو آفاق نے اسے چونک کر دیکھا۔ جوان خون گرمی کھا گیا۔ جواباً بولے۔

''یہ گرج چمک کسی اور کو دکھانا۔ آفاق احمد بخاری نے تو گریجویٹ لڑکیوں کو بھی گھاس نہیں ڈالی۔''

ایک دم اس نے زمین پر پڑا دوپٹا اٹھایا اور سر پر سلیقے سے جماتے ہوئے مرعوب سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''آپ۔۔۔ آپ چھوٹے سرکار ہیں؟''

''اب پتا چلا۔'' وہ اکڑ گئے۔ لیکن یہ حسین لڑکی تو شاید پہلی نظر میں ہی ان کے دل میں جا بسی تھی۔ وہ بھی اسے دیکھتے رہ گئے۔

''چلو تمہیں تو یہ علم ہوگیا کہ ہم چھوٹے سرکار ہیں۔ لیکن ہمیں خبر نہیں کہ تم کون ہو؟'' اب وہ نظریں جھکائے مجرموں کی طرح ان کے سامنے کھڑی تھی۔ خاصی خوف زدہ سی پریشان سی۔

''میں۔۔۔ میں شبنم ہوں۔ امداد حسین کی بیٹی!''

آفاق اپنی جگہ سے گویا اُچھلے۔

''ارے، تم شبنم ہو۔ ہمارے بابا حضور جس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ تم سے پہلی ملاقات یوں غیر دوستانہ ماحول میں ہوگی۔

چلو جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ احتیاط کے وعدے کے ساتھ دوستی کی ابتدا۔'' آفاق احمد نے اپنا بھاری ہاتھ شبنم کے آگے پھیلا دیا۔ شبنم ابھی تک گم صم سی کھڑی تھی۔ وہ ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ نہ رکھ سکی۔

''نہیں چھوٹے سرکار۔ ایک ادنیٰ نوکر کی بیٹی آپ سے ہاتھ ملانے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ بس ایک التجا ہے کہ آپ اس واقعے کا ذکر میرے بابا سے نہیں کریں گے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہمارے مالک ہیں۔ میں نے سمجھا کہ آپ بھی نور پور کے اوباش جاگیردار زادے اکبر کے کوئی ساتھی ہیں۔'' وہ بے حد نادم تھی۔

''کون ہے یہ اکبر؟'' آفاق نے فوراً پوچھا۔

''ساتھ کے گاؤں نور پور کے صفدر علی خان کا بیٹا ہے۔''

''مگر تم اسے کیسے جانتی ہو؟'' خالص مردانہ شکوک و شبہات سے پُر سوال تھا۔

''وہ اکثر اپنے شہری دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے بہانے یہاں آیا کرتا ہے نا۔''

''مگر تمہارا کیا تعلق ہے اس سے۔'' انہوں نے رعب دار انداز میں پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ پچھلے سال اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ایسی ویسی لڑکی سمجھ کر مجھ پر آوازیں کسی تھیں، بڑے سرکار یہیں پر تھے۔ انہیں علم ہوا تو انہوں نے فوراً صفدر علی خان تک پیغام بھجوایا۔ اور سنا ہے صفدر علی خان نے اکبر کی خوب درگت بنائی اور اس کے دوستوں کا داخلہ بند کر دیا۔'' آفاق مسکرائے۔

''اور آج تم نے یہی سوچ رکھا تھا نا کہ بڑے سرکار سے کہہ کر میرا داخلہ بند کرا دو گی۔ مانتا ہوں بابا تم بڑی خاص قسم کی ہستی ہو۔''

''دیکھیے چھوٹے سرکار آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔''

''سچ بتانا شبنم، کیا شکل وصورت سے ہم تمہیں اوباش نظر آئے تھے۔'' آفاق احمد کی نظریں اسی کے چہرے کا طواف کیے جا رہی تھیں۔

آسمانی سادہ سے سوٹ میں ملبوس اس کی گلابی رنگت کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ نظریں زمین بوس ہوئی جا رہی تھیں اور آنچل کا کونا وہ بار بار انگلی پر لپیٹے جا رہی تھی۔ جھجکتے ہوئے اس نے بوجھل پلکیں اوپر اٹھائیں اور آفاق کو اسی توجہ اور محویت سے اپنی جانب تکتا پا کر پھر ایک دم نظریں جھکا لیں۔

''مجھے معاف کر دیں چھوٹے سرکار۔ دراصل میں بے وقوف بھی حد سے زیادہ ہوں۔ بابا کہتے ہیں کسی کے بارے میں پہلی نظر میں کوئی رائے قائم نہ کیا کرو۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔''

وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہتی تھی۔ رک سی گئی۔

''امداد حسین ٹھیک کہتے ہیں۔ تم آئندہ خیال رکھنا۔'' آفاق مسکرائے۔ اور واپس اسی راستے پر ہو لیے۔ شرمندہ شرمندہ سی شبنم بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔ لیکن تھوڑے فاصلے پر۔ آفاق نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم کیوں چلی آئیں؟ رکھوالی کرو نا باجرے کی۔''

''چھوٹے سرکار! میں نے تو کبھی ایسا نہیں کیا۔ یہ کھیت تو رحموقصاب کے پاس ہے۔ اس کی بیٹیاں یہاں رکھوالی کے لیے بیٹھا کرتی ہیں۔ مجھے تو بس درخت پر چڑھنے کا شوق تھا۔''

''اچھا۔۔۔ چلو شوق پورا ہو گیا۔ الحمدللہ۔'' وہ مسکرائے۔

آفاق کو یوں لگا کہ اس حسین سی لڑکی شبنم میں اور ان میں کبھی کوئی فاصلہ رہا ہی نہ ہو۔ دونوں سدا سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ ہوں۔ ہم قدم ہوں۔

آفاق انیس سالہ زندگی میں پہلی بار اپنی جاگیر پر آئے تھے۔ اس سے قبل انہوں نے جاگیر کے سارے ملازموں کو اکثر ریاض کامحل میں دیکھا تھا۔ امداد حسین تو ان کے بابا حضور کا خاص ملازم تھا اور اس کی بیوی اختر بھی۔ لیکن شبنم کو انہوں نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔ جب کہ بابا حضور کئی بار آفاق کے سامنے شبنم کا ذکر پچھلے چار دنوں میں کر چکے تھے۔ آفاق کے لیے ایک ادنیٰ ملازم کی بیٹی کوئی اہمیت نہیں رکھ سکتی تھی۔ انہوں نے اس کے ذکر کو ایک بار بھی بغور نہیں سنا تھا لیکن آج شبنم کو دیکھ کر وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کچھ وجود ساری دنیا سے منفرد لگنے لگتے ہیں۔ چند لمحے ہی آگاہی اور آشنائی کے لیے کافی رہ جاتے ہیں۔

شبنم ان سے چند قدم کے فاصلے پر سہمی سہمی سی چلی آ رہی تھی۔ اگر چھوٹے سرکار نے امداد حسین کو سب کچھ بتا دیا تو یہ بات اسے خوف زدہ کرنے کے لیے بہت تھی۔ وہ بار بار آفاق کے اونچے لمبے سراپا کو دیکھ رہی تھی۔ نومبر کے مہینے کے ابتدائی ایام تھے اور سردی فضاؤں پر غالب آ چکی تھی۔ آفاق نے سفید شلوار قمیص پر ڈارک براؤن رنگ کی خوب صورت سی جرسی پہن رکھی تھی۔ جرسی کے بند گلے نے گردن کو چھپا رکھا تھا۔ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے وہ اِدھر اُدھر دیکھتے جنوبی سمت رواں دواں تھے۔ ایک چوراہے پر گھر کی طرف والی پگڈنڈی کی طرف مڑتے ہوئے انہوں نے پیچھے دیکھا۔ اور مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ گئی۔

''شبنم۔۔۔ کیا تم واقعی خوف زدہ ہو؟ سچ ہم امداد حسین سے تمہاری کسی حرکت کا کوئی ذکر نہیں کریں گے۔ وعدہ ہے۔''

وہ رک کر اسے تسلی دینے لگے۔ شبنم خوش ہو گئی اور نظروں میں شکر گزاری کے تاثرات بھر گئے۔

''مہربانی چھوٹے سرکار۔ آپ بے حد اچھے ہیں۔'' اس نے سادگی سے آفاق کی تعریف کر ڈالی۔

''وہ تو ہم جانتے ہی ہیں۔ سب لڑکیوں کی رائے یہی ہے۔''

''کون سی لڑکیاں؟'' بے اختیار اس نے پوچھا۔

''بھئی، وہ ہماری کلاس فیلوز، فضا، رینا، اجلا اور شان۔ سب کی سب کہتی ہیں کہ ہم اچھے ہیں۔ لیکن بابا حضور کی نظروں میں تو ہم کچھ اور ہیں۔''

شبنم انہیں استفہامیہ نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔

''کیا کہتے ہیں بڑے سرکار؟''

''وہ کہتے ہیں کہ ہم نالائق ہیں۔ اسی لیے تو سزا کے طور پر انہوں نے ہمیں یہاں بھیج دیا ہے۔ منشی کرم داد اب بوڑھا ہو گیا ہے نا۔ حساب کتاب نہیں کر سکتا۔ بابا حضور نے ہمیں اس کی جگہ دے دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر نہیں بن سکے تو منشی بن جاؤ۔'' شبنم آفاق احمد کو منشی کرم داد کی جگہ تصور کر کے ہی ہنس دی۔ آفاق بھی اس کی تقلید میں مسکرانے لگے۔ پھر وہ ایک دم ہنسی روک کر بولی۔

''اب آپ یہیں جاگیر پر ہی رہا کریں گے؟''

''ہاں، اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ اگر ہم نے فصل کی دیکھ بھال اور دوسرا کاروبار نہ سنبھالا تو بابا حضور ہمیں عاق کر دیں گے۔ گھر سے نکال دیں گے۔''

''اف اللہ۔۔۔ نہیں نہیں۔ آپ کو ان کا حکم ضرور ماننا چاہیے۔ اگر وہ خفا ہو گئے تو۔''

''بہت ڈرتی ہو ان سے؟'' آفاق نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''کیا آپ نہیں ڈرتے۔ پھر ہمارے تو وہ مالک ہیں اور وہ بھی اتنے مہربان اور رحم دل قسم کے۔ چھوٹے سرکار یہ ڈر اور خوف در حقیقت ایک احترام ہوتا ہے جو ہم اپنے بزرگوں کا کیا کرتے ہیں۔''

آفاق نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ چھوٹی سی، نازک سی لڑکی شبنم جو دیہات کی فضاؤں کی پروردہ تھی۔ انہیں پتے کی بات بتا رہی تھی۔ ادب و احترام تو خود ان کی گھٹی میں رچا بسا تھا۔ وہ تو بس اس کا ردِ عمل دیکھنا چاہتے تھے۔

امداد حسین نے فرماں برداری کے سارے جراثیم اس لڑکی کو بھی لگا دیے تھے۔ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے بھی ان سے بے حد مرعوب لگ رہی تھی۔

وہ یہاں بابا حضور کے زیرِ عتاب کسی سزا کے طور پر ہرگز نہیں آئے تھے۔ بس ان دنوں گریجویشن کے بعد ایک دم فارغ تھے۔ منشی کرم داد نے بصد احترام کام کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ تب آفاق نے موسمِ سرما کی فصل خریف کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ جو ہر آباد میں فراغت کے چھ ماہ گزار کر وہ لگی بندھی زندگی سے اکتا چکے تھے۔ صبح رائڈنگ کے لیے جو ہر آباد کے نشیب و فراز کی خاک چھاننا۔ واپس آ کر بابا حضور کو اخبار پڑھ کر سنانا۔ سہ پہر کو کلب جانے کے لیے اہتمام سے تیار ہونا۔ وہاں جا کر بیڈمنٹن سے دو دو ہاتھ کرنا، کبھی کبھار کسی تقریب کے پیشِ نظر رات گئے تک کلب میں رہنا اور پھر لوٹ کر دوسری صبح کے طلوع ہونے تک خوابِ خرگوش کے مزے لینا۔ کالج کی زندگی میں کچھ اور طرح کا چارم تھا۔ مصروفیت کسی اور ڈھنگ کی تھی۔ لیکن ان دنوں انہیں زندگی رنگین ہوتے ہوئے بھی یکسانیت کا شکار ہوتی نظر آ رہی تھی۔ سو وہ بہت جلد اس سے اکتا گئے۔

بڑے دنوں سے لندن جانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہے تھے لیکن اماں حضور کو پہلوٹھی کا یہ بیٹا عزیز از جان لگتا تھا۔ ہامی بھرنے میں ہچکچا رہی تھیں۔ انہیں ہر دم نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی تھیں۔ بابا حضور کی نیم رضامندی اماں حضور کے کہنے پر ایک دم سخت قسم کے انکار میں بدل گئی۔ تب وہ جھنجھلا کر جو ہر آباد کے ماحول سے نکلنے کی خاطر باقر پور اپنی جاگیر پر چلے آئے۔ رات ہی کو یہاں پہنچے تھے۔ گاؤں میں رات بڑی جلدی چاروں طرف چھا جاتی ہے۔ شاید پورا گاؤں ہی نیند کے نشے میں سرشار تھا تبھی تو سنگی حویلی کے آہنی گیٹ پر انہیں بار بار دستک دینا پڑی تھی۔ تب کہیں امداد حسین دروازے پر آیا تھا۔

''آپ نے اطلاع کروائی ہوتی چھوٹے سرکار، میں پوری رات آنکھیں فرشِ راہ کیے آپ کا انتظار کرتا۔'' وہ تاخیر پر سخت شرمندہ تھا۔

''کوئی بات نہیں امداد حسین! انتظار کی کوفت بھی مزا دیتی ہے دیوان خانے میں آ کر وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔ بابا حضور کے کہنے کے باجود ڈرائیور کو ساتھ نہ لائے تھے۔ اب تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ امداد حسین نے ان کے پیر بوٹوں کی قید سے آزاد کیے۔ کتنی دیر انہیں سہلاتا رہا۔ لانگ کوٹ احتیاط سے اتارا۔ پوری حویلی میں ہلچل سی مچ گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سلفچی لیے لوٹا اٹھائے ہاتھ دھلانے کو تیار کھڑا تھا۔

''چھوٹے سرکار! کھانا تیار ہے۔''

ہاتھ دھو کر سامنے تپائی پر چُنے کھانے پر وہ ٹوٹ ہی پڑے۔ بھوک زوروں پر تھی۔ انڈوں کا خاگینہ، گرم گرم پراٹھے، سرسوں کا ساگ اور سفید سفید مکھن۔ اور اس کے ساتھ ہی چاولوں کی کھیر۔

سب کچھ ہی بے حد ذائقہ دار، بہت اچھا تھا۔ جانے کتنا کچھ کھا لیا انہوں نے۔ امداد حسین قریب ہی قالین پر بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہا۔ اور ضرورت کی اشیاء بروقت انہیں دینے کا منتظر بھی رہا۔

''کھانا بہت اچھا بنا ہے امداد حسین۔''

''شرمندہ کرتے ہیں حضور۔ کھیر تو آج بٹیا رانی نے بنائی تھی۔ بس دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔

آپ کا حصہ بھی اس میں تھا۔ آدھے گھنٹے میں انڈوں کے سوا کوئی کھانا نہیں بن سکتا تھا۔''

''بٹیا رانی؟'' آفاق بے اختیار پوچھ بیٹھے۔

''سرکار۔۔۔!'' امداد حسین نے شرمندہ شرمندہ انداز میں کہا۔

''سرکار۔۔۔! اکلوتی بیٹی ہے نا۔ بہت پیاری ہے۔ اختر اسے بٹیا رانی کہہ کر پکارتی ہے۔''

آفاق سوچ رہے تھے بابا حضور اکثر ایک لڑکی کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ کہیں وہ امداد حسین کی بیٹی تو نہیں۔ لیکن امداد حسین سے پوچھ نہ سکے۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اس کمرے میں آگئے۔ جہاں امداد حسین نے ان کی ضرورت کا سارا سامان پہنچا دیا تھا۔

وہ کمرے میں گئے۔ اور سوٹ کیس امداد حسین کے حوالے کر دیا۔ تھوڑی دیر میں امداد حسین ان کے تمام لباس اور ضرورت کی تمام اشیاء وارڈ روب میں سلیقے سے رکھ چکا تھا۔

''امداد حسین! یہ کمرا تو یوں لگ رہا ہے جیسے ہمیشہ سے اس میں کوئی رہتا چلا آرہا ہو۔''

''چھوٹے سرکار! آپ پہلی بار یہاں تشریف لائے ہیں۔ ساتھ والی خواب گاہ بڑے سرکار کی ہے۔ اور یہ تینوں کمرے بڑے سرکار کے حکم پر آپ تینوں بھائیوں کے لیے آراستہ ہیں۔ یہ حویلی آپ کے دادا حضور نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل ہی مکمل کروائی تھی۔ بڑے سرکار تو ادھر رہائش پذیر رہتے ہیں لیکن ان کی یہ خواہش بھی ہے کہ آپ سال کے کچھ دن اپنی جاگیر پر ضرور گزارا کریں بس اسی لیے۔''

آفاق ہنس پڑے۔

''چلو ٹھیک ہے۔ اب تو مابدولت اپنی خواب گاہ کو رونق بخشنے کے لیے آگئے ہیں۔''

''خدا آپ کا آنا مبارک کرے سرکار۔ نہ پوچھیں کہ میں کتنا خوش ہوں۔''

آفاق بے لوث محبت کے اظہار پر خود بھی خوش نظر آنے لگے۔ تبھی اختر چائے لے کر آگئی۔ آفاق نے اختر کو اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ لیکن انہیں خبر تھی کہ اختر ریاض کا محل میں رہا کرتی تھی۔ اماں حضور کی خاص ملازماؤں میں سے ایک تھی اور یہ بھی کہ امداد حسین سے اس کی شادی محبت کی شادی تھی۔

اختر کو دیکھ کر آفاق نے دل ہی دل میں اس کے حسن کا اعتراف کیا جس کے آگے امداد حسین نے دل ہار دیا تھا۔

''بیٹی بھی یقیناً اسی طرح کی حسین ہوگی! آفاق نے بے اختیار سوچا اور پھر خود کو ملامت کرنے لگا۔ بھلا انہیں کیا پڑی تھی کہ وہ ایک ادنیٰ ملازم کے بارے میں یا اس کی بیٹی کے بارے میں سوچتے رہیں۔

اختر نے آگے بڑھ کر ان کا گھنے بالوں والا سر چوم لیا اور دعائیں دیں۔

''آپ نے اچھا کیا چھوٹے سرکار جتنے دن آپ یہاں رہیں گے رونق ہی رونق رہے گی۔''

اس کے لہجے میں شفقت تھی۔ نظروں میں پیار کی جھلک تھی۔

''آپ ان ہی ہاتھوں میں پلے بڑھے ہیں سرکار۔ آپ اتنے سے تھے جب میں باقر پور آگئی تھی۔'' اختر نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔

''اختر کو بڑا شوق تھا آپ سے ملنے کا، آپ کو دیکھنے کا، اس کی خواہش پوری ہوگئی۔'' امداد حسین

نے پیار بھری نظریں ان پر جمائیں۔

ممتا آفاق پر لٹاتے ہوئے اختر نے ان کا بستر درست کیا، کمبل اور لحاف کو سیدھا کیا اور آتش دان جلانے لگی۔ کچھ دیر بعد کمرے کی فضا خاصی گرم تھی۔ امداد حسین نے دودھ کا جگ سائیڈ ٹیبل پر لا رکھا تھا اور کچھ دیر بعد دونوں شب بخیر کہہ کر کمرے سے چلے گئے تھے۔

❁❁❁❁

صبح دم حسب عادت وہ جلد اٹھ گئے۔ دریچے کے شیشیوں سے جھانکتے روشن اجالوں نے کمرے کے اندھیرے کو نگل لیا تھا۔ نوکر نے ان کے لیے گرم پانی کا انتظام کر کے انہیں مطلع کر دیا۔ غسل کے بعد وہ کمرے میں آئے۔ سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کا جائزہ لیا۔ سفید شلوار سوٹ میں خاصے اچھے لگ رہے تھے۔ بند گلے کی ڈارک براؤن جرسی زیب تن کرنے کے بعد انہوں نے بال سنوارے اور باہر آ گئے۔ طویل برآمدے میں روشن اور چمک دار دھوپ نے حدت پیدا کر دی تھی۔ لیکن وہ وہاں نہیں رکے۔ باہر کی ہریالی فضاؤں کی طرف چل دیے۔ حدِ نظر تک کپاس کی فصل تھی۔ بائیں طرف گنے کے کھیت تھے۔ جوار اور باجرے کے قد آور پودے تھے اور حویلی سے تھوڑا ہٹ کر گھنے درختوں والا باغ تھا۔ جہاں پھل دار درختوں کے ساتھ نادر پھولوں کی بہتات تھی۔ اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر قدم قدم چلنا انوکھا تجربہ تھا۔ راستے میں کھالے آ جاتے جن میں بہتا شفاف شفاف پانی منزل تک پہنچنے کی سعی خاموشی سے کر رہا تھا۔ دور کہیں ٹریکٹر چل رہا تھا۔ ربیع کی فصل کے لیے زمین تیار کی جا رہی تھی۔ یونہی سیر کرتے کرتے اچانک وہ امداد حسین کی ''بٹیا رانی'' سے ٹکرا گئے تھے اور مبہوت سے اسے دیکھتے رہے تھے۔ امداد حسین کے آنگن میں تو ایک بے داغ بدرِ کامل ضوفگن تھا۔ بے شک اختر ایک حسین عورت تھی لیکن شبنم کا حسن تو بے مثال تھا۔ امداد حسین یا اختر کی ایک جھلک اس میں نہ تھی۔ چودہ پندرہ سالہ وہ لڑکی حسن کے ساتھ دانائی میں بھی لاجواب تھی۔ اس کا اندازہ انہوں نے چند لمحوں کی گفتگو سے لگا لیا تھا۔

سب کچھ خدا کی دین ہے جس پر مہربان ہو جائے اسے سب کچھ عنایت کر دے۔

ان کے کالج میں کو ایجوکیشن تھی۔ کتنی لڑکیاں تھیں۔ ایک سے ایک طرح دار اور فیشن ایبل۔ پھر وہ کرنل سعید کی بیٹی شان، ڈی سی فلک سپر کی نورِ نظر فضا، جو ہر شام کلب میں آنکھیں بچھائے ان کی منتظر ملتی تھیں مگر آفاق نے ان کو قابل اعتنا ہی نہ جانا تھا۔ دراصل انہیں پڑھائی سے حد سے زیادہ شغف تھا۔ انیس سال کی عمر میں گریجویشن کر لیا تھا۔ انہوں نے پھر پڑھائی کے بعد دوسرے تفریحی مشاغل میں بھی برابر حصہ لیتے تھے۔ لہٰذا کسی مہ جبیں پر نظر ڈالنے کو وقت ہی نہ بچتا تھا۔ لیکن اس دور افتادہ گاؤں میں اس لڑکی کے ساتھ چلتے ہوئے جوان سے خاصی مرعوب سی ان سے چند قدم پیچھے چل رہی تھی آفاق سخت متاثر لگ رہے تھے۔

کیا تھا اس کی ذات میں۔ کیا نظر آیا تھا انہیں۔

شاید وہ اس لیے متاثر تھے کہ وہ ان سب سے حسین تھی جو آج تک ان کی راہوں میں آئیں۔

نہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ بلا کی ذہین لگ رہی تھی۔

نہیں۔ پھر کیا تھا۔
شاید اس لیے کہ ان کی آنکھوں میں دعوت نظارہ نہ تھی۔ سادگی تھی، بھولپن تھا اپنے حسن و جمال سے بے نیازی تھی۔
پھر انہیں رات والی کھیر کا ذائقہ یاد آ گیا۔ یہ لڑکی بھی اسی کھیر کی طرح صاف و شفاف بے داغ اور شیریں تھی۔
''شبنم۔۔۔!'' چلتے چلتے انہوں نے ہولے سے شبنم کو پکارا۔ رفتار بھی دانستہ دھیمی کر دی۔ مڑ کر دیکھا۔ شبنم ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''رات میں نے تمہارے ہاتھوں کی بنی کھیر کھائی تھی۔ واللہ بے حد مزے دار تھی۔ کیا واقعی تم نے بنائی تھی لیکن وہ تھی کس خوشی میں؟'' ان کی گفتگو میں بھی سادگی کا دخل ہو گیا تھا۔
شبنم کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔
''چھوٹے سرکار! کل ساتھ والے گاؤں سے میری سہیلیاں آئی تھیں۔ بس اسی لیے بنائی تھی۔''
''اچھا! تم مہمانوں کی تواضع کھیر سے کرتی ہو۔''
اب وہ ہنس پڑی۔
''صرف کھیر ہی نہیں اور بھی کئی چیزیں بنانا آتی ہیں مجھے۔''
''لیکن ہم تو آج شام بھی صرف ویسی کھیر ہی کھائیں گے کیوں۔۔۔؟ ٹھیک ہے نا۔''
''جو آپ کا حکم۔'' اس نے سر ایک ادا سے قدرے جھکایا تو وہ چمک سے اٹھے۔
''خوب! فرماں بردار بھی ہو۔ یہ بھی پتا چل گیا۔''
جواب میں وہ خاموش رہی۔ بے اختیار اس کی خوب صورت مدبھری آنکھیں آفاق کو دیکھ کر جھکتی اور پھر اٹھتی رہیں۔
''تم ابھی تک خوف زدہ ہو شبنم۔ ہم امداد حسین سے اس کی بٹیا رانی کی کوئی شکایت نہیں کریں گے۔'' آفاق نے بٹیا رانی پر خاصا زور دیا۔
وہ دونوں حویلی کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ تبھی آفاق نے سامنے والی پگڈنڈی پر مختلف رنگوں کے کپڑوں میں ملبوس بہت سی لڑکیوں کو سامنے کھیت کی طرف جاتے دیکھا۔
''یہ لڑکیاں صبح ہی صبح کس طرف جا رہی ہیں اتنے اہتمام سے اور یہ سب ہیں کون؟'' آفاق نے انگلی سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''یہ سب گاؤں کی ہی ہیں، مزارعوں کی بیٹیاں۔ کپاس کی چنائی کے لیے کھیتوں کی طرف جا رہی ہیں۔''
''یہ کام لڑکیوں کے سپرد ہوتا ہے۔ مگر ایک پودے سے ایک ایک گالا چننا خاصا مشکل کام ہے۔ ان بے چاریوں کو کتنی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ سب کیسے ہوتا ہے شبنم۔'' شبنم مسکرانے لگی۔
''آج آپ کھیتوں میں جا کر دیکھ لیجیے گا کہ کیسے ہوتا ہے۔''
''تم بھی۔۔۔ شبنم کیا تم بھی جاتی ہو کپاس چننے۔'' آفاق نے اچانک پوچھا۔

''نہیں چھوٹے سرکار! بابا اجازت ہی نہیں دیتے۔ وہ تو مجھے پڑھا لکھا کر استاد بنانا چاہتے ہیں۔''

''چہ چہ۔۔۔ کسی پرائمری اسکول کی ٹیچر بن جانا کوئی کارنامہ تو نہیں۔'' انہوں نے چھیڑا۔

''نہیں چھوٹے سرکار۔۔۔ بابا کہتے ہیں۔ میں محنت کرتی رہوں تو وہ مجھے شہر کے ہائی اسکول سے تعلیم دلوائیں گے اور پھر وہیں کالج میں داخل کرا دیں گے اور خوب پڑھ لکھ کر میں پروفیسر بن جاؤں گی۔ کسی کالج میں پڑھایا کروں گی۔''

''اچھا۔ یہ منصوبہ تو خاصا بڑا اور محنت طلب ہے۔ کر لو گی تم یہ سب کچھ اور محنت۔'' انہوں نے مزاح کے انداز میں کہا۔

''ضرور کروں گی۔ مس انجلا کہتی ہیں تم ضرور ترقی کرو گی۔'' یقین اور اعتماد اس کے لہجے سے عیاں تھا۔

''مس انجلا کون ہیں؟''

''مڈل اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہیں۔ انہوں نے ہی تو مجھے اتنی محنت سے پڑھایا ہے۔''

''کیا وہ انگریز ہیں؟''

''آپ کو کیسے خبر ہے۔'' شبنم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ابھی تم انگریزی کے لفظوں سے رعب جو جما رہی تھیں تبھی میں نے سوچا۔''

وہ کھل کر ہنس اور آفاق کو چاروں طرف فضاؤں میں نقرئی گھنٹیاں بجنے کی آواز دیر تک آتی رہی۔ لڑکیاں بھی دونوں کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ جھٹ دوڑی چلی آئیں۔

''سلام شبنم بی بی۔''

''وعلیکم السلام کیسی ہو تم سب؟''

''اچھے ہیں شبنم بی بی۔ صبح صبح تم یہاں کیسے ہو؟ پڑھنے نہیں گئیں۔''

''ابھی کچھ دیر میں جاؤں گی۔''

دوسری لڑکی آگے بڑھی اور سرگوشی میں شبنم سے پوچھنے لگی۔ لیکن آفاق بخوبی سن رہے تھے۔

''یہ کبھرو کون ہے تمہارے ساتھ؟''

شبنم نہ شرمائی نہ گھبرائی۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''یہ چھوٹے سرکار ہیں۔ باقر پور کے مالک۔''

لڑکیاں مرعوب ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ ان کی آنکھیں حیرت سے وا تھیں۔ ماتھے تک ہاتھ لے جا کر ڈرتے ڈرتے ان سب نے سلام کیا تو آفاق ان لڑکیوں کی معصومیت پر اندر ہی اندر مسکراتے رہے۔

''چھوٹے سرکار تم لوگوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے میں ابھی بابا سے جا کر کہوں گی۔ چھوٹے سرکار بابا کے ساتھ کھیتوں میں آئیں گے تاکہ تمہیں کپاس چنتا دیکھ سکیں۔'' وہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ ان سے مخاطب تھی۔

لڑکیاں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگیں اور شبنم اور آفاق نے حویلی

کی طرف جانے کے لیے قدم اٹھا دیے۔

امداد حسین نے برآمدے میں میز کرسیاں لگوا دیں تھیں۔ سفید میز پوش پر قرینے سے گلدان میں رنگ برنگے پھول مسکرا رہے تھے۔ آفاق ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

شبنم اپنے رہائشی حصے کی طرف جا چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب منشی کرم داد حساب کے موٹے موٹے رجسٹر اپنے بیٹے سے اٹھوائے حویلی کی جانب آ رہا تھا۔ آفاق نے دیکھا۔ سفید چادر میں اپنا آپ چھپائے، ہاتھوں میں کتابیں تھامے شبنم آہنی گیٹ پار کر رہی تھی۔

❁❁❁❁

دوپہر تک آفاق احمد منشی کرم داد کے ساتھ پانچ سالہ حساب کتاب اور لین دین کے معاملات میں الجھے رہے۔ تبھی امداد حسین نے کھانا تیار ہو جانے کی اطلاع دی تو آفاق اندر آ گئے۔ دیوان خانے میں درمیانی میز پر کھانے پینے کی اشیاء سے پُر تھی۔

اختر نے آج ان کے لیے مرغی روسٹ کی تھی۔ مٹر پلاؤ بنایا تھا اور ساتھ ہی انڈوں کا حلوہ تھا۔ آفاق ہمیشہ ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھانے کے عادی تھے۔ رات تو مارے زبردست بھوک کے انہیں احساس ہی نہ ہوا۔ لیکن اب وہ تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ مگر لذیذ کھانے نے ایک بار پھر اپنی طرف توجہ مبذول کرا ہی لی تھی۔

''چھوٹے سرکار! شہر جیسی سہولتیں اس علاقے میں نہیں پھر بھی اختر نے۔۔۔''

''امداد حسین آخر کون سی کمی باقی ہے اس کھانے میں۔'' آفاق نے اسے ٹوک دیا۔

''آپ نے رات کھیر پسند کی تھی۔ بٹیا رانی ابھی لوٹی ہے آتے ہی چاول بھگو دیے۔ ان شاء اللہ رات کے کھانے پر کھیر بھی ہو گی۔''

آفاق کے تصور میں شبنم کے خوب صورت ہاتھ آ گئے۔ ترشے ہوئے بیضوی ناخنوں والی صاف ستھری انگلیاں جنہوں نے چاول بھگوئے ہوں گے۔

وہ سرشار ہو گئے۔ کھیر کے تصور سے ہی لطف آ گیا۔

انہوں نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ کھانا کھاتے رہے پھر ذرا سی دیر آرام کرنے کے بعد وہ باہر نکل آئے۔ جیپ اسٹارٹ کی اور بے مقصد شمالی جانب والی چھوٹی سی کچی سڑک پر ڈال دی۔ انہیں یہ خبر بھی نہ تھی کہ سڑک کس طرف جاتی ہے۔ بس چلے آئے۔ دور و یہ شیشم اور سرس کے درختوں کے ساتھ ساتھ بہتی صاف شفاف پانی والی ندی حد نظر تک سبزہ ہی سبزہ۔ چمکتی دھوپ میں ارد گرد کھیتوں میں بکھری لڑکیاں ابھی تک چنائی میں مصروف تھیں۔ ایک جگہ گنے کا رس نکل رہا تھا۔ بڑے بڑے کڑاہوں میں ڈال کر گڑ بنایا جا رہا تھا۔ وہ جیپ روک کر نیچے اُترے اور بیلنے کے قریب جا پہنچے۔ منشی کرم داد کا بیٹا وہاں موجود تھا انہیں دیکھ کر وہ سب کو بتا چکا تھا۔ سب لوگ کام چھوڑ کر ان کی طرف آ گئے۔ ادب سے سلام کرتے ہوئے حیرت سے انہیں تک رہے تھے۔ بالکل کسی عجوبۂ روزگار کی طرح۔

ان کے جاتے ہی ہلچل سی مچ گئی تھی۔ ایک نوجوان بھاگ کر قریبی گھر سے صاف ستھرا شیشے کا جگ اور گلاس لے آیا۔ تازہ ٹھنڈا اور میٹھا رس ان کے سامنے لایا گیا۔ ان کا دل نہیں چاہا لیکن منشی کرم داد

کے بیٹے کا اصرار انہیں مجبور کرنے لگا۔ تو انہوں نے لبالب بھرا گلاس لبوں سے لگالیا۔ اس ٹھنڈے میٹھے رس کا اپنا ہی مزا تھا۔ پیاس نہ ہونے کے باوجود وہ پورا گلاس پی گئے۔ پھر اِدھر اُدھر پھر کر ان سے معلومات حاصل کرتے رہے۔ عاشق انہیں کپاس کے کھیت کی طرف لے گیا۔

عورتوں کے ماہر ہاتھ بڑی تیزی سے کپاس چننے میں مصروف تھے۔ کنارے کنارے چل کر وہ بڑی محویت سے یہ نظارہ کرتے رہے۔ پھر عاشق کو ساتھ لے کر جیپ کی طرف آ گئے۔

ان کی جاگیر کی حد دور دور تک پھیلی تھیں۔ عاشق کی رہنمائی میں وہ قریبی شہر جانے والی سڑک تک گئے۔ شاہراہ سے پیٹرول ڈلوایا اور حویلی لوٹ آئے۔ آتے آتے چاروں طرف ملگجا اندھیرا چھا چکا تھا۔

انہیں خبر نہ تھی لیکن دو منتظر آنکھیں حویلی کی چھت سے بڑی دور سے ان کی جیپ کو دیکھ رہی تھیں۔

امداد حسین شاید موجود نہ تھا ورنہ ان کی آمد کی خبر پاتے ہی ان کی طرف آتا۔ نوکر نے کمرے کا دروازہ کھولا اور آتش دان جلا دیا۔ سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ جیبوں میں ڈالے۔ وہ دروازے پر ہی کھڑے رہے۔ منتظر رہے۔

''چھوٹے سرکار! آپ اندر آ جایئے۔ باہر بے حد سردی ہے۔'' نوکر نے انہیں مخاطب کیا۔

''اوہ ہاں۔'' وہ پھر کمرے میں آ گئے۔

بے کار وقت کاٹنا دوبھر ہوا جا رہا تھا۔ نوکر ٹیبل لیمپ جلا کر واپس چلا گیا تو انہوں نے کپڑے تبدیل کر لیے اور آتش داں کے قریب آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئے۔

''بابا حضور نے میرے لیے انتہائی غیر دلچسپ مصروفیت ڈھونڈی ہے۔''

انہوں نے تھکے تھکے وجود کے ساتھ تھکے تھکے دماغ سے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔

حرارت پا کر بدن میں چستی ابھر آئی۔ لیکن وہ ویسے ہی پڑے رہے۔ صبح انہیں سیٹھ ارشاد سے ملنا تھا جو کپاس کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ بابا حضور کو خط لکھنا تھا۔ اور جہانگیر نگر ظفر شنواری کے پاس بھی جانا تھا۔ جو پچھلے چار سالوں سے ان کا بہترین دوست اور کولیگ تھا۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک، دروازے پر ہلکی سی دستک نے انہیں چونکا دیا۔

''آ جاؤ امداد حسین۔''

دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ آنے والا ہیولا امداد حسین کا نہ تھا۔ روشنی بہت کم تھی۔ پھر بھی آفاق نے پہچاننے میں غلطی نہ کی تھی۔

وہ شبنم تھی۔ ہلکے گلابی کپڑے کم روشنی کے باوجود یہ خوبی دکھائی دے رہے تھے۔

''بابا تو ابھی تک واپس نہیں آئے۔ اماں کہنے لگیں کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ تم جا کر دے آؤ۔ چھوٹے سرکار! کھانا دیوان خانے میں کھائیں گے یا یہیں لے آؤں؟''

''امداد حسین کہاں گیا ہے؟ تم نے ناحق زحمت کی۔'' آفاق گھبرا گئے۔

''بابا تو ڈیرے کی طرف گئے ہیں۔ کپاس اندر جمع کرنے میں خاصا وقت لگتا ہے۔''

''اچھا تو ایسا کرو، کھانا ادھر ہی لے آؤ۔''

''جی اچھا۔۔۔!'' وہ وہیں سے پلٹ گئی۔

''آج میں باقر پور کے گردونواح دیکھنے کی غرض سے جیپ پر گیا تھا۔''

''ہاں میں نے آپ کو واپس آتے دیکھا تھا۔''

''تم دیکھ رہی تھیں۔ کہاں سے؟ اور کیوں؟'' بے اختیار وہ پوچھ بیٹھے۔

''میں چھت پر تھی۔'' شبنم نے انہیں بتا دیا لیکن یہ نہ بتا سکی کہ کھیر بنانے کے بعد ان کو نہ پا کر وہ کتنی بے چین ہو گئی تھی۔

''کیا کر نے گئی تھیں؟' جانے کیا کھد بد لگی تھی انہیں۔

''ماں نے ساگ سوکھنے کے لیے اوپر پھیلایا تھا۔ اسے اکٹھا کر کے لانا تھا۔'' شبنم نے جلدی سے بہانہ بنایا۔ اختر سے بھی یونہی کہہ کر اوپر گئی تھی۔

''اچھا۔۔۔!'' آفاق نے بات ختم کر دی۔

کھانا چن کر وہ واپس چلی گئی۔

❁❁❁

سیٹھ ارشاد نے انہیں اپنے پاس روکے رکھا۔ خاطر تواضع کی، کاروباری زندگی کے رموز و کنایہ سے آشنا کیا۔ اور سہ پہر کے قریب ہی خط ڈاک میں ڈالنے کے بعد وہ باقر پور لوٹ سکے۔ باقر پور ابھی ایک ڈیڑھ میل دور رہی تھا۔۔۔ جب انہوں نے شبنم کو رات والے لباس کی وجہ سے دور ہی سے پہچان لیا۔ سڑک پر وہ تنہا چلی جا رہی تھی۔ انہوں نے رفتار بڑھائی اور پل کی پل میں جیپ اس کے قریب جا کر روک دی۔ شبنم نے جیپ رکنے پر ان کی طرف دیکھا۔ اس سے قبل کہ اس کے لب ہلتے۔ آفاق بولے۔

''تم مس انجیلا کے پاس تنہا ہی آیا جایا کرتی ہو؟''

''نہیں میرے ساتھ بر جیس بھی ہوتی ہے۔ لیکن آج وہ بیمار تھی۔ بابا مجھے چھوڑ آئے اور اب مجھے تنہا آنا پڑا۔ پتا نہیں بابا کہاں ہیں اور کس مصروفیت میں ہیں۔''

''اکیلے نہیں آیا کرو شبنم۔'' انہیں شبنم کا یوں تنہا چلنا انتہائی ناگوار گزرا تھا۔ راستے ویران تھے۔ ایسے میں وہ اوباش کبر علی کہیں سے آ جاتا تو۔۔۔'' آفاق کو شبنم کی بتائی بات یاد آ گئی۔

''نہیں نہیں شبنم! آئندہ تم کسی صورت تنہا ان راستوں پر نہ چلو گی۔'' وہ ایک بار پھر تنبیہ کرنے لگے سختی سے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں چھوٹے سرکار۔'' شبنم نے فوراً تائید کی۔ آفاق نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ شبنم نے ایک دم ان کی طرف دیکھا۔

''اب کیا دیر ہے۔ چلو جلدی سے اندر آؤ۔'' ان کے لہجے میں رعب تھا۔

''لیکن۔۔۔ چھوٹے سرکار۔۔۔!''

''لیکن ویکن کیا مطلب ہے۔ امداد حسین کی بیٹی کم از کم اس حد تک ہماری ذمہ داری ضرور ہے کہ راہ میں اکیلی چلتی نظر آ جائے تو ہم اس کے ساتھ چل کر اسے بحفاظت گھر تک لے جائیں۔'' شبنم جھجکتے جھجکتے گاڑی میں بیٹھ گئی اور آفاق احمد نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اس معصوم سی لڑکی کے ساتھ کچی طویل سڑک پر سفر کرنا بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ آفاق احمد کو۔ بے اختیار انہیں جوہر آباد یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی فیضا اور شان بھی جو ہر دم ان کی ایک نگاہِ ناز کی منتظر رہتی تھیں۔ کلب آتے جاتے آفاق کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کے بہانے ڈھونڈا کرتی تھیں۔ ان کے فیشن زدہ وجود اور میک اپ زدہ چہروں کے مقابلے میں ہر تصنع سے پاک یہ چہرہ دلفریب لگ رہا تھا۔ ان باتوں میں بے ساختگی تھی۔ کہیں سے مکر و فریب کی کوئی جھلک نہ تھی۔

''شبنم۔۔۔!'' آفاق بے اختیار اسے پکار اٹھے۔

اس نے فوراً آفاق احمد کی طرف دیکھا۔

''شبنم۔ مس انجلا کے پاس کیا پڑھنے جاتی ہو۔''

''وہ مجھے نویں اور دسویں کا کورس پڑھا رہی ہیں تاکہ اگلے سال میں با آسانی میٹرک کا امتحان دے سکوں۔''

''بہت خوب۔ گویا تمہیں پڑھنے کا شوق ہے۔''

''ہاں!'' شبنم مسکرائی۔ ''لیکن مجھ سے زیادہ بابا کو اور بابا سے زیادہ بڑے سرکار کو۔ بڑے سرکار کہتے ہیں شبنم پڑھ لکھ کر ضرور کچھ نہ کچھ بنے۔ اس کی منزل باقر پور نہیں۔''

آفاق نے اس کے پُر اعتماد چہرے کی طرف دیکھا۔

''ہاں شبنم! میرے بابا حضور سچ کہتے ہیں۔ تمہاری منزل صرف آفاق احمد بخاری کا دل ہے جہاں تک تم پہلے دن ہی پہنچ گئی تھیں۔''

آفاق نے اپنے آپ سے سے بھی چھپا کر سوچا۔

''تو اور کہاں ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''میں نے تو کئی بار بابا سے کہا ہے میں جوہر آباد چلی جاؤں گی بڑے سرکار مجھے اسکول میں داخل کرا دیں گے۔ لیکن بابا تو بھولے سے بھی مجھے جوہر آباد لے جانے پر تیار نہیں۔''

''ہم تمہیں لے جائیں گے جوہر آباد۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟'' آفاق نے خوب صورت مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔

شبنم لجا سی گئی۔

''نہیں چھوٹے سرکار۔''

''کیسے نہیں۔ اب ہم جوہر آباد جائیں گے تو بابا حضور کو بتا دیں گے۔ ہمیں شبنم کے ہاتھ کی کھیر بہت پسند ہے۔ آپ شبنم کو ریاض کا محل میں ہی رکھ لیں۔ یہ پڑھتی بھی رہے گی اور گاہے بگاہے ہماری پسند کی سویٹ ڈش بھی بناتی رہے گی۔''

وہ مسکرا دی۔ آفاق لمحہ بھر خاموش رہے پھر بولے۔

''شبنم! کیا ایسا ممکن نہیں کہ جتنے دن ہم باقر پور میں ہیں تم مس انجلا کے پاس جایا ہی نہ کرو۔ گھر پر پڑھ لیا کرو۔ کوئی مشکل ہو تو ہم بتا دیا کریں گے۔ اسٹڈی میں تمہاری مدد کر دیا کریں گے۔''

''میں بابا سے پوچھ لوں گی۔'' اس نے بات ختم کر دی۔

حویلی آ گئی۔ بیرونی کمپاؤنڈ میں یہاں سے وہاں تک کپاس کے ڈھیر تھے۔ بے شمار عورتیں وہاں موجود تھیں۔ سب ہی ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ کام کرتے ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگیں۔ آفاق نے جیپ احاطے کے باہر روک دی تھی۔ شبنم ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ آفاق سب سے قطعاً بے نیاز بنے اندر چلے آئے۔

امداد حسین بھی ان کے پیچھے اندر چلا آیا۔

''آپ نے بہت دیر لگا دی چھوٹے سرکار۔ میں نے سوچا شاید آپ باقر پور سے گھبرا کر جوہر آباد چلے گئے ہیں۔''

''باقر پور سے گھبرانا کیسا امداد حسین۔ ہم سیٹھ ارشاد کے پاس چلے گئے تھے۔ اور بابا حضور کو صورت حال سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا۔ خط بھی ڈالا اور واپس چلے آئے۔''

''بٹیا رانی آپ کو کہاں سے مل گئی؟'' امداد حسین خوش باش سا ان سے پوچھ رہا تھا۔

''ابھی میں تم سے بات کرنے والا تھا۔ امداد حسین! شبنم کو تنہا اتنی دور نہیں جانا چاہیے۔''

''چھوٹے سرکار! آپ دیکھ رہے ہیں۔ باہر کپاس کے انبار ہیں۔ میں کوشش کے باوجود کام جلد مکمل نہیں کرا سکا۔''

''بے شک ایک اور ملازم نگرانی کے لیے رکھ لو لیکن شبنم کو صرف تمہاری نگرانی کی ضرورت ہے۔''

آفاق جانے کن جذبوں کے تحت یہ سب کچھ کہہ گئے تھے۔ امداد حسین کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کی۔

''بہتر سرکار! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

آفاق اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

رات کو جب وہ کھانا کھا رہے تھے۔ امداد حسین حسب معمول ان کے قریب تھا۔

''چھوٹے سرکار! آپ نے بٹیا رانی سے کیا کہا تھا آج؟'' آفاق نے ہاتھ روک کر امداد حسین کی طرف دیکھا۔ تھوڑے تھوڑے گھبرائے۔

''کیا اس نے کچھ کہا؟'' وہ ہولے سے مسکرائے۔

''چھوٹے سرکار! میں نے بٹیا رانی کو بہت پیار سے پروان چڑھایا ہے۔ ہر ضد پوری کی ہے۔ پھر بڑے سرکار بھی غریبوں سے محبت کرتے ہیں۔ وہ جب بھی یہاں آتے ہیں شبنم سے خصوصی توجہ اور مروت برتتے ہیں۔ آپ نے شاید مذاق میں کہہ دیا ہوگا کہ آپ اسے پڑھا دیا کریں گے۔ لیکن میری نادان بٹیا اسے سچ سمجھ بیٹھی ہے اور اس نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ جب تک آپ باقر پور میں ہیں وہ مس انجلا کے پاس پڑھنے نہیں جایا کرے گی۔''

''ہاں امداد حسین۔ ہم یہاں فارغ ہی رہتے ہیں اگر تم محسوس نہ کرو تو ہمیں شبنم کو پڑھانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ ہمارا وقت اچھی طرح کٹ جایا کرے گا۔''

''مہربانی چھوٹے سرکار۔ لیکن مجھے شرم آتی ہے۔ آپ۔۔۔ آپ۔''

''ایسی کوئی بات نہیں امداد حسین۔ ہم جانتے ہیں تمہیں بھی اور تمہاری وفاداریوں کو بھی۔ اور

تمہاری وفاداریوں کا ریاض احمد بخاری کے بیٹے پر اتنا حق ضرور ہے۔''

آفاق اپنی عمر سے کہیں بڑی باتیں کرنے لگے تھے۔ امداد حسین کچھ بھی تھا ان کے خاندان کا ایک دیرینہ اور ادنیٰ ملازم تھا۔ انکار کی مجال کہاں تھی اس میں۔ جب کہ ریاض احمد بخاری کا حکم اسے مل چکا تھا کہ ان کے لاڈلے ولی عہد کو باقر پور میں ہلکی سی الجھن یا پریشانی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ دونوں اپنی اپنی مجبوریوں کے قیدی تھے لیکن ایک دوسرے پر احسان کر رہے تھے۔

''آپ کا احسان ہے حضور! ورنہ میں کیا اور میری وفاداریاں کیا۔''

''بہر حال کل گیارہ بجے جب ہم ریاض آباد سے واپس آئیں گے تو شبنم کی مدد ضرور کریں گے پڑھائی میں۔ ہمیں خوشی ہے کہ جہالت کی ان فضاؤں میں تم نے اپنی بیٹی کو علم کی روشنی مہیا کی ہے۔ اس کی ترقی پر بابا حضور کی طرح ہم بھی خوش ہوں گے۔''

دوسرے دن وہ نو بجے ہی ریاض آباد چلے گئے۔ جوان کی جاگیر ہی کا حصہ تھا۔ دو گھنٹوں میں کام کیا اور حویلی آ گئے۔

شبنم برآمدے میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان کتاب کھولے پڑھ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ آفاق نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کا کہا اور خود ایک کرسی سنبھال لی۔

''دیکھو شبنم! ہم نے تمہیں پڑھانے کی ہامی بھری ہے۔ تم ہمیں مکمل استاد ہی نہ سمجھ لو۔ ہمیں تو پڑھنے پڑھانے والے اس شعبے سے ذرّہ برابر دلچسپی نہیں۔''

''تو کیا آپ پروفیسر نہیں بنیں گے؟''

آفاق کو اس کی معصومیت پر ہنسی آ گئی۔

''اوہ شبنم! تعلیم کے علاوہ بھی کئی شعبے ہیں۔ بابا جان تو ہمیں پکا جاگیردار بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم بیرسٹر بنیں گے قانون پڑھیں گے۔ قانون کے لیے لڑیں گے۔''

''وہ کیا ہوتا ہے چھوٹے سرکار؟''

''سخت نکمی شاگرد ہو تم جسے یہ ہی علم نہیں۔ بھئی بیرسٹر لوگوں کو حق اور انصاف دلانے میں ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیا تم نے شہریت نہیں پڑھی۔ عدالتوں کا ذکر نہیں پڑھا؟''

''پڑھا ہے۔ اچھا آپ وکیل بنیں گے۔ مقدمے لڑیں گے مگر چھوٹے سرکار۔۔۔''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں ہاں کہو نا۔ رک کیوں گئیں۔''

''بابا کہتے ہیں وکیلوں کی زندگی جھوٹ ہی جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے۔''

''ایسا ضرور ہوتا ہوگا۔ لیکن ہم جھوٹ نہیں بولیں گے ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیں گے۔ ظالم کے ظلم کے خلاف آواز بلند کریں گے۔ حق دار کو اس کا حق دلوائیں گے۔ اور پاکستان کے قانون کا احترام کریں گے۔ لوگوں میں آفاق احمد بخاری کا نام ہوگا۔ سچائی کے لیے لوگ ہماری مثالیں دیں گے۔'' وہ جوش میں آ کر کہے جا رہے تھے۔

شبنم کے دل کی خوشی کا عکس اس کے چہرے پر واضح تھا۔

''شبنم۔ ہم باقر پور سے جاتے ہی لندن چلے جائیں گے۔ چار پانچ سال بعد وہاں سے بیرسٹر کی ڈگری لے کر لوٹ آئیں گے اور کسی بڑے شہر میں پریکٹس شروع کر دیں گے۔ ہوسکتا ہے ان چار پانچ سالوں میں شاید تم بھی کسی کالج کی معلمہ بن جاؤ اور کبھی ہم گاڑی میں بیٹھے کورٹ کا رُخ کر رہے ہوں تو پروفیسرز کالونی کے کسی بنگلے کے گیٹ پر تمہارے نام کی پلیٹ دیکھ کر اندر آجائیں۔ اپنی دیرینہ شاگرد کو دیکھنے۔''

آفاق احمد ایک کتاب الٹ پلٹ کرتے ہوئے شوخی سے یہ سب کہے جا رہے تھے۔

''چھوٹے سرکار! آپ بیرسٹر بن جائیں۔ یہ بات قابلِ یقین ہے۔ لیکن شبنم جیسی عام سی لڑکی کسی کالج کی معلمہ ہو یہ تو خواب کی باتیں ہیں۔ میرا بابا تو آپ کا ادنیٰ ملازم ہے چھوٹے سرکار۔ میرے لیے تو یہ بھی بہت ہے کہ اپنے شوق کے تحت میں میٹرک کرلوں۔ باقر پور کے ایک پرائمری اسکول کی استانی بن جاؤں۔ اور باقر پور کے لوگوں میں علم کی روشنی پھیلاؤں۔'' شبنم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے جھٹ وہ آنسو اپنے آنچل میں سمیٹ لیے اور کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔

''شبنم۔۔۔!'' آفاق احمد غزالی آنکھوں کے یہ آنسو نہ دیکھ سکے۔

''شبنم! ہم بابا حضور سے کہہ کر تمہیں جوہر آباد کے کالج میں داخل کرا دیں گے۔ تمہاری تعلیم کا ذمہ ہم اٹھالیں گے۔ ایک اچھی لڑکی تعلیم سے محروم رہ جائے ہمیں بے حد دکھ ہوگا۔'' وہ جذباتی سے ہوگئے۔ پھر شبنم نے موضوع بدلنے کی خاطر انگریزی کی نصابی کتاب ان کے آگے کردی اور وہ اسے پڑھانے میں منہمک ہوگئے۔

باقر پور آئے انہیں ایک ہفتے سے زیادہ دن ہوگئے تھے آٹھ دس دنوں میں وہ ایک بار بھی حویلی سے ملحق باغ میں نہیں گئے۔ صبح دم دریچے میں کھڑے ہو کر شیو بناتے ہوئے انہوں نے سامنے دیکھا۔ یاسمین کے کھلے پھولوں نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔ انگارہ گلابوں نے اپنی طرف بلایا۔ نہانے کا ارادہ ترک کر کے منہ ہاتھ دھو کر وہ برآمدے کی مشرقی سیڑھیاں اتر کر باغ کی طرف چلے آئے۔ مسحور کن فضاؤں میں آکر انہیں جوہر آباد کے حسین ترین نظارے بھی بھول گئے۔ تراشیدہ سرسبز گھاس کی ہموار سطح شبنم کے قطروں سے سجی تھی۔ سورج کی روپہلی کرنیں اسے موتیوں جیسی چمک دمک دے رہی تھیں۔ آہستگی سے چلتے ہوئے وہ فوارے کے قریب آگئے۔ جہاں پانی ساکت تھا۔ خاموش تھا۔ ساکت فضاؤں میں ان کے قدموں کی آہٹ بھی کوئی ارتعاش نہیں پیدا کر رہی تھی۔ وہ یاسمین کے بڑے سارے کنج کی طرف بڑھے۔ ہاتھ بڑھا کر ایک نرم و نازک پھول توڑنا ہی چاہتے تھے کہ ایک سفید آنچل نے انہیں چونکا دیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ آئے۔ شبنم نیچے بیٹھی آنچل میں پھول جمع کر رہی تھی جو اس کے سامنے گھاس پر بکھرے تھے۔ انہیں دیکھ کر گھبرا کر جو اٹھی تو آنچل میں سمٹے سارے پھول آفاق کے قدموں میں بکھر گئے۔ وہ پریشان سی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سفید لباس میں صبح کے نیم روشن اجالے میں وہ آسمان سے اُتری حور لگ رہی تھی۔

''اچھا۔ صبح صبح آپ کا کاروبار یہی ہوا کرتا ہے۔'' آفاق نے بڑے احترام سے پوچھا۔ آفاق ہاتھ سینے پر باندھے اسے ایک ٹک دیکھے جا رہے تھے اور وہ نظریں جھکائے نیچے بکھرے پھولوں کو دیکھے

جارہی تھی۔

میں تو گلدستے بنانے آئی تھی۔ آتے ہی یاسمین کے نرم و نازک پھولوں پر نظر پڑی۔ اچھے لگے، بے اختیار ادھر چلی آئی اور انہیں چُن لیا۔'' اس کی سادگی نے آفاق کا دل لوٹ لیا۔

''ہم بھی باقر پور جاگیر کا نظام سنبھالنے آئے تھے۔ تم نظر آئیں۔ دل کو بھا گئیں۔ ہم بے اختیار تمہاری طرف کھنچتے چلے آئے۔ ہم نے اپنا آپ تمہیں سونپ دیا۔ تم نے ہماری راتوں کی نیند چرالی۔ شبنم اپنی محبت، اپنے جذبے ہمیں دے دو، تم بے شک یاسمین کے ان پھولوں کی طرح نرم و نازک ہو۔ ہم تمہیں بہت حفاظت سے زندگی بھر اپنے دل کے گل دان میں سجائے رکھیں گے۔''

شبنم حیرت سے آنکھیں وا کیے انہیں دیکھے جارہی تھی۔ اس کا وجود لرز رہا تھا۔ کانپ رہا تھا۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی باغ کی حدود سے نکل گئی۔

آفاق کتنی دیر وہیں کھڑے اس کی خوشبو کو محسوس کرتے رہے جو گلشن کے سب پھولوں پر حاوی تھی۔

❁❁❁❁

آج بھی انہیں ریاض آباد جانا تھا۔ باغ سے لوٹ کر آتے ہی انہوں نے ناشتا کیا اور عاشق کو ساتھ لے کر چلے گئے۔

واپسی میں دن کے گیارہ بج گئے۔ حویلی میں داخل ہو کر انہوں نے اِدھر اُدھر نگاہ کی۔ طویل برآمدے میں کرسیاں اور میز ترتیب سے رکھی تھیں۔ تازہ پھول گل دان میں سجے تھے لیکن شبنم کہیں نہ تھی۔ وہ بے چین ہو گئے۔ اپنے آپ پر غصہ آیا۔ شبنم ان کے انتظار سے گھبرا کر مس انجلا کے پاس چلی گئی تھی۔ اب وہ کس سے اس کے بارے میں پوچھیں۔

تبھی مغربی سیڑھیاں طے کر کے اختر انہیں اپنی طرف آتی دکھائی دی۔

''آپ آگئے چھوٹے سرکار۔۔۔؟''

''ہاں آج میرا کھیتوں میں جانے کا پروگرام تھا لوٹ آیا۔ پھر شبنم کو پڑھانا تھا۔''

''چھوٹے سرکار! بٹیا رانی نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے آپ کے جاتے ہی امداد حسین بھی چلا گیا تھا۔ صبح اچھی بھلی باغ میں گئی تھی۔ واپس آتے ہی بستر پر پڑ گئی۔ میں نے سوچا سردی لگ گئی ہوگی۔ سبھی لحاف لے کر سوگئی ہے۔ ناشتے کے لیے جگایا تو آنکھیں سرخ انگارہ تھیں اور جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔''

''جی۔۔۔!'' آفاق ایک دم گھبرا گئے۔

''امداد حسین کا بھی دماغ خراب ہے۔ سو بار کہا ہے جوان جہان بچی اکیلی باغ میں نہ جائے لیکن اسے تو بھوت پریت جنات وغیرہ جاہلیت کی باتیں لگتی ہیں۔ اب آ کے خود ہی سنبھالے گا نا۔'' اختر غصے میں تھی۔ آفاق حیران تھے۔ شبنم کو کیا ہو گیا تھا۔

''اختر بی! میں شبنم کو دیکھ لوں۔''

''آپ کیا تکلیف کریں گے چھوٹے سرکار۔۔۔!'' اختر گھبرا گئی۔

''نہیں۔ ہم اسے دیکھنے جائیں گے۔ طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو ڈاکٹر کو یہیں بلوالیں گے۔''

آفاق، اختر کے ساتھ اس کے چھوٹے سے صاف ستھرے گھر میں چلے آئے جو حویلی سے ملحق تھا۔ اختر انہیں لے کر بٹیارانی کے کمرے میں آ گئی۔

آفاق کو پل سے بھی پہلے اسے دیکھنے کی خواہش تھی۔ کیا ہو گیا تھا اسے۔ صبح تو اچھی بھلی تھی۔ اختر نے لحاف کا کونا پکڑ کے اوپر اٹھایا۔ اس کا چہرہ بخار کی شدت سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔ سوجی سوجی آنکھیں بند تھیں۔ اختر نے اسے پکارا۔

''بیٹا۔۔۔ بٹیارانی۔۔۔ شبنم۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔ دیکھو نا بٹیا کون آئے ہیں؟''

آفاق اختر کے ساتھ کھڑے کھڑے سے جھکے اسے دیکھنے میں محو تھے۔

اس نے بروقت آنکھیں کھولیں۔ ذرا سا رخ موڑ کر آفاق کی طرف دیکھا۔ سرخ سرخ آنکھیں نفرت کی ایک سخت لہر لیے ان پر جمیں اور دوسرے پل اس نے ان کی طرف سے رخ پھیر لیا اور لحاف میں چہرہ چھپا لیا۔

سرخ انگارہ سی آنکھوں میں نفرت کی جو ایک لہر تھی۔ اسے آفاق نے ایک پل میں بخوبی پہچان لیا تھا۔ لیکن اس کی وجہ اور سبب سے ایک دم بے خبر تھے۔

''بٹیا! چھوٹے سرکار نہیں دیکھنے آئے ہیں۔'' اختر نے پھر لحاف اوپر اٹھایا۔ وہ رخ پھیر کے آنکھیں بند کیے بے نیاز ہی بنی رہی۔ اختر نے اس کا ماتھا چھو کر دیکھا اور گھبرا اٹھی۔

''چھوٹے سرکار! شدید بخار ہے بٹیارانی کو۔ امداد حسین تو صبح کا گیا شام تک ہی لوٹے گا۔ بٹیا کا کیا ہو گا؟''

''اختر بی! پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی ڈرائیور کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلواتا ہوں۔''

وہ کمرے سے نکل گئے۔ فضل حسین کو شہر بھیج کر وہ دوبارہ ادھر ہی آ گئے اختر کمرے میں نہ تھی۔ قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے پھر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ صاف ستھرے کمرے میں رکھا ساز وسامان کچھ زیادہ قیمت کا حامل نہ تھا لیکن سلیقے نے کمرے کو خوب صورت بنا رکھا تھا۔ یقیناً امداد حسین کو اپنی بیٹی سے بہت پیار تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی ساری کمائی بس شبنم کی ذات پر ہی خرچ کر دیتا ہے۔

سامنے لگی الماری کے شیشوں سے بہت سی کتابیں جھانک رہی تھیں جو سب کی سب کورس کی کتابیں ہرگز نہ تھیں۔ ان میں زیادہ تر ادبی کتب ہی تھیں۔ جنہیں آج تک خود آفاق نے بھی چھو کر نہ دیکھا تھا۔ گاؤں کے ایک غیر معیاری اسکول سے مڈل پاس کرنے والی لڑکی کیا اس قدر لائق فائق تھی اور اس کا ذوق اتنا بلند تھا۔ انہیں یقین ہی نہ آیا کہ یہ کتابیں شبنم کی ہو سکتی ہیں۔ پھر وہ شبنم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جھجکتے جھجکتے آخر انہوں نے لحاف تھوڑا سا اوپر سرکا ہی لیا۔

''شبنم۔۔۔! شبنم! دیکھو پلیز میری بات تو سنو شبنم۔'' وہ نفرت کی اس لہر سے ہراساں تھے۔ کیوں آخر کیوں؟ شبنم تو دل سے ان کا احترام کرتی تھی۔ اس نظر سے کیوں انہیں دیکھا۔

شبنم نے وہی سرخ سرخ جلتی آنکھیں ان پر مرکوز کر دیں۔

آفاق نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن جلتی آنکھوں کے قہر نے انہیں گویا سہما سا دیا۔ پھر وہ مسکرا دیے۔

''کیا بات ہے شبنم! لگتا ہے تم مجھ سے کچھ خفا ہو۔ مجھے خبر تھی کہ تم نے مجھے نہ پا کر میرا انتظار کیا ہوگا۔ لیکن کام دھندوں میں الجھ کر شاید شام تک بھی واپس نہ آسکتا۔ بس تمہارے خیال سے کام ادھورے چھوڑ کر بھاگا چلا آیا۔''

وہ خاموش رہی۔ بخار کی حدت سے تمتمایا چہرہ اسے اور بھی دلکش بنائے جا رہا تھا۔ آفاق بے چین سے ہو اٹھے۔ کرسی کچھ قریب کھسکالی۔

''لیکن شبنم! یہاں آکر تو کایا ہی پلٹی نظر آئی۔ اختر بی نے بتایا کہ تمہیں بخار ہو گیا ہے۔ صبح تو تم اچھی بھلی تھیں۔ اچانک کیا ہو گیا۔ وہ بے چاری سیدھی سادی خاتون کہہ رہی تھیں۔ شبنم کو اکیلے باغوں میں نہیں پھرنا چاہیے۔ شبنم تم انہیں بتا دیتیں کہ ہم کسی محافظ کی طرح تمہارے ساتھ تھے اور جو محسوس کرو تو ہم ہر دم ہی تمہارے ساتھ ہوتے ہیں۔'' ان کی نگاہوں میں وارفتگی سی بھر آئی تھی۔ ابھی وہ شبنم کی طرف سے کسی خوش کن جواب کے منتظر اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ لحاف دور پھینک دیا اور ایک دم پھٹ پڑی۔

''خاموش رہیں چھوٹے سرکار! میں نے بہت کچھ سن لیا۔ آپ کا احترام مجھ پر فرض ہے اس لیے کہ آپ میرے بابا کے مالک کے بیٹے ہیں۔ لیکن آپ کی الٹی سیدھی باتیں سننا مجھ پر فرض نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ کچھ اور چیز ہیں۔ آپ کی ظاہری صورت آپ کا ظاہری کردار مجھے یہی بتا رہا تھا لیکن آپ میں اور اس اوباش اکبر علی میں کوئی فرق نہیں۔ مجھے آپ کی ان نام نہاد ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔ کیا مجھے یہ کہنے کی ضرورت بھی ہے کہ آپ اس کمرے سے فی الفور چلے جائیں۔''

آفاق اس صورتِ حال پر ہکا بکا سے اس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ خاندانی جاہ و جلال نے انہیں مشتعل کیا۔ شبنم نے ان کے لیے بڑے غلط الفاظ استعمال کیے تھے۔ انہیں سمجھنے میں بہت غلطی کی تھی۔ ایسے الفاظ شاید زندگی بھر کسی نے ان سے نہ کہے ہوں گے۔ لمحے بھر کو تو انہیں لگا کہ شبنم بخار کی شدت سے ہذیاتی کیفیت کا شکار ہو گئی ہے۔

''تم کیا کہہ رہی ہو شبنم؟'' انہوں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے تصحیح چاہی۔

''جی ہاں، چھوٹے سرکار! میں نے جو کچھ کہا ہے ہوش و حواس قائم ہوتے ہوئے کہا ہے۔ آپ نے شاید مجھے غلط لڑکی سمجھ لیا ہے لیکن میں آپ پر واضح کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ اپنی عزت اور وقار کی حفاظت میں پہلا فرض سمجھتی ہوں۔'' اس نے سخت انداز میں وضاحت کر دی۔

آفاق لمحہ بھر اس کی طرف دیکھتے رہے اور پھر اٹھ کر چلے گئے۔ اختر چائے بنا کر ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی تو وہ وہاں موجود نہ تھے۔

❁❁❁❁

اس لڑکی نے ان کے ایک معمولی سے ملازم کی بیٹی نے انہیں کرب و اضطراب کی عجیب دنیا سے روشناس کرا دیا تھا۔ فضل حسین اسی وقت ڈاکٹر کو لے آیا تھا لیکن آفاق پھر حویلی سے امداد حسین کے گھر کا رُخ ہی نہ کر سکے تھے۔ پورا دن وہ کمرے میں گھسے رہے۔ مشتعل دل و دماغ کو قابو میں کرتے رہے۔ کیا کیا کہہ ڈالا تھا اس نے۔ کتنا گھٹیا سمجھ لیا تھا انہیں۔ یہ وہی آفاق تھے جنہوں نے فیضا اور شان جیسی

لڑکیوں کو ایک نگاہِ التفات سے دیکھنا پسند نہ کیا تھا۔ سچ مچ شبنم کے حضور دل ہار بیٹھے تھے۔ لیکن اس نے انہیں کیا سمجھا۔ اُف۔۔۔ اب تو ان کا جی چاہ رہا تھا یا خود کسی دیوار سے سر ٹکرا کر مر جائیں یا اس لڑکی کو شوٹ کر دیں۔

''ہونہہ! یہ چھوٹے لوگ۔ تنگ نظر اور کم ظرف بھی تو ہوتے ہیں۔ ان کی سوچ اس سطح سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔ جس سطح پر شبنم نے مجھے لا کھڑا کیا۔ بھلا ان لوگوں کو کیا خبر ان احساسات کی جن کا تعلق خاص طور پر روح سے ہوتا ہے۔'' وہ جلتے اور کڑھتے رہے۔ اس گھڑی کو کوستے رہے جس گھڑی انہوں نے باقر پور آنے کا ارادہ کیا تھا۔ سہ پہر کو اختر خود ان کے لیے چائے لے آئی۔

''چھوٹے سرکار! بٹیا رانی اب قدرے بہتر ہے۔ فضل حسین دوائیاں بھی لے آیا تھا۔ آپ نے ناحق اتنی تکلیف کی۔ امداد حسین خود ہی حکیم صاحب کو لے آتا۔ ہاں چھوٹے سرکار! دوپہر آپ چپ چاپ ہی لوٹ آئے۔ میں چائے بنا کر لائی تو آپ وہاں موجود نہ تھے۔'' اختر کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

''آں۔۔۔ وہ مجھے باہر کوئی کام تھا۔ اسی لیے آ گیا تھا۔''

اختر چلی گئی۔ ان کا جی چاہا چائے کے برتن اور لوازمات اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیں۔ دوپہر ان سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا۔ اب چائے زہر لگ رہی تھی۔

انہوں نے میز دور کھسکا دی۔ خود اٹھے۔ لانگ کورٹ سنبھالا۔ سویٹر پہنا اور باہر آ گئے۔

''فضل حسین! امداد حسین سے کہہ دینا ہم جہانگیر نگر جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے رات واپس نہ آ سکیں۔''

جیب احاطے سے نکالی اور زناٹے دار انداز میں ڈرائیو کرتے ہوئے مغربی سمت جہانگیر نگر جانے والی شاہراہ کی طرف چل دیے۔

❁❁❁❁

''وہ لڑکی میرے اعصاب پر بوجھ بن گئی ہے عارف بہزاد۔ جی چاہ رہا ہے اسے پل سے بھی قبل گولی سے اڑا دوں۔''

''دھیرج میرے یار دھیرج۔''

''دیکھو عارف بائی گاڈ میں صرف اسی اضطراری کیفیت سے گھبرا کر تمہارے پاس چلا آیا ہوں اور تم ہو کہ مذاق میں اڑائے جا رہے ہو میری بات کو۔ وہ یوں کاٹ کھانے کو دوڑی گویا۔۔۔''

''کوئی بلا تھی۔ بلائے ناگہانی۔''

عارف نے مسکرا کر ان کا فقرہ مکمل کر دیا۔

''اوہ یونان سینس۔ عارف تم میری بات نہیں سنو گے۔''

''سن رہا ہوں دوست۔ کان کھول کر سن رہا ہوں لیکن سخت حیرت زدہ ہوں کہ ایک معمولی سی لڑکی نے جو محض تمہارے ایک پشتینی نوکر کی بیٹی ہے۔ تمہیں چکرا کر رکھ دیا ہے۔ آخر ہے کیا وہ؟''

''یہی تو مسئلہ ہے عارف بہزاد کہ وہ ایک ادنیٰ سے آدمی کی بیٹی ہونے کے باوجود بہت کچھ ہے

عارف بہزاد! خود سوچو میں جو کلاس میں موجود لڑکیوں سے، بابا کے دوستوں کی بیٹیوں سے الرجک تھا۔ اس پر کیوں مر مٹا۔ یقین کرو وہ بے حد مختلف لڑکی ہے۔ میرے دل کی اولین آرزو، اور اب ایک چیلنج۔ میں اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز عارف بہزاد! میں چند دنوں ہی میں محبت کی پھواروں میں پورے کا پورا بھیگ گیا تھا۔ اب میرا بال بال نفرت اور انتقام میں بندھا اور جکڑا ہے۔ اسے اپنی عزت اور وقار بہت عزیز ہے اور میں اسی عزت اور وقار کو خاک میں ملا کر دم لوں گا۔ مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ میں اسے یہ سزا ٹھنڈے طریقے پر دینا چاہتا ہوں۔''

آفاق احمد نے اپنے دوست عارف بہزاد کو ایک ایک بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ پھر وہ دو گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد ایک پروگرام تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے

❁❁❁❁

دوسرے دن شام کو وہ واپس آسکے۔ عارف بہزاد کے ساتھ وہ مچھلی کے شکار کو نکل گئے تھے۔ پھر اس کے گھر نہیں گئے۔ باقر پور ہی لوٹ آئے۔ شام کے دھندلکوں میں امداد حسین احاطے میں موجود کپاس کے بڑے ڈھیروں کو اندر گودام میں منتقل کروا رہا تھا۔ جب ان کی جیپ اس کے بالکل قریب آ کر رکی وہ لپک کر ان کے قریب آیا۔

''آپ آ گئے چھوٹے سرکار! میں تو پریشان ہو چلا تھا۔''

''بس شکار میں کافی وقت لگ گیا۔ امداد حسین جیپ میں تھیلا پڑا ہے۔ کچھ مچھلیاں ہیں، گھر بھجوا دو۔''

انہوں نے مختصر سی بات کی اور اندر بڑھ گئے۔ صاف ستھرا کمرا اس بات کا گواہ تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں اسے سنوارا گیا ہے۔

ان کے آنے کی خبر پاتے ہی اختر ان کے پاس آ گئی۔ حال احوال پوچھا۔

انہوں نے شبنم کے بارے میں استفسار کیا۔

''اللہ نے کرم کیا چھوٹے سرکار۔ اب تو وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

''اختر بی! واقعی اللہ نے مہربانی کی۔ ورنہ آپ تو بھوت پریتوں کے چکر میں پڑنے والی تھیں۔''

''ہاں چھوٹے سرکار! مجھے ڈر تھا۔ ویران جگہوں میں ان کا بسیرا ہو جاتا ہے۔''

''ارے اختر بی! بسیرا ضرور ہوتا ہوگا۔ لیکن انسانوں کو آزار نہیں پہنچاتے۔ اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔''

''کون؟'' امداد حسین دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''یہی جن حضرات اور کون۔ میں اختری کو بتا رہا تھا کہ انسانوں کو آزار نہیں پہنچاتے۔''

''ہاں چھوٹے سرکار! انسان کے لیے تو انسان ہی کافی ہوتے ہیں تکلیف دینے والے۔ لیکن قرآن پاک میں بھی تو ذکر ہے کہ خدا جنوں اور انسانوں کے شر سے محفوظ رکھے۔'' امداد حسین نے اپنی معلومات سے انہیں آگاہ کیا۔ پھر بولا۔

''چھوٹے سرکار! آپ نے بڑی مہربانی کی بٹیا کے دوا علاج کی۔ میں تو اس روز رات گئے گھر لوٹا

تھا۔ اگر آپ یہ زحمت نہ کرتے تو میری بٹیا۔۔۔'' امداد حسین کی آنکھیں بھر آئیں۔

''چھوڑو امداد حسین۔ یہ تو میرا فرض تھا۔''

''مہربانی حضور۔ ہم لوگ بھی اسی الفت و کرم کے سائے میں یہاں موجود ہیں۔ کوئی فرق نہیں ہے چھوٹے سرکار! آپ میں اور بڑے سرکار میں۔''

''اچھا۔۔۔!'' آفاق احمد مسکرا دیے۔

صبح ناشتے میں تلی ہوئی مچھلی بھی شامل تھی۔ بے حد لذیذ لیکن آفاق کو اس میں اور ہر چیز میں کوئی لذت ہی محسوس نہ ہوئی تھی۔ نہ رنگا رنگ نظارے اور نہ کسی سے کی گئی پر لطف گفتگو انہیں چین بخش رہی تھی۔ اعصاب بے حد بے سکونی کا شکار تھے۔

انہوں نے چند نوالے کھائے اور میز سے اٹھ گئے۔ اختر نے حیران ہو کر دیکھا۔

''کیوں چھوٹے سرکار۔ کیا مچھلی ٹھیک نہیں بنی؟''

''نہیں اختر بی! بس اشتہا ہی نہیں ہے۔''

دونوں میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ آفاق نے نوکر سے کہہ کر جیپ نکلوائی اور پھر شہر چل دیے۔ کام کوئی بھی نہ تھا بس خوامخواہ ہی نکل کھڑے ہوئے تھے۔ واپسی میں حسبِ معمول گیارہ بارہ بج گئے۔ طویل کچی سڑک پر دانستہ رفتار آہستہ کیے وہ چلے آ رہے تھے۔ جب انہوں نے سڑک کے کنارے ایک لڑکی کو بیٹھے دیکھا۔ شاید وہ متوجہ نہ ہوتے لیکن اس کے پاس بکھیر کتابوں نے انہیں چونکا دیا۔ لڑکی نے اپنا پیر تھام رکھا تھا اور کرب و اضطراب کی لہریں اس کے چہرے پر واضح طور سے موجود تھیں۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ آفاق نے پاؤں بریک پر رکھ دیے۔ کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ وہ کراہ بھی رہی تھی۔ لگتا تھا سخت تکلیف کے عالم میں تھی۔ اور وہ شبنم کے علاوہ کوئی اور لڑکی تھی۔

جیپ روک کر انجن بند کر کے وہ نیچے اتر آئے تو لڑکی کی آنکھوں میں کرب کے ساتھ حیرت بھی سمٹ آئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''محترمہ! میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔ آپ یہاں تنہا ہیں اور لگتا ہے آپ کو خاصی تکلیف ہے۔''

''نن۔۔۔نن۔۔۔نہیں میں ٹھیک ہوں۔'' وہ گھبرا گئی تھی۔

''دیکھیے۔ میں آفاق احمد ہوں۔ اس علاقے کے جاگیردار کا بیٹا۔ اس لحاظ سے یہ میرا فرض بنتا ہے۔ پھر آپ اکیلی ہیں جو بات ہو مجھے بتا دیں۔''

اچانک ان کی نظر بہتے ہوئے خون پر جا پڑی۔ شاید ایڑی میں بڑا سا کانٹا چبھ گیا تھا۔

''کہاں سے آ رہی ہیں آپ؟''

''میں میڈم انجلا کے پاس گئی تھی۔'' اس کی آنکھوں میں حیرت اب بھی ویسی کی ویسی تھی۔

''آپ کا نام برجیس ہے نا۔۔۔؟'' آفاق نے تیقن کے ساتھ پوچھا۔

''ارے آپ کو کیسے خبر ہوئی؟'' اب اس کے لبوں پر مسکراہٹ بھی تھی۔

آفاق احمد نے بکھری ہوئی کتابیں چن لیں۔

''اپنے علاقے کے ایک ایک فرد سے آگاہ ہوں میں۔ دیکھ لیجیے ہے نا کمال۔'' برجیس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سسکاری بھر کر پھر بیٹھ گئی۔

''بہت تکلیف ہے کیا؟ ہوا کیا ہے؟''

کانٹا چبھ گیا تھا ایڑی میں۔ کانٹا تو میں نے نکال لیا لیکن جلن اور درد اسی طرح ہو رہا ہے۔''

''پھر تو آپ چل بھی نہیں سکیں گی۔ وہ آپ کی ہمزاد آپ کے ساتھ ہوتیں تو آپ کو سہارا دے دیتیں۔ آیئے میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دوں۔''

''آپ شبنم کی بات کر رہے ہیں۔ ارے آپ اسے بھی جانتے ہیں۔'' وہ خوش ہوگئی۔

''دراصل میں اور شبنم اکٹھے ہی آیا کرتے ہیں۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ میرے ساتھ نہیں آ رہی۔ مجھے نوکر چھوڑنے آیا کرتا تھا۔ آج کل وہ چھٹی لے کر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ مجھے تنہا آنا پڑا۔ اچھا تو وہ آپ ہیں جن کی آمد کی وجہ سے میری اور شبنم کی برسوں کی رفاقت میں بے ترتیبی پیدا ہوگئی۔'' وہ مسکرائی اور پھر بڑے اعتماد کے ساتھ آفاق کے ساتھ چلتی جیپ تک آ گئی۔ حد درجہ خود اعتمادی تھی اس میں۔

''بڑا پیار ہے آپ دونوں کے مابین۔''

''جی ہاں۔ ہم ایک دوسرے کو بہت عزیز ہیں۔''

برجیس اپنی وضع قطع کے لحاظ سے کسی اونچے گھرانے کی لگ رہی تھی۔ ادب آداب سے واقف، لہجے میں موجود شگفتگی نے آفاق کو بے حد متاثر کیا۔ امداد حسین کی بیٹی کی دوستی آخر ایسی لڑکی سے کیوں کر ہوئی۔

''اصل میں ہماری دوستی کی ابتدا بچپن میں ہوئی تھی۔ دونوں طرف خلوص کی فراوانی تھی۔ لہٰذا آج تک دوستی چل ہی رہی ہے۔''

''اچھی بات ہے، اسی فارمولے کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا میں یہ امید رکھوں کہ آپ مجھے ایک عرصہ یاد رکھ سکیں گی۔''

''کیا مطلب؟'' برجیس گڑبڑا گئی۔

''میرا مطلب ہے ایک اچھے دوست کی حیثیت سے۔''

شاید برجیس ان کے انداز کو نہ سمجھ سکی۔ شہر کی لڑکیوں میں اور کھلی بے ریا فضاؤں میں پلنے والی دوشیزاؤں میں بہت زیادہ فرق تھا۔ لفظ دوست سن کر وہ سٹپٹا گئی۔

''دیکھیے نا۔ میں کئی دنوں سے آپ سے ملاقات کی آرزو دل میں لیے ہوئے تھا۔ لیکن ملاقات کا موقع میسر نہ آیا۔ اور آپ کی دوست شبنم بھی بس۔ اب کیا کہوں۔ شاید اس نے جان بوجھ کر آپ سے ہماری ملاقات نہ کروائی ہو۔''

اب برجیس پہلے سے بھی زیادہ ہراساں تھی۔ آفاق اپنی کہے گئے۔

''برجیس آپ پہلی نظر میں ہی میرے معیار پر پوری اتریں۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ مجھے ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے اپنے دل میں جگہ دیں گی۔''

''اوہ۔۔۔!'' برجیس کی آنکھیں خوشی کی روشنیوں سے چمکنے لگیں۔

''یہ تو میرے لیے بے حد فخر کی بات ہوگی کہ آپ کے ساتھ ایسا مقدس رشتہ پل کی پل میں جڑ جائے۔ لیکن مجھے یہ تو بتایئے کیا شبنم نے آپ کو خبر دی ہے کہ میں ایک عدد بھائی کی محبت سے یکسر محروم ہوں۔ میرا کوئی بھائی نہیں۔''

''آج کے بعد آپ ایسا نہیں کہیں گی برجیس۔ میں جو ہوں آپ کا بھائی۔ اور ہاں سڑک تو مڑنے والی ہے دو اطراف میں۔ آپ یہ بتایئے کہ آپ کو کس طرف جانا ہے؟''

''سیدھے چلے چلیے۔ میرا گھر شاہراہ کے قریب ہی ہے۔''

پندرہ منٹ کے سفر کے بعد وہ برجیس کی حویلی میں اس کے بابا سجاول خان سے متعارف ہونے کے بعد ہم کلام تھے۔ بڑی دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو میں محو رہے۔ کھانا بھی ان سب اہلِ خانہ کے ساتھ مل کر کھایا۔ سجاول خان، ریاض احمد بخاری کے حلقۂ احباب سے ہی متعلق تھا۔ اجنبیت کی دیواریں ان کا نام آتے ہی گر گئی تھیں۔ دورانِ گفتگو شبنم کا نام بھی آیا۔ اس کے کردار، اس کی ذہانت، کم عمری کے باوجود متانت اور سنجیدگی کا ذکر بھی آیا۔

سجاول خان شبنم کی تعریف میں طب اللسان تھے اور برجیس فخر محسوس کر رہی تھی۔ دوسرے دن کے لیے آفاق احمد نے ان سب کو اپنے ہاں مدعو کیا اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد گھر لوٹ آئے۔

سرمائی دوپہر خاصی گرم گرم سی ہوگئی تھی۔ یہ حدت کچھ خوش گوار ہوگئی۔ جب انہوں نے عقبی برآمدے میں آکر دیکھا تو شبنم اپنی کتابوں سمیت وسط میں رکھی میز کے گرد پڑی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان تھی۔ وہ لمحہ بھر کو ٹھٹک کر اپنی جگہ پر رک گئے۔ لیکن وہ سچ مچ سامنے موجود تھی۔ کتاب کے مطالعے میں مستغرق، قدموں کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ دو دن کے بخار میں اس کے چہرے کی سرخیاں کہاں کھو کر رہ گئی تھیں۔ آفاق اس سے خفا تھے، برہم تھے۔ اب بھی ان کے چہرے پر ساری خفگی اور ناراضی سمٹ آئی۔ انہیں دیکھ کر اس نے کتاب بند کر دی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آداب۔۔۔!'' چہرے پر نہ ندامت تھی نہ محبت، نہ نفرت نہ اجتناب، سپاٹ سا چہرہ تھا۔ یا اسے خود پر ضبط حاصل تھا۔

آفاق دو چار قدم چل کر آگے بڑھ آئے۔

''آپ یہاں کیسے آگئیں شبنم صاحبہ۔'' ان کے لہجے میں طنز عود کر آیا۔

''پڑھنے کے لیے۔''

''کہیں آپ کی عزت اور وقار کو کوئی چوٹ لگ گئی تو۔۔۔ بھلا مجھ میں اور اس اوباش اکبر علی میں فرق ہی کیا ہے۔'' سخت خفا خفا اور روٹھے روٹھے نظریں سامنے دیوار پر جمائے وہ کہے جا رہے تھے۔ اور شبنم اپنی جگہ پر کھڑی دوپٹے کا آنچل مروڑے جا رہی تھی۔

''میں اپنے ناروا سلوک پر معافی چاہتی ہوں چھوٹے سرکار۔'' اصل میں وہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ لیکن اپنا مافی الضمیر کرنے سے قاصر رہی۔ پھر بات بدل کر بولی۔

''بابا کا اصرار تھا کہ جتنے دن آپ یہاں ہیں میں پڑھائی میں آپ سے ہر ممکن مدد لوں۔ وہ خود بھی یہیں بیٹھے تھے۔ ابھی ابھی گئے ہیں۔''

''امداد حسین کی کوئی بات ہم ٹال نہیں سکتے۔ اس کی ہدایت ہمیں اپنے بابا حضور کی طرف سے ہے۔ لیکن ہم اپنی نظروں میں خود گرے جا رہے ہیں کہ آپ کو ہمارا وجود ہی ناگوار ہے۔''

بات کرتے کرتے آفاق نے شبنم کی طرف دیکھا۔ اس کی آنسو بھری آنکھیں چھلک جانے کو بے تاب تھیں۔ جانے کس گومگو میں تھی۔

''چھوٹے سرکار! میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ باخدا میں بہ دل و جان معافی مانگ رہی ہوں۔ کیا آپ میری خطا معاف نہیں کر سکتے؟''

ان الفاظ نے آفاق کو تسکین پہنچائی۔

''تم نے سچ مچ ہمیں بہت غلط سمجھا شبنم! ہم نے اس صبح جو کچھ کہا تھا اس میں ہمارے سچے اور کھرے جذبوں کا دخل تھا اور اگر یقین نہ کر سکو تو ہم کہیں وہ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا تھا۔ معافی کی صورت بس ایک ہی ہے۔''

''وہ کیا؟'' شبنم مسکرائی۔

''تم خود ہی سمجھ لو شبنم خود ہی جان جاؤ۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔'' ان کی پُر اشتیاق نظروں کی برق شبنم کے نرم و نازک جسم و جاں پر گری۔ اور شبنم پلکیں جھپکتی رہ گئیں۔

''چھوٹے سرکار! بہت سا فاصلہ ہے آپ کی اور میری زندگی کے درمیان بہت سا فرق ہے آپ کے اور میرے درمیان خاک نشین اور عرش نشین جتنا۔''

''دل ان فاصلوں اور فرق سے بہت آگے ہوتے ہیں۔ کسی کی نہیں مانتے بس اپنی ہی منواتے ہیں۔ میری زندگی بن کر مجھ سے جینے کے ڈھنگ نہ چھینو شبنم! میں تو پہلی ملاقات میں تمہیں دل میں بسا بیٹھا تھا۔ تم میری ہو اور ابد تک میری رہو گی۔''

آفاق جذباتی ہو گئے۔ کرسی پیچھے دھکیل کر اس پر بیٹھے اور ایک کتاب کھول کر دیکھنے لگے۔ شبنم بھی دوسری طرف بیٹھ گئی۔

''شبنم! ہم ابھی ابھی تمہاری دوست برجیس کے گھر سے آ رہے ہیں۔''

''وہ کیوں؟ کیا کرنے گئے تھے ان کے گھر آپ؟''

''حال دن سنانے۔''

''اوہ میرے خدا! کس کو، برجیس کو؟''

''ہاں ہاں۔۔۔ ہم نے کہہ دیا سب کچھ کہہ دیا۔ تمہارا عتاب اپنی دیوانگیاں، بلکہ اس سے التجا کی وہ تمہارے حضور ہماری سفارش کرے۔''

''اُف اللہ یہ کیا کیا آپ نے۔ وہ کیا سوچے گی میرے بارے میں۔''

''یہی کہ تم کتنی سنگ دل ہو، ظالم ہو، ایک اچھا بھلا بندہ تمہاری نگاہ ناز میں جگہ پانے میں کامیاب نہیں ہو رہا۔ شبنم! ہماری طرف دیکھو، کیا ہم تمہیں محبت کے قابل نظر نہیں آ رہے۔ کیا ہم تمہارے دل میں آباد ہونے کے لائق نہیں ہیں؟''

ان کا انداز التجائیانہ تھا۔ شبنم کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے دل میں سوچا۔

چھوٹے سرکار! آپ میں اور شبنم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ شبنم نے بھی تو پہلے دن ہی آپ کو دل میں بسالیا تھا۔ مگر وہ جانتی ہے۔ زمانہ غریب کو محبت کرنے کی بھی بہت بڑی سزا دیتا ہے۔ میں آپ کے ایک ادنیٰ ملازم کی بیٹی بڑے سرکار کب یہ چاہیں گے کہ۔۔۔"

آگے وہ کچھ سوچ ہی نہ سکی اور اس کی پلکیں پھر بھیگ گئیں۔

"یہ بات تو نہیں چھوٹے سرکار بس۔۔۔"

"بس وس کچھ نہیں۔ شبنم رانی! تم آفاق کے دل کی ملکہ ہو۔ وہ تمہیں دل و جان سے چاہتا ہے اور محبت کے جواب میں تم سے محبت کا طلب گار ہے بولو منظور۔۔۔؟"

شبنم پہلے کی طرح اُن کی طرف دیکھ کر مسکرادی اور آفاق نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

❁❁❁❁

"دیکھو بھئی، یہاں برآمدے کے خشک ماحول میں بیٹھ کر خشک قسم کی کتابیں ہم نہیں پڑھا سکتے۔ شبنم آج تو باہر چلی چلو۔ باغ میں اُسی کنج کے قریب۔ گلاب و یاسمین کے سائے میں، سچ وہاں ہم تمہیں نثر و تشریح زیادہ بہتر طریقے پر سمجھا سکیں گے۔"

شبنم ہنس دی۔

"چھوٹے سرکار مجھے خبر ہے نا کہ باغ میں جا کر آپ کس حد تک پڑھائی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر ہم تمہیں براہ راست یہ حکم دیں گے کہ کتابیں یہیں چھوڑ کر باہر چلو۔ تو تب تم کیا کروگی؟"

"اوہ جناب انکار کی مجال کہاں۔ لیکن دیکھیے نا چند ایک سوال ہی باقی رہ گئے ہیں وہ سمجھا دیں اور پھر۔۔۔"

"پھر۔۔۔ پھر تم باہر چلوگی نا۔۔۔" شبنم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور آفاق جھٹ کتاب پر جھک گئے۔

"ہونہہ تو یہ ٹھاٹھ ہیں باقر پور کا رئیس زادہ اور اس کلموہی کے قبضے میں۔ میں تو اُسی وقت جان گئی تھی کہ دال میں کالا کالا ہے۔ بلکہ سرخ، سبز، نیلا سبھی کچھ ہے۔"

دونوں نے ہڑبڑا کر سر اٹھائے اور بائیں سمت کھڑی برجیس کو دیکھ کر شبنم آنکھیں پھاڑے حیران سی بیٹھی رہی۔

آفاق احمد اُس کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا پڑھائی کی آڑ میں یہاں یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔" آفاق اس ذو معنی فقرے پر کٹ سے گئے۔

"برجیس۔۔۔!" شبنم نے تنبیہی انداز میں اُسے گھورا۔

"تمہارے یوں گھورنے سے کیا میں ڈر جاؤں گی۔ حق بات کہنا ہی تو اپنا مشن ہے سو اس سے باز نہیں آئیں گے۔ کیوں بھائی جان ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟"

وہ شبنم سے لپٹی آفاق سے پوچھ رہی تھی۔

آفاق مسکرا کر رہ گئے۔ یہ تو خاصی شریر لڑکی تھی۔ شبنم کی دوست لیکن اس سے بے حد مختلف۔

''صاحبزادی کی علالت کی خبر سن کر بیمار پرسی کو آئی تھی۔ خالہ جان نے بتایا کہ صاحبزادی اُدھر حویلی میں۔۔۔'' فقرا ادھورا چھوڑ کر اس نے نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ دانتوں میں دبالیا۔

''ویسے ایک بات تو خاص طور پر ان بھائی صاحب کے سامنے ہی پوچھوں گی کہ اے گھنی لڑکی تو نے اتنے اچھے بندے کو پھانس کیسے لیا۔ میں لاکھ نادان سہی پر اتنا ضرور سمجھتی ہوں کہ آفاق صاحب کو بلا وجہ بلاسبب اپنی مصروف زندگی میں اتنا وقت نہیں مل پاتا کہ وہ اسے تیرے ناز نخروں کی نذر کر دیں۔''

''برجیس خدا کے لیے کبھی تو سوچ سمجھ کر بات کر لیا کرو۔''

''اگر تم مجھ سے مشورہ کر کے یہ سب کچھ کرتیں تو میں بھی اپنی بات چیت میں محتاط ہو جاتی۔ سخت غصہ ہے مجھے تمہاری اس حرکت پر۔'' برجیس کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شبنم کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

''میرا خیال ہے شبنم! اب آپ کی چھٹی کیونکہ آپ کی دوست کئی دنوں کے بعد ملی ہیں۔''

شبنم نے کتابیں سمیٹیں اور برجیس کے ساتھ گھر کی طرف چلی گئی۔

آفاق کافی دیر وہیں بیٹھے رہے۔ پھر اندر کمرے میں آ گئے اور کچھ دیر بعد بلا ارادہ اور بے سبب مشرقی سمت باغ کی طرف جا نکلے۔ گلابوں کے کنج کے اس پار انہیں شبنم اور برجیس نظر آ گئیں۔ کنج کی آڑ میں چلتے چلتے وہ پشت کی طرف اُن کے قریب آ گئے۔

''پگلی جب قسمت یوں مہربان ہو تو بندے کو منہ موڑ کر ناشکری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔''

''نہیں برجیس مجھے اپنے خوش قسمت ہونے کا یقین نہیں آتا کہیں یہ سب جھوٹ نہ ہو فریب نہ ہو۔ وہ بہت بڑے آدمی کے بیٹے ہیں۔ بہت بڑے آدمی ہیں ان کے لیے محبت ایک کھیل سے زیادہ اہم نہ ہو اور میں جان تک لٹا دوں۔ سوچو تو سہی پھر کیا ہوگا۔''

''وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔ وہ ایسے نہیں ہیں شبنم۔ اب دیکھو نا وہ صرف میرے نام سے واقف تھے۔ تمہارے حوالے سے مجھے جانتے تھے۔ مجھ سے انہوں نے جو سلوک کیا اُسے کچھ میں ہی سمجھ سکی۔ صرف تمہاری خاطر انہوں نے مجھے اتنی اہمیت دی۔ آخر وہ تمہیں اپنے دل میں کوئی مقام دیتے ہیں نا تبھی۔''

''لیکن برجیس تم یہ بھی تو سوچو میرے بابا اُن کے ایک ادنیٰ سے ملازم ہیں۔ ٹاٹ اور مخمل کا کسی دور میں کوئی جوڑ نہیں رہا۔''

''تم خود ہی تو کہا کرتی ہو بڑے سرکار بھی تمہیں بے حد چاہتے ہیں۔ تم انہیں اپنے حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں کے سبب پسند ہو۔ وہ ضرور تمہیں اپنے بیٹے کی دلہن بنائیں گے۔ آفاق ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر مسکرانے لگے۔

''شبنم تم نے وہ کہانی نہیں پڑھی تھی۔ مشہور مصنفہ طاہرہ بانو کا ناول۔ مجھے لگتا ہے تمہارے ساتھ وہی کچھ ہوگا۔ تم راج کرو گی نہ صرف آفاق احمد بخاری کے دل پر بلکہ ان کے گھر پر بھی۔''

''مت دکھاؤ خوب صورت خواب۔ بے شک آرزوؤں کا جہان میرے اندر بھی آباد ہے۔ لیکن

خوش فہمیوں میں کھوئے رہنا مجھے پسند نہیں۔"

"یہ خوش فہمی نہیں حقیقت ہے شبنم حقیقت۔ تمہیں علم ہے نا اکبر کتنا بڑا شہنشاہ تھا۔ پورے برصغیر پر اس کی حکومت تھی اور اس کے بیٹے شہزادہ سلیم نے ایک کنیز کو چن لیا تھا محبت کی خاطر۔ آفاق بھائی کسی شہزادے سے کم تو نہیں ہیں۔ پھر یہ نیا دور ہے۔ تم ان کی کنیز بھی نہیں ہو۔"

"ٹھیک ہے برجیس۔ اگر انہیں میرا اتنا ہی خیال ہے تو بتا دیں بڑے سرکار کو۔ مانگ لیں مجھے میرے بابا سے۔ میں جانتی ہوں ان کے خواب آنکھوں میں ضرور بس گئے ہیں۔ اُن کو کھو کر چین سے میں بھی نہ جی سکوں گی۔ لیکن میں ان کی راہ کا ایسا خوب صورت سنگ کبھی نہیں بنوں گی جس سے چند لمحے دل بہلا کر ٹھوکر مار کر وہ چلے جائیں۔ اس دنیا میں مجھے عزت اور وقار سے زیادہ کچھ بھی عزیز نہیں۔ جو ایک شریف اور غیور لڑکی کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔"

"اتنی خائف کیوں ہو؟"

"اس زمانے کے دستور ایسے ہیں۔ یہ دولت والے لوگ غریب کی عزت کو عزت سمجھتے ہی نہیں ہیں۔"

"تم تو یہ باتیں ایسے کر رہی ہو کہ تمہیں آفاق بھائی سے زبردست دھوکا ملا ہو گویا۔"

"نہیں برجیس! دھوکا تو دور کی بات ہے۔ میں کچھ حقیقت پسند ہوں۔ چاہنے کو تو دل بہت کچھ چاہتا ہے لیکن میں وہی لوں گی جس کے لائق ہوں۔ اتنا ہی جتنا میرے چھوٹے سے دامن میں با آسانی آ سکے۔"

"بی بی! اگر وہ تمہارے دل میں سہولت کے ساتھ سما گئے ہیں تو دامن میں بھی سما ہی جائیں گے۔ تم سے پناہ مانگ رہی ہوں میں۔ ابھی میرے سامنے تم نے اقرار کیا انہیں دل دے دینے کا۔ دل میں بسا لینے کا اور ابھی ابھی حقیقت پسند بن بیٹھیں۔ زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہارے دل میں جھانک لینے کا ادراک رکھتی ہوں۔ بولو جھوٹ کہہ رہی ہوں میں۔"

"برجیس مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے۔ محبت کر لینا بہت آسان ہے۔ محبت نبھانا بے حد مشکل۔ کیا خبر اس راہ پر وہ کہاں تک ساتھ دیں۔ برجیس! اس دنیا کے رسم و رواج بے حد عجیب ہیں۔ میرے بابا کو خبر ہو جائے تو وہ بے چارہ بڑے سرکار بلکہ خود چھوٹے سرکار کی مروت میں اُن کے رعب میں خاموش ہی رہ جائے شاید لیکن بڑے سرکار کو علم ہو جائے تو وہ چھوٹے سرکار کو ایک پل بھی یہاں رکنے نہ دیں۔"

"تم اپنی سناؤ۔ تم اس راہ پر کہاں تک چل سکو گی۔"

"کیوں مذاق کر رہی ہو برجیس۔ یہ پاگل دل تو شاید عمر بھر اسی راہ پر چلنے پر آمادہ رکھے۔ راہ کے کانٹوں کی پروا کیے بغیر۔ آج سے ایک ماہ قبل میں نے تو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا بھول کر بھی نہ سوچا تھا کہ یہ سب کچھ میری زندگی میں ہو گا برجیس۔ جب دل و جان اپنے نہ رہیں تو کیا ہوتا ہے۔ وہ۔۔۔ وہ میری روح میں بس گئے ہیں۔ میرے دل میں سما گئے ہیں۔ میں نے خود کو دھوکا دینے کی کوشش کی۔ دل کے فیصلوں سے ٹکرانا چاہا لیکن ہار گئی۔ جانتی ہوں اُن کو پانے کی خواہش انتہائے دیوانگی ہے۔ لیکن

میرے دل کو آرزو کرنے سے کون باز رکھے۔ مجھے خبر ہے وہ سیزن ختم ہوتے ہی چلے جائیں گے۔ نئی دنیا میں کھو کر مجھے بھول جائیں گے لیکن میں انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گی۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔"

گریہ کے سبب وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

برجیس نے اس کے آنسو پونچھ لیے۔ آفاق احمد کا جی چاہا وہ ستارہ آنکھوں سے ٹوٹ کر گرنے والے موتی ضرور دیکھ لیں۔ وہ آگے بڑھے۔ اور دوسرے پل اُن دونوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ دونوں چونک اٹھیں۔ شبنم نے آنکھیں دوپٹے کے آنچل سے رگڑ ڈالیں۔

"برجیس۔۔۔!" انہوں نے ہولے سے پکارا۔

"برجیس! اب جبکہ آپ ہم دونوں کی حالتِ زار کی آشنا بن گئی ہیں۔ آپ پلیز اس دیوانی لڑکی کو سمجھا دیں۔ ہم ازل سے ابد تک اس کے ہی رہیں گے۔ ہماری نگاہِ انتخاب نے سینکڑوں در چھوڑ کر اس کا در آڈھونڈا ہے۔ ہمارا کشکولِ اقرار سے بھر دیں۔ ہمیں بہاروں بھری زندگی کا پیام مل جائے گا۔"

"آپ نے مجھے بہن جیسے مقدس رشتے سے نوازا تو ایک حق میرا بھی بنتا ہے۔ آپ پر میں کچھ کہوں اور آپ مانیں۔"

"ہاں، ہاں ضرور کہیں ہم بھائی ہونے کے ناتے ضرور مانیں گے۔"

"تو وعدہ کریں آپ شبنم کو اپنی زندگی میں شامل کریں گے شریکِ حیات کی صورت میں۔"

"آپ کیا سمجھیں؟ شادی اور محبت دو جدا چیزیں ہیں۔ باخدا ہم نے شبنم کو کسی وقتی محبت کا فریب نہیں دیا۔ ہم اسے اپنا جیون ساتھی ہی بنانا چاہتے ہیں۔"

شبنم کی ستارہ آنکھیں ایک بار پھر جھلملانے لگیں۔ مسکراتے لبوں اور جھلملاتی آنکھوں سمیت وہ آفاق احمد کے دل میں اُترتی چلی گئی۔

"اللہ آفاق بھائی آپ تو سچ مچ بہت اچھے ہیں۔ ہماری شبنم بی تو بس یونہی ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔"

"ہماری بہن ہونے کے ناتے۔ ہماری محبت کا یقین آپ انہیں دلائیں۔ برجیس باخدا ہم جب شبنم کے حضور حاضر ہوتے ہیں تو اپنی خاندانیت، اپنی دولت، جاگیردار، سوشل بیک گراؤنڈ، اپنی تعلیم، اونچا رکھ رکھاؤ سب پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ ہم یہاں صرف اور صرف ایک انسان ہوتے ہیں۔ آدم کی اولاد، جسے محبت کا اعلیٰ وارفع جذبہ ہی اس زمین پر کھینچ لایا تھا۔ اس پگلی کو ہم پر ہر دم شک ہی رہتا ہے۔"

"جو آج کے بعد کبھی نہیں ہوگا کیوں شبنم؟ ٹھیک ہے نا۔" برجیس نے کہا تو شبنم ایک بار پھر مسکرا اٹھی۔

"یہ حدِ فاصل کیسی ہے شبنم؟ کیا ہم تمہارے اپنے آفاق نہیں ہیں۔"

"بے شک ہیں۔ لیکن کچھ شرعی اور قانونی اصول اور پابندیاں بھی ہیں۔"

"اف کیسی پابندیاں۔ دو دل ایک دوسرے کو اپنا جان لیں تو کسی اصول کے محتاج نہیں رہتے۔ محبت کے اپنے ہی قانون، اپنے ہی اصول ہوتے ہیں۔"

"اونہوں۔ مذہب کے قانون کی اہمیت ہر چیز سے زیادہ ہے۔"

''تو آؤ آج ہی مذہبی اور شرعی طور پر ہم ایک ہو جائیں۔ انتظار کس بات کا ہے؟''

''لیکن چھوٹے سرکار۔۔۔ میرے بابا۔۔۔ اور بڑے سرکار اُن کو خبر کیے بغیر ان کی رضامندی کے بغیر یہ سب کس طرح ہو سکتا ہے۔''

''اوہ شبنم۔۔۔ ایسا سوچو بھی مت۔ بابا حضور یا امداد حسین کو خبر ہو جائے تو وہ ایک پل ہمیں یہاں رکنے بھی نہ دیں۔ شبنم تمہیں ہماری خوشی مطلوب ہے یا زمانے والوں کی۔ چلو ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ فی الحال اس شادی کو خفیہ رکھیں گے۔ ہم امداد حسین سے کہہ کر تمہیں اگلے سال کالج میں داخلہ دلوا دیں گے۔ اور جب ہم اعلیٰ تعلیم کے بعد لندن سے لوٹیں گے تو بابا حضور پر آشکار کر کے اپنی دلہن کے روپ میں ریاض کا محل میں لے آئیں گے۔''

''چھوٹے سرکار۔۔۔!'' شبنم کی آواز لرز سی گئی۔

''شبنم! ہم جو تمہارے ساتھ ہیں۔ یقین کرو ہم اپنی محبت کے معاملے میں مخلص ہیں۔ ہم کسی موڑ پر تمہارا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ وعدہ ہے۔''

''چھوٹے سرکار۔ ماں اور بابا مجھ پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ انہیں اتنا بڑا دھوکا دوں۔ اتنا بڑا فریب کروں ان کے ساتھ۔''

''شبنم یہ تو امداد حسین کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ ہوگا۔ اُسے اس فیصلے کا کبھی دکھ نہ ہوگا۔ اور بابا حضور بعد میں کیا مخالفت کریں گے۔ بابا حضور کو ہم سب سے بے حد پیار ہے۔ وہ ہمارا فیصلہ ہر حال میں قبول کریں گے۔''

''تو آپ ابھی انہیں آگاہ کر دیں نا۔'' شبنم نے معصومیت سے کہا۔ آفاق احمد ہنس پڑے۔

''نہیں شبنم ابھی ایسا کرنے کی وہ اجازت نہیں دیں گے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ابھی ہمیں بہت ساری تعلیم حاصل کرنا ہے۔''

❁❁❁❁

''عارف! وہ لڑکی بیک وقت ہماری محبت بھی ہے اور چیلنج بھی ہے۔ تمہارے بتائے ہوئے سارے گُر ناکام ہی رہے ہم اس کا قرب حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ عارف ہم اُسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جو ہماری اولین آرزو ہے۔ کہیں ہماری زندگی کی سب سے بڑی شکست نہ بن جائے۔''

''ٹھیک ہے یار اگر وہ کورٹ میرج پر راضی ہے تو لے آؤ۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔ کیا یاد کرے گی وہ تمہاری محبوبۂ دل نواز۔ چلو جو خدمت ہم تمہاری کر سکتے ہیں کر لیں۔''

''یار اگر وہ جاہل لڑکی ہوتی نا تو ہم اُسے نکاح کا دھوکا بھی دے لیتے۔ لیکن خدا کی قسم وہ لڑکی جانے کیا چیز ہے۔ باقر پور کے مڈل اسکول سے اس نے امتحان پاس کیا ہے لیکن کسی انٹر پاس لڑکی سے کم ہوشیار نہیں۔ غضب کی سمجھدار، بلا کی ذہین۔'' عارف بہزاد نے قہقہہ لگایا۔

''لیکن محبت کے معاملے میں جو دھوکا کھا رہی ہے وہ کیا ہوا۔ کہاں گئی اس کی سمجھ داری اور ذہانت؟''

''نہیں نہیں۔ عارف بہزاد ہماری محبت کو تم دھوکا نہیں کہہ سکتے۔ محبت سچ مچ ہمیں اُسی سے ہے۔ بس اس کی بے جا ضد اور انا ہمارے لیے چیلنج بن گئی ہے۔ اور ہم اپنی محبت کے اس غرور کو شکست دینا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہم بہر حال ایک مرد ہیں۔ اور ایک عورت کی ضد کم از کم ہم جیسے مرد کے آگے زیادہ دیر چل بھی نہیں سکتی۔ ویسے عارف ایک بات کہوں وہ لڑکی خدا کی قسم غضب کی گریس فل ہے۔ سامنے ہو تو کسی غلط حرکت کا خیال تک نہیں آتا۔'' آفاق واقعی اس سے متاثر تھے۔

''یوں کہو میرے یار! وہ تمہیں حد درجہ متاثر کر چکی ہے۔ میرا خیال ہے ساری دنیا چھوڑ کر اسی کے ہو رہو۔''

''کارزارِ حیات میں آفاق احمد اتنا نکما اور فارغ البال نہیں ہے۔ بس ہمیں تو تم وہ پروگرام بتاؤ جس پر عمل پیرا ہو کر کم از کم ہم دل کی خلش کے ہاتھوں نجات پا سکیں۔''

''حاضر سرکار یہ بندہ عارف بہزاد اور ہے بھی کس خدمت کی خاطر۔'' دونوں دوست قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

❁❁❁❁

برجیس کے گھر جانے کا کہہ کر شبنم صبح دم ہی گھر سے نکل آئی۔ اور اس کے جانے کے پندرہ بیس منٹ بعد حسبِ معمول آفاق احمد نے بھی جیپ گیٹ سے باہر نکالی۔

شاہراہ میں مل جانے والی سولنگ پر شبنم کافی فاصلہ طے کر چکی تھی۔ خوف زدہ بھی تھی، پریشان بھی، ہراساں بھی۔ لیکن ولولہ بھی موجود تھا۔ آفاق کو جیت لینے کی خوشی بھی نشے کی طرح اعصاب پر سوار تھی۔ محبت نے سود و زیاں کے سارے احساس دل سے نکال دیے تھے۔ اُس نے اپنا آپ آفاق احمد کو سونپ دیا تھا اب گھبراہٹ کیسی۔ آفاق نے ڈھیروں ڈھیر وعدوں کی زنجیریں اس کے گرد لپیٹ دی تھیں۔ بڑا اعتماد تھا شبنم کو۔ بے حد مان کے ساتھ وہ یہ بندھن باندھ رہی تھی۔ آفاق ٹھیک کہتے تھے لیکن بعد میں سب خود بخود راضی ہو جائیں گے۔

آفاق کے سنگ اتنا طویل سفر کرتے ہوئے وہ ذرّہ بھر نہ گھبرائی۔ جہانگیر نگر میں عارف بہزاد کے گھر تک پہنچنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے ہی صرف ہوئے۔ عارف نے انیکسی اُن کے لیے سجا سنوار دی تھی۔ خود عارف بھی شبنم کو دیکھ کر لمحہ بھر تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اس کے تصور میں کوئی عام سی دیہاتی لڑکی تھی۔ لیکن یہاں تو معاملہ اور تھا۔ شبنم کا حسن لاکھوں میں ایک تھا۔ اور عارف، شبنم کو آفاق احمد کے کسی پشتینی ملازم کی بیٹی ماننے سے بھی انکاری تھا۔

دونوں شبنم کو لے کر کورٹ چلے گئے۔ تین چار گھنٹوں کی کارروائی کے بعد شبنم نے اپنے جملہ حقوق شرعی اور قانونی طور پر آفاق احمد بخاری ولد ریاض احمد بخاری کے نام کر دیے تھے۔ واپسی میں وہ بازار چلے آئے۔ شبنم کے لیے عروسی جوڑا خریدا، نورتن کا ایک خوب صورت جڑاؤ سیٹ اور ڈھیروں ڈھیر دوسری چیزیں۔ عارف نے اپنی منگیتر سیما کو اس خوش گوار حادثے کی خبر دے رکھی تھی۔ وہ خبر سنتے ہی لپک کر آئی اس نے شبنم کو سجا سنوار کر آفاق احمد کی خلوتوں میں بھیج دیا۔

ان لمحوں میں نہ دنیا کا خوف تھا نہ سماج کا۔ بس ایک ہی خیال حاوی تھا کہ آفاق سچ مچ ہی اُس کے

دل و جان کے مالک ہو گئے ہیں اور اب سدا کے لیے اُس کے ہی ہیں۔

❁❁❁❁

سرِ شام ہی وہ باقر پور لوٹ آئے۔ کسی کو شک تک نہ گزرا۔ آفاق ایک مکمل نئے جہان سے آشنا ہو جانے پر بے انتہا مسرور تھے۔ خوشی شبنم کو بھی کم نہ تھی کہ وہ بہر حال ایک لڑکی تھی جسے خواب دیکھنا، خوابوں میں کھو جانا اچھا لگتا ہے۔ پر وہ تو خوش نصیب تھی اس نے حقیقت پالی تھی۔ حسن نکھر کر اور بھی جاذبِ نظر اور بھی پرکشش ہو گیا تھا۔

دسمبر کے آخری عشرے کی کڑکڑاتی سردی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جب باقر پور کے آسمان پر مہیب بادلوں نے آڈیرا جمایا۔ اور بارانی موسم نے سارا نظامِ زندگی معطل کر دیا۔ آفاق سارا دن حویلی میں موجود رہتے۔ شبنم کا جو وقت پڑھائی کے بہانے اُن کے ساتھ گزرتا باقی وقت وہ قسم قسم کے کھانے تیار کرنے میں لگا دیتی۔ ان ہی دنوں اختر شدید سردی کے باعث بخار میں مبتلا ہو گئی۔ امداد حسین کو باہر کے کاموں سے فرصت نہ ملتی۔ تب آفاق کی ساری ذمہ داریاں خود بخود شبنم کے حصے میں آ گئیں۔ آفاق کے کمرے میں شبنم کیا آتی۔ بہاروں کے سارے قافلے گویا ادھر ہی اُتر آتے۔ سرِ شام ہی کوئلے کی انگیٹھی دہکا کر وہ کمرے میں لے آتی۔ نرم گرم ماحول میں آفاق کی پیار لنڈھاتی آنکھوں کے سحر میں کھو کر وہ ساری دنیا بھول جاتی۔

قربتوں کے جادو سے بھرپور کئی گھڑیاں سرعت سے بیت جاتیں۔ ہر گزرتا دن شبنم کے دل میں آفاق کی محبت کے احساس کو اور بھی تقویت دیے جا رہا تھا۔ وہ دن بھر آفاق کے کاموں میں کھوئی رہتی۔ انہیں ناشتا دینا، ان کا کمرا صاف کرنا، ان کے کپڑے دھونا، سلیقے سے استری کرنا، الماری میں رکھنا اور رات کے تنہا لمحات میں ان کے خوابوں میں کھوئے کھوئے نیند کی وادیوں کا سفر کرنا۔

برجیس ہر معاملے میں شبنم کی رازدار دوست تھی۔ لیکن شبنم نے آفاق کے حکم کے مطابق اس اہم خبر کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔

دسمبر ختم ہوا۔ نیا سال آ گیا اور نئے سال کی آمد کے ساتھ ریاض احمد بخاری نے آفاق کو واپس بلوا بھیجا۔ وہ دن شبنم کی زندگی کا اداس ترین دن تھا۔ در و دیوار سے لپٹ کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ صبح دم وہ آفاق کے کمرے میں آئی تو انہیں دیکھتے ہی آنسو لپک جھپک آنکھوں میں آ گئے۔

''شبنم میرا انتظار کرنا۔ میں لوٹ آؤں گا۔ تمہیں اپنانے کے لیے۔ تم میری ہو، صرف میری۔''

'لیکن کب تک۔ آخر انتظار کی مدت کا پتا بھی تو ہو۔''

''چاہنے والے مدت کا نہیں پوچھا کرتے۔ اگر میں کہہ دوں مرتے دم تک تو۔۔۔ تو کیا تم انتظار نہ کرو گی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرائے۔

''انتظار امید کے ساتھ سہل ہوتا ہے چھوٹے سرکار۔ امید کا دامن میرے ہاتھ میں تھما دیجیے۔ میں واقعی مرتے دم تک انتظار کر لوں گی۔''

''پگلی، ہم نے یہ بندھن خدا کو حاضر و ناظر جان کر باندھا ہے۔ بس اس وعدے کا بھی وہی گواہ ہے۔ اور ہاں دیکھو شبنم کسی سے نکاح وغیرہ کا ذکر تک نہیں کرنا۔ ورنہ بہت ساری مصیبتیں بھی کھڑی

ہوسکتی ہیں۔ میں یہاں سے جاتے ہی لندن چلا جاؤں گا۔ کوئی تمہاری بات کی صداقت کو تسلیم نہ کرے گا۔ میری آمد پر خود بخود ہی یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور ہاں یہ تو بتاؤ لندن سے تمہارے لیے کیا لاؤں۔''

''میرا سب سے بڑا تحفہ آپ ہیں چھوٹے سرکار۔ بس وہاں جا کر مجھے نہ بھول جائیں۔ یہ سب سے بڑا احسان ہوگا۔ اور میں مانگوں بھی کیا آپ سے۔''

''تم بہت معصوم ہو شبنم۔ ہم نے کہہ دیا ہم تمہارے ہیں۔ تمہیں بھلا کر جی ہی نہیں سکتے۔ اور ہاں دیکھو اس سال میٹرک کا امتحان دینا اور پھر جوہر آباد کے کالج میں داخلہ لے لینا۔ جب ہم تمہاری ملاقات اپنے بابا حضور سے کرائیں تو انہیں کسی قسم کی مایوسی نہ ہو ٹھیک ہے نا۔''

شبنم نے روتی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

❁❁❁❁

''ممی۔۔۔!''

''ہوں۔۔۔ کیا بات ہے۔''

بیگم ریاض احمد بخاری بڑے سارے ہال کے وسط میں دیوان پر بیٹھی کسی جابر حاکم سے کم نہ لگ رہی تھیں۔

آفاق سخت گومگوں کے عالم میں تھے۔ ایسے ہی کئی بار وہ اپنی والدہ کو مخاطب کر چکے تھے۔ لیکن ہر بار کچھ کہنے کی جرأت عین وقت پر جواب دے جاتی۔

''ممی۔۔۔! ہم آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

''تو کہہ ہی ڈالو بیٹا۔ میں جانتی ہوں تم کئی بار تمہید باندھ چکے ہو۔''

''ممی! آپ اختر کو جانتی ہیں نا۔''

''اپنے جان نثار ملازموں کو ہر آقا ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ کیوں کیا ہوا اسے۔''

''ہوا کچھ نہیں ممی۔ ہم دراصل اس کی بیٹی کی بات کرنا چاہ رہے تھے۔''

''اس کی بیٹی کی بات تمہارے بابا حضور بھی اکثر کیا کرتے ہیں۔ سنا ہے بے حد حسین لڑکی ہے۔''

''ممی صرف حسین ہی نہیں۔ اعلیٰ کردار، اعلیٰ سیرت کی مالک بھی، وہ ہیرا ہے ممی ہیرا۔''

آفاق ابھی یہ الفاظ ادا کر ہی رہے تھے کہ بیگم ریاض احمد بخاری ایک دم چونک کر سیدھی ہوئیں۔

''کیا مطلب۔۔۔؟''

''ممی۔۔۔!'' آفاق کی نظریں جھک گئیں۔

''ممی۔۔۔! ہم اُسے اپنا شریکِ حیات بنانا چاہتے ہیں۔ ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ آپ بابا حضور سے کہہ کر اس سے ہماری منگنی کرا دیں۔''

''آفاق۔۔۔!'' ایک گونج ہال کے اونچے در و دیوار سے ٹکرا گئی۔

''تم محبت کرنے لگے ہو ایک دو کوڑی کی نٹنی کی بیٹی سے۔ اُسے ہماری بہو بنانا چاہتے ہو۔ کتنی گھٹیا بات کی تم نے۔ کیا اسی لیے ہم نے تمہیں باقر پور بھیجا تھا۔'' ممی کے لہجے میں قہر تھا جلال تھا۔

''ممی۔۔۔! محبت امیر اور غریب کا فرق نہیں دیکھتی۔ ہم اس کے بنا مر جائیں گے۔''

''آفاق۔۔۔! ہوش میں رہ کر بات کرو تم اپنی ماں سے مخاطب ہو۔ تم جیسے نوجوان زندگی کے مختلف ادوار میں محبت کئی حسین لڑکیوں سے کر لیتے ہیں۔ لیکن شادی وہیں ہوتی ہے جہاں والدین چاہتے ہیں۔ جذباتی ہو کر سوچ رہے ہو۔ مت بھولو کہ ابھی تم زندگی کے سفر کے آغاز میں ہو۔ امداد حسین کی بیٹی بے شک حسین ہوگی۔ لیکن تمہاری راہ میں اس سے بھی حسین چہرے آئیں گے۔ کیا ہر ایک سے شادی کا فیصلہ کرتے رہو گے۔ تم اگر اُسے پسند کر بیٹھے تو مجھے اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اب وہاں سے آنے کے بعد اُسے بھول جاؤ۔ تمہارے بابا حضور کو اس کی خبر ہوگئی تو وہ تمہیں جائیداد سے عاق کرنے بلکہ گولی مار دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہ بات آج تم نے کہی ہے۔ آئندہ کبھی ہمارے سامنے بھی اس کا ذکر نہ کرنا۔ ہم امداد حسین کو بلوا کر اُس سے باز پرس کریں گے کہ اس نے جوان بیٹی کو اتنی آزادی دے رکھی تھی کہ وہ آسیب بن کر ہمارے ہونہار بیٹے پر چھا گئی۔''

''نہیں ممی! پلیز آپ کسی سے بھی ذکر نہ کریں۔ اس بے چارے کو بھلا کیا خبر۔''

''اچھا وہ حرافہ تمہیں محبت کے کھیل میں الجھاتی رہی اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔ میں ان غریب لوگوں کی ذہنیت سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ صرف مال و دولت کے لالچ میں وہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ خیر تم نے جو کچھ اس پر لٹایا اس کا کوئی ملال نہیں۔ صرف اتنا چاہتے ہیں ہم کہ تم اسے خیالِ باطل سمجھ کر بھول جاؤ۔''

آفاق تڑپ سے گئے۔ سوائے ایک انگوٹھی کے جو زبردستی انہوں نے شبنم کی انگلی میں ڈال دی تھی۔ اسے تو وہ بس انتظار کی اذیت ناکیاں ہی تحفے میں دے کر آئے تھے۔ انہیں ممی کی باتوں نے بے حد دکھ دیا۔ لیکن خاموش رہے۔ احترام جو واجب تھا اُن پر۔

وہ باقر پور سے دل میں بڑی امیدیں لے کر چلے تھے۔ ممی نے انہیں لاڈ پیار سے بھرپور زندگی دی تھی۔ یہ بات کیسے نہ مانیں گی۔ لیکن ان کے تیور انہوں نے ایک پل میں پہچان لیے تھے۔ وہ شبنم کا ذکر سننے کی روادار نہ تھیں۔ بابا حضور کے سامنے تو ذکر کرنے کی ویسے بھی مجال نہ تھی۔ آفاق نے کسی کو حقیقت سے آگاہ کیے بغیر رختِ سفر باندھا اور لندن کے لیے پرواز کر گئے۔

❁❁❁❁

جب سے آفاق باقر پور سے گئے تھے۔ نظاروں کا حسن ہی کھو گیا تھا۔ شبنم کی زندگی میں کوئی رونق ہی نہ رہی تھی۔ دن بھر وہ اپنے کمرے میں بند رہتی۔ اختر کے ہزار بار اصرار کرنے پر بمشکل وہ کھانا کھاتی۔ برجیس کئی بار اُسے اپنے گھر آنے کا کہہ گئی۔ میڈم انجلا نے بلا بھیجا۔ لیکن وہ نڈھال اور مضمحل سی گھڑی بنی بستر پر پڑی آفاق کی یادوں میں کھوئی رہتی۔ کبھی یوں لگتا کہ انتظار رنگ لائے گا اور آفاق بیابانِ دہل اُسے لینے یہاں ضرور آئیں گے۔ کبھی بے وفائی اور دھوکے کی تاریکیاں چاروں طرف چھا جاتیں اور شبنم کو کوئی راہ نظر نہ آتی جس پر چل کر وہ زندگی کے سفر میں آگے بڑھتی رہتی۔

بڑے دنوں سے طبیعت اداس تھی۔ پریشان تھی۔ اب ساتھ ہی گرانی بھی رہنے لگی۔ سر چکراتا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا، صبح اٹھتے ہی طبیعت مالش کرنے لگتی، قے ہو جاتی، طبیعت اور بھی بگڑتی چلی گئی، بستر سے اٹھنا ہی محال ہو گیا۔ شبنم کے لیے یہ صورت حال بے حد عجیب تھی۔ کئی دن

یونہی گزر گئے۔ امداد حسین شہر سے اس کی کیفیت بتا کر دوا لے آیا۔ لیکن ایک دن وہ نل سے منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے صحن میں آئی اور صحن کے وسط میں ہی بے ہوش ہو کر گر گئی تو اختر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے بھاگ کر امداد حسین کو بلایا۔ دونوں نے مل کر اسے اندر کمرے میں بستر پہ لا ڈالا۔ شبنم کا زرد چہرہ، کمزور اور نڈھال وجود اُن دونوں کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ امداد حسین فوراً ڈاکٹر کی طرف گیا۔ گھنٹے بعد جب وہ ڈاکٹر کو لے کر واپس آیا تو شبنم ہوش میں تھی۔ ڈاکٹر نے تفصیلی معائنہ کیا۔ دوائیں دیں اور ساتھ ہی کچھ ہدایات بھی کیں۔

اختر نے فوراً پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب میری بٹیا ٹھیک تو ہو جائے گی نا۔''

''ہاں بہن۔ یہ تو قدرتی امر ہے۔ وقتِ مقررہ کے بعد طبیعت خود ہی سنبھل جائے گی۔ آپ غذا اور دوا کا خیال رکھیں۔ زچہ و بچہ دونوں کا صحت مند ہونا لازمی ہوتا ہے۔''

''یہ کیا۔۔۔؟'' دھڑام۔۔۔ دھڑام۔۔۔ دھڑام۔۔۔ کئی پتھریلے پہاڑ اختر اور امداد حسین پر آ گرے۔ اختر کی نگاہ میں سب کچھ گھوم گیا۔ دونوں نے گھبرا کر ڈاکٹر کو اور پھر ساتھ کھڑے کمپاؤڈر کو دیکھا جو باقر پور کا ہی رہنے والا تھا۔ جو امداد حسین سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اور جس نے یہ خبر سن کر پہلے حیرانی کا مظاہرہ کیا اور اب اس کے لبوں پر بڑی عجیب مسکراہٹ تھی۔ تمسخرانہ مسکراہٹ۔

یہ الفاظ شبنم نے بھی سنے تھے۔ اور یہ سن کر جسم و جاں کا رشتہ ٹوٹتا محسوس ہوا تھا۔ زمین و آسمان گھوم گئے تھے۔ یوں لگا گویا کسی نے عرش کی بلندی سے تحت الثریٰ میں لا پھینکا تھا۔

ڈاکٹر چلا گیا۔ لیکن امداد حسین کے چھوٹے سے گھر پر قیامت برپا کر گیا۔ اختر دم بخود تھی۔ شبنم سکتے کے عالم میں، امداد حسین کو چاروں طرف سے جوابدہی کے خوف نے گھیر رکھا تھا۔ تینوں ایک دوسرے سے نظریں ملانے سے قاصر تھے۔ امداد حسین صحن میں برگد کے درخت تلے مردوں کی طرح پڑا تھا۔ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اختر کمرے میں تھی اور شبنم بستر پر پڑی اپنی ناکام و نامراد زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شام ہوئی، رات اُتر آئی، گھر کا چولہا ٹھنڈا ہی رہا۔ بھوک پیاس کے احساس مٹ کر رہ گئے تھے۔ ایک دوسرے سے نظریں چرائے، آخر کب تک وقت گزرتا، اختر باہر امداد حسین کے پاس گئی۔

''اختر۔۔۔!'' امداد حسین نے اپنی سرخ آنکھیں بمشکل اٹھائیں۔ ''دعا کرو۔۔۔ جواب دہی کے عمل سے پہلے ہی مجھے موت آ جائے۔ میں کیا کہوں گا۔۔۔ کیا جواب دوں گا کہ میں اس ذمہ داری کا اہل نہ تھا۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔ یہ کیا ہوا۔۔۔ اختر۔۔۔! کاش! مجھے یہ سننے سے قبل ہی موت آ گئی ہوتی۔''

اختر نے الٹا سیدھا کھانا بنایا اور شبنم کے کمرے میں آئی۔

''بیٹا۔۔۔ کھانا کھا لو۔۔۔ کب تک بھوکی رہو گی۔''

شبنم شرم سے کٹ کر رہ گئی۔ نظریں ملانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ خوف زدہ سی وہ اختر کی طرف دیکھنے کی جرأت ہی نہ کر سکی۔

اختر کا سلوک یوں تھا گویا یہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔ بڑی مشکل سے اس نے پکارا۔

''اماں۔۔۔!اماں۔۔۔!''شبنم رونے لگی۔

''مجھے مار ڈالو۔۔۔ مجھے کوسو۔۔۔ لعن طعن کرو۔۔۔ مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ۔ اماں پر یوں خاموش ہو جانے کی سزا نہ دو۔ تمہاری خاموشی مجھے لمحے لمحے کی موت سے آشنا کر رہی ہے۔''

وہ سسکنے لگی۔ پراسرار خاموشی نے اسے دہلا دیا تھا۔

اختر نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بلکہ اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلانے لگی۔ یہ سزا بہت بڑی تھی اس سانحے سے بھی بڑی جو ابھی جسم و جاں پر گزرا تھا۔

کھانا کیسے کھایا جاتا۔ نوالہ حلق سے اترنے کا نام بھی نہ لیتا۔ اختر چلی گئی۔ شبنم نے شکستگی کے احساس کے ساتھ سر تکیے پر ڈال دیا۔ آنکھوں کے ویران جزیرے کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے اور بھی ویران ہو چکے تھے۔

''آپ کہاں ہوں گے چھوٹے سرکار۔۔۔ کیا خبر کہاں۔۔۔ اس بھرے جہان میں، میں اپنا دکھ کسے سناؤں۔۔۔ اپنی کہانی کسے سناؤں۔۔۔ کون مجھ پر یقین کرے گا۔۔۔ کون میرا گواہ ہوگا۔۔۔ کب علم تھا مجھے ایک چھوٹی سی خوشی یہ دن بھی دکھائے گی۔ اُف۔۔۔ یہ بات کب تک چھپی رہے گی۔۔۔ ایک دن یہ خبر پورے باقر پور میں پھیل جائے گی۔ میرے غریب ماں باپ غیرت کے مارے مر جائیں گے۔ میں اپنے بابا کو منہ نہیں دکھا سکتی چھوٹے سرکار۔ میں ان کے سامنے آنے سے پہلے ہی مر جاؤں گی۔ میں یہ دنیا چھوڑ دوں گی۔ میرے مرنے پر انہیں خبر ہو بھی جائے تو کچھ نہیں۔ بس میں جیتے جی ان سے نظریں نہیں ملاؤں گی۔ یہ میرا عہد ہے۔''

اس نے لیمپ جلا دیا اور زرد روشنی میں امداد حسین کے نام خط لکھنے لگی۔ ایک خط اس نے بغیر القاب و آداب کے آفاق احمد کے نام بھی لکھ دیا کہ اگر وہ کبھی وعدہ ایفائی کرتے ہوئے اسے لینے یہاں آ جائیں تو اسے بے وفا نہ جان لیں۔ اور اس کے بعد اُس نے چپکے سے رات کی تاریکی میں اپنا مسکن چھوڑ دیا۔ پگڈنڈیاں اور راستے ویران تھے۔ آخر راتوں کا چاند اپنی روشنی سے کائنات کو منور کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ اور شبنم موت کی وادیوں کی طرف تیزی سے چلی جا رہی تھی۔

❁❁❁❁

''انکل رضی۔۔۔!''

پچھلی سیٹ پر ان کے ساتھ براجمان شہریار مسلسل اُن کے کان کھائے جا رہے تھے۔

''انکل رضی۔۔۔ کیا سو گئے آپ؟''محسن رضا جو ابھی کچھ دیر قبل واقعی نیند کی دیوی کی نرم آغوش میں تھے جاگ اٹھے۔

''کیا بات ہے بیٹے۔ تھوڑی دیر تو انکل کو آرام کر لینے دیا ہوتا۔''

''انکل آپ سو گئے تھے نا ہمیں اردگرد کا بھیانک ماحول ڈرانے لگا۔ یوں لگا کئی چڑیلیں اور بدروحیں گاڑی کا راستہ روک لیں گی۔''

محسن رضا جو ابھی نیند کا خمار محسوس کر رہے تھے، ہنس پڑے۔

''ماں کی طرح تم بھی خاصے وہمی ثابت ہوئے ہو برخوردار۔ ہماری بچی کو دیکھو کیسی بہادر بنی شیر دل کے ساتھ آگے بیٹھی ہے۔''

تبھی سونیا نے مڑ کر تفاخر کے ساتھ شہریار کو دیکھا۔ جو سدا سے ڈرپوک اور بزدل تھے۔

''انکل! آپ شکار پر ساتھ لائے بھی تو ایسے بہادروں کو۔'' سونیا نے چھیڑا۔

''ہاں، ہاں انکل تو بس آپ کو ہی ساتھ لاتے کہ شیر کو دیکھتے ہی بندوق ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔'' شہریار نے سونیا کو جواباً بزدلی کا طعنہ دیا۔

''ارے بے وقوف یوں کہو شیر کا نام سنتے ہی چھکے چھوٹ گئے۔ ویسے شیروں کو مارنا شیر دل کا کام ہوتا ہے۔'' شیر دل نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سینہ پھلایا۔

''ہٹو بڑے آئے شیر دل کہیں کے۔ میں تو ڈرنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ اور تم اسے سچ سمجھ بیٹھے۔ پچھلی گاڑی میں سالم و ثابت ہرن ہماری بہادری کے گواہ ہیں مسٹر شیر دل۔ تم تو بس سارا سارا وقت اُسی بارہ سنگھے کو تلاش کرنے کا بہانہ بنائے جیپ بھگاتے رہے۔''

''لڑائی جھگڑا بند۔ بہادری اور ہمت و جرأت کا تمغہ ہم انکل کے سوا کسی کو نہیں دے سکتے۔ آپ لوگ تو بس طفل مکتب سمجھئے خود کو اس معاملے میں۔'' سونیا نے بات ختم کرنا چاہی۔

''کیوں انکل ٹھیک کہا نا میں نے۔''

''نہیں لٹل گرل۔ ہمارے دونوں ہی بیٹے بہادر ہیں۔ اگلی مرتبہ یہ شکار کے لیے آئیں گے تو ہم گھر پر رہ کر ان کا انتظار کریں گے تب تم دیکھ لینا۔''

''جی ہاں مار لائیں گے دو چار جنگلی چوہے۔'' سونیا نے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا تو دونوں نے خوں خوار نظریں سونیا پر جما دیں۔ بلکہ شہریار نے تو ایک کرارا ہاتھ بھی محسن رضا کی موجودگی کا احساس کیے بغیر ہی جما دیا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تو سب نے چونک کر سڑک کی طرف دیکھا۔ سامنے ریلوے کراسنگ تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں اور کراسنگ کا پھاٹک بند تھا۔

''اف۔۔۔ اب جانے کتنی دیر یہاں رکنا پڑے گا۔ اور اگر یہ مال گاڑی ہوئی تو تب تو اللہ ہی حافظ ہے ہمارا۔'' سونیا تھکی ہوئی تھی۔

شہریار نے کھڑکی سے سر باہر نکالا۔ ان کی نظریں ریلوے لائن کے ساتھ سفر کرتی ریل گاڑی کا فاصلہ جانچنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اچانک وہ اپنی سیٹ سے اُچھلے۔

''انکل۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ کوئی بدروح۔۔۔ وہ دیکھیں۔'' محسن رضا کے ساتھ ساتھ سب نے شہریار کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ سفید لباس میں ملبوس کوئی سراپا سب کی نظروں کے سامنے تھا۔ اور سب نے اُس سائے کو تیزی سے ریلوے لائن کی طرف جاتے بھی دیکھا۔ قدم آگے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ محسن رضا چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر ایک دم انہوں نے گاڑی کا دروزہ کھولا اور جست لگا کر باہر نکلے۔ ان کی تقلید میں شیر دل نے بھی اسٹیئرنگ چھوڑا اور نیچے کود گیا۔ شہریار نے بھی قدم گاڑی سے

باہر رکھے۔

''تم یہیں رکو سونیا۔ باہر مت آنا۔''

لیکن خطرات سے کھیلنے کی شائق سونیا بھی باہر آ گئی۔ محسن رضا تیزی سے اس سائے کی سمت بڑھ رہے تھے۔

جو اب عین ریلوے لائن کے وسط میں تھا اور گاڑی بہت تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

وہ چیخے ''ہٹ جاؤ۔۔۔ گاڑی آ رہی ہے۔'' لیکن ساکت وجود میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔

گاڑی بے حد قریب آ گئی تھی۔ محسن رضا نے اور تیزی سے دوڑنا شروع کیا۔ لائن کے ساتھ بکھرے پتھر ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ شہریار اور شیر دل ان کے پیچھے تھے۔

''انکل جلدی کیجیے گاڑی بہت قریب آ گئی ہے۔'' سونیا چلائی۔ شیر دل اور تیزی سے دوڑے۔ اور محسن رضا کے پہنچنے سے قبل ریلوے لائن پر آ گئے۔

گاڑی عین سر پر آ گئی۔ محسن رضا بھی ریلوے لائن پر قدم رکھنا چاہ رہے تھے کہ شہریار نے انہیں کھینچ لیا۔ ریل گاڑی پوری رفتار سے گزر رہی تھی اور شیر دل کا پتا ہی نہ تھا۔

سونیا نے تو باقاعدہ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ گاڑی کے ڈبے گزرتے رہے۔ اور سب کے دل مٹھی میں بند رہے۔ وہ تینوں کچھ دیکھ ہی نہ سکے تھے کہ کیا ہوا تھا۔ کیونکہ گاڑی کے تیز جھٹکے سے محسن رضا اور شہریار دور جا گرے تھے اور سونیا چیخیں مارتی ہوئی ان کی طرف لپکی تھی۔

''انکل۔۔۔! شہریار بھائی۔۔۔ شیر دل کو دیکھیں۔ انہیں ڈھونڈیں۔ شہریار بھائی پلیز۔ اُف میرے خدا۔ نہیں نہیں وہ زندہ سلامت ہوں گے۔ ساری گڑبڑ آپ نے پیدا کی۔ آپ کو ہی وہ بدروح نظر آئی۔ آپ تو سدا کے وہمی ہیں۔ توہم پرست ہیں۔ انکل رضی۔۔۔ انکل۔۔۔ نکل۔۔۔'' سونیا بے ربط جملے بولتی۔ سنبھلے ہوئے محسن رضا سے لپٹ گئی۔ گاڑی گزر چکی تھی۔ شہریار ہمت کر کے آگے بڑھے۔ دوسری سمت انہیں دو انسانی وجود نظر آ ہی گئے۔

''سونی ادھر آؤ۔ انکل وہ یہاں موجود ہیں۔'' شہریار چلائے۔ سونی لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ محسن رضا کا سہارا لیتی ہوئی آگے بڑھی۔ نشیب کی طرف اترتے ہوئے اس نے یوں محسوس کیا۔ جیسے شیر دل نے نئی زندگی پالی ہو۔ شیر دل اوندھے منہ پتھروں پر پڑے تھے ان کے ہاتھوں نے مضبوطی سے اس انسانی وجود کو تھام رکھا تھا۔ جسے بچانے کے لیے وہ محسن رضا پر سبقت لے گئے تھے۔

''شیر دل۔۔۔ شیر دل۔۔'' محسن رضا نے زور سے پکارا۔ شہریار نے قریب آ کر انہیں سیدھا کیا۔

''میں ٹھیک ہوں شہریار تم اس کی خبر لو۔''

شہریار نے شیر دل سے کچھ آگے پڑے انسانی وجود کو دیکھا۔ جس کے دراز بال اس کی ساری پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔

شیر دل نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن گھٹنوں پر شاید زخم آ گئے تھے۔ کہنیاں بری طرح چھل گئی تھیں۔ چہرہ بھی زخمی تھا۔ محسن رضا نے انہیں تھام لیا۔

''انکل یہ۔۔۔ یہ تو۔۔۔ واقعی کوئی بدروح ہے۔'' شہریار کے ہاتھ وہیں رک گئے۔
''ممی کہتی ہیں چڑیلیں بے حد حسین ہوتی ہیں۔ انکل اس کا چہرہ دیکھیں نا۔''
''اسٹوپڈ بوائے۔ بے وقوف لڑکے وقت ضائع نہ کرو۔ اسے اٹھاؤ اور گاڑی کی طرف چلو۔''
سونیا نے شیر دل کا ہاتھ تھام لیا۔ اور شہریار نے وہ نسوانی وجود محسن رضا کے لہجے سے گھبرا کر کندھوں پر اٹھالیا۔ ریلوے پھاٹک پر دوسری جیپ بھی آ کر رک گئی تھی۔ طارق رضا اور شارق رضا دونوں پریشان سے کھڑے تھے۔ انہیں آتا دیکھ کر ان کی طرف لپکے۔
''کوئی شکار نظر آ گیا تھا کیا شیر دل؟'' طارق نے بے ساختہ پوچھا۔
''نہیں بچو۔۔۔ ایک انسان۔۔۔ جو نہ جانے کن حالات کا شکار ہو کر موت کے منہ میں جانے کو تیار تھا۔ ہم نے اُسے خدا کے حکم سے بچالیا۔'' محسن رضا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اُن دونوں کو بتایا۔
شہریار تھک چکے تھے۔ طارق اور شارق نے مل کر اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹادیا۔ محسن رضا نے پانی والی بوتل لانے کو کہا۔ سونیا نے ٹارچ روشن کی اور محسن رضا جو گلاس میں پانی لے کر اس پر جھکے تو بس جھکے ہی رہ گئے۔ گلاس ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ نظریں مسلسل اسی چہرے پر جمی رہیں۔
وہ زیر لب کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ ان کے قریب موجود سب لڑکوں نے صرف ایک ہی لفظ سنا۔
''مریم۔۔۔ تم۔۔۔ تم یہاں کیسے۔۔۔؟ تم کہاں سے آ گئیں مریم؟''
اُن کا حیرت زدہ چہرہ دیکھ کر اور ایک اجنبی نام سن کر وہ سب ہکا بکا ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کون تھی یہ مریم؟ ایک سوال سب کی آنکھوں میں تھا۔

❁❁❁❁

یہ سوال جو آنکھوں میں تھا۔ جو دلوں میں تھا لبوں پر نہ آسکا۔ محسن رضا خود ہی چونکے انہوں نے اس کا سر تھوڑا سا اونچا کر کے پانی کا گلاس ان خشک لبوں سے لگا دیا۔ سب چپ چاپ کھڑے رہے۔
''سونیا۔۔۔!'' انہوں نے سونیا کو آواز دی۔
''بیٹا تم پیچھے بیٹھ کر اس کا خیال رکھو۔ ہم گاڑی چلائیں گے۔ شیر دل تمہاری حالت خراب ہے تم آرام کرو۔ اور شہریار تم طارق کے پاس اس کی جیپ میں چلے جاؤ۔''
محسن رضا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس حادثے نے دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور اب تو ایک نام ذہن میں مسلسل ہلچل مچائے ہوئے تھا۔
مریم بخاری۔ اُن کی اپنی مریم۔ جو اٹھارہ سال سے زیادہ عرصے سے ان سے جدا جانے کہاں تھی، کس حال میں تھی۔ وہ مضبوط و توانا مرد عمر بھر کی تلاش کے بعد اُسے نہ پا سکے تھے۔ اور آج مریم کے روپ میں یہ کون ان کے سامنے آ گیا تھا۔ مریم کی جدائی لاکھ ان کے اعصاب کو کمزور کر دے۔ لاکھ انہیں دیوانہ بنا دے لیکن یہ تو انہیں یاد تھا کہ مریم سے جدا ہوئے انہیں پورے اٹھارہ سال ہونے کو تھے۔ ایک ایک لمحے کا حساب ان کے دل پر لکھا تھا۔ اور یہ جو چہرہ ان کے سامنے تھا۔ یہ بھی ایک جوان لڑکی کا تھا جس کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ سخت پریشان تھے، سخت مضطرب تھے لیکن گاڑی پر مکمل کنٹرول تھا انہیں۔ ناصر عباس شاہ نے ان سے لاکھ اصرار کیا کہ وہ رات یہیں ٹھہر جائیں لیکن وہ جانے پر مصر رہے۔

بس خدا کو ان کے ہاتھوں ایک جان بچانا مقصود تھا۔ خدا کی خدائی میں روزانہ کیسے کیسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ سو ایک واقعہ یہ بھی تھا رات کے گیارہ بجے وہ صرف اسی خاطر اپنے دوست کو ناراض کر کے چلے آئے تھے؟ محسن رضا نے بیک ویو مرر سے دیکھا۔ سونیا نے اس کا سر اپنی آغوش میں رکھا ہوا تھا۔ اور وہ مسلسل آنکھیں بند کیے غنودگی یا نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ دوسرے دن گیارہ بجے وہ بدقت تمام اپنے گھر پہنچے۔ راستے میں کافی جگہوں پر رکنا پڑا۔ لیکن اس کی وجہ سے محسن رضا نے گاڑی سے اترنا مناسب نہیں سمجھا۔ بس اپنی ڈاکٹری کے بل بوتے پر اسے گیارہ بجے تک نیند آور انجکشن کے زیرِ اثر سلائے رکھا۔

رضا ہاؤس میں دن کے ہنگامے بھرپور انداز میں جاگے ہوئے تھے۔ عابدہ خانم بڑی بے چینی سے اپنے بیٹے اور پوتوں کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ ابھی ابھی خادم نے انہیں محسن رضا کے آنے کی اطلاع دی تو وہ اٹھ کر دریچے میں آ کھڑی ہوئیں۔ اور جب شہریار نے اسے کندھے پر اٹھا کر برآمدے کا رخ کیا تو عابدہ خانم گھبرا کر اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ اسی لیے تو سونیا کا اُن لوگوں کے ساتھ جانا مناسب خیال نہیں کرتی تھیں۔

''میری سونیا کو کیا ہوا۔ میرے خدا مجھے کوئی اچھی خبر سنانا۔'' وہ کانپ سی گئیں۔ ابھی انہوں نے طویل کاریڈور عبور نہیں کیا تھا کہ سونیا ان سے آ لپٹی۔

''آداب دادی جان!''

''اوئی لڑکی۔ تو نے تو ڈرا ہی دیا۔ ابھی تو تُو شہریار کے کندھوں پر سوار تھی ابھی دوڑی دوڑی میرے پاس آ گئی۔''

''نہیں دادی ماں۔ وہ میں نہیں تھی۔''

''ہائیں تو پھر کون؟ عابدہ خانم اس پریشانی میں اپنے پوتوں کی پیشانیاں چومنا بھی بھول گئیں۔ تب محسن رضا ان کے آگے آ کے جھک گئے۔

''امی جان تسلی رکھیے۔ وہ ایک مظلوم لڑکی ہے۔ ہم نے اس کی جان بچائی اور ساتھ لے آئے۔''

اتنی دیر میں شیر دل اور شہریار بھی کوریڈور میں داخل ہو چکے تھے۔ محسن رضا کے حکم پر وہ عابدہ خانم کے کمرے کی طرف بڑھے تو سب ہی ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ اس اثنا میں شیر دل اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کر چکے تھے۔

❁❁❁❁

''یہ جنت کا کوئی گوشہ نہیں۔ رضا ہاؤس کا ایک کمرا ہے اور آپ کے اردگرد حور و غلمان کے بجائے رضا ہاؤس کے نوجوان اور لڑکیاں ہیں مس۔'' اس نے آنکھیں کھول کر تحیرانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا تو شیر دل نے بڑی تسلی سے اسے آگاہ کیا۔

اس کی آنکھیں ناشناسائی کا احساس لیے ہر ایک کی طرف اٹھیں۔ ستارہ آنکھوں کی چمک گو حالات کی سنگینی نے مدہم کر دی تھی۔ لیکن پھر بھی ان پرکشش آنکھوں کا حسن اپنی جگہ قائم و دائم تھا۔ سونیا اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور بڑے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور طارق محسن رضا کی

ہدایت کے مطابق انہیں بلانے کو دوڑے کیونکہ وہ پندرہ بیس منٹ سے ہوش میں آچکی تھی۔

محسن رضا نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کی نظروں میں ایک بار پھر مریم کا سراپا لہرا گیا۔ وہی چہرہ، وہی آنکھیں، ویسے ہی ہونٹ، ویسی ناک، بالکل اسی کی طرح گھٹاؤں جیسے سیاہ بال، اتنا ہی قد، اس جیسا بدن، ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ اگر آج مریم ان کے ساتھ ہوتی تو شاید ایسی شکل و صورت کی ان کی اپنی بیٹی ہوتی۔ بس اتنا سوچتے ہی انہیں مریم سے مشابہت رکھنے والی اس لڑکی پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

''بیٹی۔۔۔!'' انہوں نے بڑی حسرت سے اُسے پکارا۔

''ہم تمہارے ہوش میں آنے کے منتظر تھے۔''

یہ پیار بھرا لہجہ شبنم کو امداد حسین کی یاد دلا گیا۔ اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ ایک مکمل جہان چھوڑ کر جہاں رسوائیاں اور ذلتیں اس کی منتظر تھیں۔ اس نے موت کو گلے لگانا چاہا تھا۔ لیکن موت اس کی نہ بن سکی۔ زندگی اسے کھینچ کر یہاں لے آئی۔ جہاں پہلی سانس کے ساتھ ہی محبت اور خلوص کی خوشبو اس کے اندر اترتی چلی گئی تھی۔

اُس نے اٹھنا چاہا لیکن محسن رضا نے اسے پھر لٹا دیا۔ محسن رضا کے ایک اشارے پر وہ سب لوگ باہر چلے گئے تو انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔

''تم کون ہو بیٹی؟ اور تم نے ایسا اقدام کیوں کیا؟'' شبنم کی آنکھوں کی جھیلیں پانیوں سے بھر گئیں۔

''آپ نے مجھے مر جانے دیا ہوتا۔ آپ کون ہیں؟ آپ نے مجھے کیوں بچایا؟''

''سب خدا کا حکم تھا۔ ہم بندے بھلا کچھ کرنے کے لائق ہیں۔ ہاں بیٹی۔ تم اپنے گھر کا اتا پتا بتاؤ تو ہم تمہیں وہاں چھوڑ آئیں۔ یا انہیں اطلاع بھجوا دیں۔ رات تو صرف تمہاری جان بچانے کی خاطر ہم دوڑے چلے آئے۔''

''نہیں نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ بس میں مرنا چاہتی ہوں۔ مجھے مر جانے دیجیے۔''

''مگر کیوں؟'' محسن رضا نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ مجھ جیسی نادان لڑکیوں کو جینے کا حق ہی نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ سسک اٹھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''شبنم۔۔۔!''

''مریم۔۔۔ شبنم۔۔۔ ناموں میں بھی مماثلت ہے، حیرت کی بات ہے۔'' انہوں نے سوچا اور گویا ہوئے۔

''تو شبنم بیٹی۔ تم مجھے اپنے حالات بتاؤ۔ ہمیں مناسب لگا تو تمہیں گھر چھوڑ آئیں گے۔ اور بہتر نظر آیا تو بیٹی بنا کر اپنے پاس ہی رکھ لیں گے۔''

شبنم نے بے یقینی کے عالم میں ان کی طرف دیکھا۔

''دیکھیے آپ مجھے نوکرانی بنا کر اس گھر میں رکھ لیجیے گا لیکن میں واپس اپنے گھر نہیں جاؤں گی۔

میں نے پہلے ہی بہت بڑا دکھ اپنے ماں باپ کو دیا ہے۔ اب میری غیر موجودگی میں تو ان کی جان لے لی ہوگی۔ میں ان کے لیے مر چکی ہوں۔ مجھے ان کے خیال میں مردہ ہی رہنے دیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔ اس کے بعد آپ کا جو جی چاہے مجھ سے سلوک کیجیے گا۔''

اور تب شبنم نے انہیں مختصراً اپنے بارے میں بتا دیا۔ لیکن آفاق کا نام کہیں نہ آنے دیا۔

''اوہ بیٹی! تمہاری داستان کی سچائی تمہارے معصوم چہرے پر ہی لکھی ہے کسی گواہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میری بچی! یہ دنیا والے بڑے ظالم ہیں۔ انسان انسانوں کو لوٹنے میں دیر نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں لفظ محبت میں عورت کے لیے بے پناہ کشش ہے اس نام پر وہ مر جاتی ہے۔ مٹ جاتی ہے۔ وفا کے نام پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ اس رئیس زادے نے تم سے کھیل کھیلا اور چلتا بنا۔ لیکن ایک احسان کیا اس نے نکاح کرنے کا۔ ورنہ لوگ تو اسے بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ گھر میں کسی پر اپنی کہانی ظاہر نہ کرنا۔ بس یہی کہنا کہ تمہارا شوہر مر گیا۔ اس کی جدائی اور بے سہارگی کی وجہ سے تم خودکشی کرنے لگی تھیں۔ باقی میں خود سنبھال لوں گا۔ آج سے تم میری بیٹی ہو۔ اس گھر پر اپنا حق سمجھنا۔ اگر تعلیم حاصل کرنا چاہو تو مکمل اجازت ہے۔ تمہارا مڈل کا سرٹیفکیٹ بوقت ضرورت بورڈ سے مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ تمہیں رول نمبر یاد ہو۔

شبنم تم ایک دن میں ہی میری کمزوری بن چکی ہو۔ تم ہو بہو میری بیوی کی شکل ہو آج اگر میری بیٹی ہوتی تو تم جتنی ہوتی اور تم جیسی ہوتی۔ اگر مریم یہاں ہوتی تو وہ بھی تمہیں بیٹی سمجھ کر گلے سے لگا لیتی۔ آج سے تم مجھے بابا ہی سمجھنا اور کہنا۔ ٹھیک ہے نا۔''

شبنم کے لبوں پر اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔

❁❁❁❁

انسان اس دنیا میں سب سے پہلے صرف اپنے اور اپنی خواہشات کے لیے ہی زندہ رہتا ہے۔ ایک امید ایک آس انسان کو زندہ رکھتی ہے کچھ پا لینے کی آس۔ کچھ کھو جانے کا یقین۔ اگر یہ یقین نہ ہو تو آدمی بنا موت کے مر بھی سکتا ہے۔ محسن رضا بھی زندہ تھے۔ بہت کچھ کھو کر کچھ پا لینے کی آس میں شبنم کا وجود ان کی بے رونق زندگی میں بہت کچھ لے آیا۔ ماضی کی یادیں تازہ ہوئیں یہ صورت آشنا آشنا لگی۔ یہ چہرہ دیکھا بھالا محسوس ہوا۔ لیکن مریم اور شبنم میں بے حد فاصلہ تھا۔ کہاں وہ ایک اونچے خاندان کی رئیس زادی، کہاں یہ ایک معمولی سے آدمی کی بیٹی، بہرحال ناکام آرزوؤں نے رستہ روکا، اُن کا دامن تھاما۔ اور انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ شبنم ہمیشہ کے لیے ان کے پاس ہی رہے گی۔ اور یہ فیصلہ انہوں نے عابدہ خانم تک پہنچا دیا۔

احسن رضا سرکاری دورے پر ہالینڈ گئے ہوئے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ محسن رضا کی اکلوتی ہمشیرہ آج کل ایران سے دو ماہ کی طویل رخصت پر اہل خانہ سے ملاقات کی غرض سے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ عالیہ خانم کو دونوں بھائی ہمیشہ سے بے طرح عزیز رہے تھے۔ احسن رضا کا بھرا پرا گھر سب کے لیے خوشی کا سرچشمہ تھا۔ جبکہ محسن رضا کی بے آب و گیاہ صحرا جیسی زندگی ہر ایک کے لیے پریشانی کا سبب تھی۔ بڑی عجیب تھی ان کی کہانی جس کا نہ سر انظر آتا تھا نہ آخر۔ بس گورکھ دھندا تھے وہ اپنی

ذات میں ایک حل نہ ہونے والا معمّہ۔ سب نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ کسی کو دخل اندازی کی جرأت ہی نہ تھی۔ جوان نسل کی معلومات تو محدود سی تھیں۔ لیکن عابدہ خانم کو شبنم کی آمد نے چونکا کے رکھ دیا۔ کون تھی یہ شبنم؟ اگر محسن رضا اکیلے ہی شبنم کو کہیں سے لے آتے تو عابدہ خانم آنکھیں بند کر کے یہ یقین کرنے پر مجبور ہوتیں کہ شبنم مریم کی بیٹی ہے لیکن سب کو خبر تھی کہ وہ شبنم کو موت کے منہ سے بچا کر لائے ہیں۔ اور یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر بالکل اچانک ہو گیا تھا۔ لیکن شبنم کا وجود عابدہ خانم کے ذہن میں ہلچل سی مچا گیا۔ محسن رضا کی اکلوتی ہمشیرہ جوان کی ہم پیشہ بھی تھی ہم خیال بھی ہم عمر بھی اور کبھی ہم جماعت بھی۔ انہیں بھی شبنم کو دیکھ کر کئی بھولی بسری کہانیاں یاد آ گئی تھیں۔ لیکن وہ نظریں چرائے چرائے پھرتی تھیں۔ مبادا محسن رضا ان سے کوئی قصہ پارینہ چھیڑ کر نہ بیٹھ جائیں۔

عابدہ خانم نے جانے کن زیادتیوں کی تلافی کے طور پر شبنم کو بخوشی گھر کی ایک فرد کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ شہریار اور شیر دل دونوں ہی شبنم کے حسنِ جاں سوز کی تپش محسوس کرنے لگے تھے۔ سونیا بھی مرعوب سی تھی۔ صرف اسی معاملے میں ورنہ اس نے تو پہلے روز ہی شبنم کو دوستی جیسے خوب صورت رشتے میں جکڑ لیا تھا۔ طارق اور شارق بھی محسن رضا کے حکم کے موجب شبنم کی دلجوئی میں پیش پیش تھے۔ عالیہ خانم نے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے شبنم کو وارفتگی کے عالم میں دیکھا، تو وہ جھینپ کر رہ گئی۔ عالیہ کا جی چاہا کہ وہ اسے گلے لگا لیں اور خوب جی بھر کے آنسو بہائیں۔ لیکن ایسا کرنے کی ہمت ان میں موجود نہ تھی۔ بس چپ چاپ اسے تکتی رہیں۔

❁❁❁❁

رضا ہاؤس کے در و دیوار کانپ گئے۔ جب عابدہ خانم اور رضا علی نقوی کے لاڈلے بیٹے محسن رضا نے اپنی بچپن کی منکوحہ عاصمہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ عاصمہ ان کی خالہ کی بیٹی تھی۔ خاندانی رسم و رواج کے مطابق دونوں کو عقل و شعور کی منزل تک پہنچنے سے قبل ہی رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا تھا جس کی خبر کم از کم محسن رضا کو نہ تھی۔ شاید وہ اس بندھن کو قبول بھی کر لیتے اگر انہوں نے کسی سے پیمانِ وفا نہ باندھ لیا ہوتا۔ کسی کو دل کے نہاں خانوں میں بڑی اونچی مسند پر بٹھا کر دل کے دروازے بند نہ کر لیے ہوتے تو شاید وہ کوئی اعتراض نہ کرتے اور بخوشی اس پرانے بندھن کی تجدید پر راضی ہو جائے لیکن اب تو وہ بے حد مجبور اور لاچار اور بے بس تھے۔ دل و روح کے ساتھ ساتھ جسم و جاں کو کسی کی امانت سمجھتے تھے۔ اک تبسم فریب نگاہ۔ ایک نظرِ کرم کا حق دار بھی کسی دوسرے کو نہ سمجھتے تھے۔ زندگی میں کسی غیر کی شراکت کیسے گوارا کر لیتے۔ صاف انکار کر دیا۔ بلکہ سب پر واضح کر دیا۔ اپنے دل کا یہ معاملہ کہ انہوں نے ایک لڑکی کو اپنا شریکِ حیات چن لیا تھا اور مکمل ایمانداری کے ساتھ اُسے اپنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

محسن رضا اور ان کی ہمشیرہ عالیہ دونوں ہی میڈیکل کالج میں ایک ساتھ زیرِ تعلیم رہے تھے اور وہ غارت گرِ ایمان مریم بخاری بھی اسی میڈیکل کالج کی طالبہ تھی۔ بلکہ تینوں ہی کلاس فیلو تھے۔ مریم سے شناسائی عالیہ کی معرفت ہوئی تھی۔ جو بڑھتے بڑھتے اعتدال کی ساری حدیں پیچھے چھوڑتی ہوئی ایک لافانی جذبے میں بدل گئی جسے عام لفظوں میں شدید ترین عشق کا نام دیا جاتا ہے۔

دراصل یہ لافانی جذبے دن رات کی یکجائی، میل ملاقات اور دونوں کے منفرد حسن کے مرہونِ منّت بھی نہ تھے بلکہ ان دونوں کے درمیان موجود ذہنی مفاہمت جسے (Mental Under Standing) بھی کہا جاسکتا ہے، کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ سوچ کا انداز، اعلیٰ اخلاقی اقدار، ذہنوں کی انسانیت کے بلند ترین معیار تک پہنچ، عوام الناس کے لیے بے لوث جذبے جن میں ایثار اور مروت سب سے پہلے تھے اور ان سب سے بڑھ کر سادگی اور معصومیت۔ جو دونوں میں بدرجہ اتم موجود تھی اور جس نے دونوں کو اپنی اپنی جگہ زبردست طریق پر متاثر کیا تھا۔ جہاں پورے کالج میں محسن رضا منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے تھے وہاں لڑکیوں کے گروہ میں مریم بخاری کا نام نمایاں تھا۔ اس کے لبوں کی ملکوتی مسکراہٹ نے بہتوں کا چین چھین لیا تھا۔ کئی دل بے قرار ہوئے تھے، بڑے لوگوں کی راتوں کی نیند حرام ہوئی تھی لیکن وہ سب سے بے نیاز صرف اور صرف اپنی تعلیم میں مگن تھی، جب بالکل اچانک اسے احساس ہوا کہ محسن رضا کی ایک نگاہ مہربان اسے عمر بھر کا سکون بخش دینے کو کافی ہے۔

محسن رضا اور عالیہ اکثر ہاسٹل میں مریم کے پاس چلے آتے۔ عالیہ اور مریم تو مل کر اسٹڈی کیا کرتیں اور محسن کی آمد صرف دل ضدی کے تقاضوں کے سبب ہوتی۔ مریم بخاری کی ہاسٹل لائف بڑی محدود سی تھی۔ شاپنگ، سینما، تفریح ان چیزوں سے وہ بہت دور تھی۔ ضرورت کی ہر چیز ہر ماہ فراوانی کے ساتھ اس تک پہنچ جاتی۔ اور بس۔ عالیہ نے کئی بار اسے گھر آنے کی دعوت دی۔ جسے مریم نے ہمیشہ خوب صورتی کے ساتھ ڈالا۔ وہ جانتی تھی بھائی جان نے خاندانی روایات کے خلاف اسے کوایجوکیشن میں پڑھنے کی اجازت دے کر اس کی ذات پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ ان کی لگائی ہوئی پابندیوں کے حصار میں رہ کر انہیں اطمینان بخشنا چاہتی تھی۔ اعتماد کی اسی بیش بہا دولت کے سہارے تو انہوں نے مریم کو جوہر آباد سے اتنی دور اکیلا بھیج دیا تھا۔ ہر بار جب بھی وہ آتے مریم ان سے پوچھنا بھول جاتی اور معاملہ آگے اور آگے بڑھتا رہتا۔ ایک شام جب وہ عالیہ اور محسن کے ساتھ ہاسٹل کے لان میں محوِ گفتگو تھی۔ چوکیدار نے بھائی جان کی آمد کی اطلاع دی اور ساتھ ہی وہ اندر چلے آئے۔

دونوں کی موجودگی کا انہوں نے خاصا نوٹس لیا۔ مریم نے خود پر قابو پاتے ہوئے اعتماد کے ساتھ ان کا تعارف کرایا۔ لیکن مریم کو یہ جاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ بھائی جان نے محسن کی موجودگی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اور ان کے جانے پر صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''مریم بی بی! کالج ٹائم کے بعد تمہارے پاس کسی کا آنا کچھ ایسا ضروری نہیں۔''

''بھائی جان! وہ عالیہ کے بھائی ہیں۔ اسے لے کر آئے تھے تو ظاہر ہے کہ۔۔۔''

''بس میں نے جو کہہ دیا۔۔۔ وہ اسے چھوڑ کر بھی جاسکتا ہے اور دوبارہ لینے بھی آسکتا ہے اور یہ مرحلے میرا خیال ہے بالکل آسان ہیں۔''

مریم سر جھکا کر رہ گئی۔ ہاسٹل کی بورترین زندگی میں یہی لمحے تو حاصلِ حیات تھے جن لمحوں میں وہ عالیہ اور محسن رضا کی سنگت میں مسکراتی رہتی تھی۔ محسن کی لچسپ گفتگو کے سحر میں ڈوبی رہتی تھی۔

بھائی جان چلے گئے لیکن اس کے لیے ایک نئی الجھن پیدا ہوگئی۔ جس کا اظہار وہ عالیہ سے بھی نہ کر سکتی تھی۔ کلاس میں وہ دونوں سے کترائی کترائی سی رہی۔ گویا کسی طلسم سے نکلنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ لیکچر

بھی توجہ سے نہ سن سکی۔ جرنل بناتے ہوئے کئی غلطیوں کی مرتکب ہوئی۔ خاصا دشوار مرحلہ تھا یہ بھی۔ محسن رضا کی مسکراہٹ نے نگاہوں کی وارفتگی نے بارہا چہرے پر سرخیاں پھیلائیں لیکن ہر بار اس نے صفائی سے دامن بچالیا۔ اس کے چہرے پر شاید اجتناب کی تحریر رقم تھی۔ جسے محسن رضا نے اس کے ذہن تک رسائی رکھتے ہوئے بہت جلد کھوج لیا تھا۔ جبھی تو وہ لائبریری میں اس کے پاس چلے آئے۔

''مریم! خیریت تو ہے۔'' انہوں نے سامنے کی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

''خیریت ہی ہے۔ بہت تھک گئی ہوں آج۔''

''یہ تو معمول کی بات ہے۔ آج بھی روز جتنا ہی کام تھا۔'' انہوں نے ٹٹولتی نظریں اس کے چہرے پر جمائیں تو مریم نے گھبرا کر نگاہیں کتاب پر جمادیں۔

کوئی اور مسئلہ تو نہیں؟

''نہیں۔ نہیں۔''

''لگتا ہے کوئی گھریلو پریشانی ہے۔ کل آپ کے بھائی جان آئے تھے نا۔'' وہ کریدنے پر آمادہ تھے۔ مریم نے ضبط کی کوشش کی لیکن آنکھیں بھر آئیں۔ محسن رضا نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''مریم۔۔۔! شاید میں آپ کی مدد کرسکوں۔''

''نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں۔'' اس نے آنسوؤں کو اندر ہی اندر جذب کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

''مریم۔۔۔! یہ اجتناب، یہ پردہ داری غیروں کے سامنے اچھی لگتی ہے میں اور آپ تو۔۔۔'' محسن نے مسکراتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مریم نے اُن کی طرف دیکھا۔

''ہاں وہ اس کے لیے غیر کب تھے۔ دل نے مدّت ہوئی انہیں سارے جہان سے زیادہ عزیز مان لیا تھا۔ دنیا کے ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگوں میں ایک محسن رضا ہی تو تھے، جنہیں دل جیسا مہنگا مسکن عمر بھر آباد رکھنے کو مریم بخاری نے کہے سنے بنا دے دیا تھا۔ نہ اقرارِ وفا نہ خوب صورت لفظ، نہ وعدے نہ قسمیں۔ پانچ سالہ رفاقت میں بے حساب گھڑیاں ایک ساتھ گزار کر دونوں کے دل میں یہ احساس جاگ اٹھا تھا کہ وہ دونوں صرف ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ محسن رضا کی ذات سے تحفظ کا خوب صورت اور انوکھا احساس ملا تھا۔ اور محسن مریم کے وجود پر بہت مان کرنے لگ گئے تھے۔

''ایسا کچھ ہوتا تو ضرور آپ کو بتاتی۔ بھلا کبھی کوئی بات آپ سے اور عالیہ سے میں نے چھپائی۔''

''عالیہ کو چھوڑیے مس مریم بخاری صرف میری بات کیجیے۔''

''بڑے خود غرض ہیں آپ۔ یہ جانتے ہوئے کہ عالیہ اس دنیا میں میری واحد دوست ہے آپ مجھے اُسے نظر انداز کر دینے کا کہہ رہے ہیں۔''

''اجی تندوں کو پوچھتا ہی کون ہے۔ میں نے سوچا جو کام شادی کے بعد ہوا سے پہلے کیوں نہ کرلیا جائے۔'' وہ بے حد شوخی سے کہہ رہے تھے۔

''آں۔۔۔۔'' کچھ دیر تک تو وہ سمجھ ہی نہ سکی لیکن جب سمجھی تو پھر بھی محسن رضا کی طرف دیکھتی

رہی۔

''محسن رضا! آپ نے یہ بات سنجیدگی سے کہی ہے نا۔''

''ہاں مریم! عالیہ ہم دونوں کے درمیان راستے کی دیوار ہے۔''

''افوہ! میں عالیہ کی نہیں۔ شادی کی بات کر رہی ہوں۔'' اس نے ہنسی ضبط کی۔ محسن نے حیران ہو کر مریم کی طرف دیکھا، جو شادی کا ذکر رسان سے کر رہی تھی۔

''شادی کی بات۔۔۔ اوہ دل خوش کر دیا آپ نے مریم! بھئی میری اور آپ کی شادی کا فیصلہ تو پکا ہے۔ آسمانوں پر ازل سے لکھا جا چکا۔ میں تو کل شام بھائی جان سے دست بستہ عرض کرنے لگا تھا۔ پھر میں نے سوچا یہ کام محترم رضا علی نقوی ہی سرانجام دیں تو بہتر ہے۔''

مریم کے چہرے پر اطمینان اُتر آیا۔ آنکھیں شاید مزید چمک رہی تھیں۔

''ہم سمجھ گئے محترمہ! شاید آپ کو فکر اسی بات کی تھی دیکھئے! ہیں نا ہم آپ کے مزاج شناس کیسے منٹوں میں مسئلہ حل کر دیا'' وہ چٹکی بجاتے ہوئے مسکرائے اور مریم بخاری تنقیدی نگاہوں سے ان کا جائزہ لینے لگی۔

تھری پس سرمئی لائن دار سوٹ میں سرخ و سفید رنگت اور سیاہ لہریے دار بالوں میں سیاہ چمکتی آنکھوں اور سرخ گداز لبوں سمیت وہ بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ سیرت اخلاق اور کردار کھلی کتاب کی طرح مریم کے سامنے تھا۔ ''بھائی جان کس خامی پر انہیں ریجیکٹ کریں گے۔'' یہ سوچ کر وہ مسکرا دی۔

''مریم آپ میرا جائزہ یوں لے رہی ہیں جیسے بردکھوے کے لیے آئے لڑکے کو سسرالی لوگ دیکھتے ہیں یا۔۔۔ قصائی بکرے کو۔''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب! ہم آپ کو اپنی نگاہ سے نہیں بھائی جان کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔'' ان کی فہم و فراست کا اندازہ ہوا تو وہ اور بھی شوخ ہو گئی۔

''پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے۔'' محسن رضا نے پھر کہا۔

''بھائی جان کہیں گے کہ سودا برا نہیں۔ اور چپ چاپ میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دیں گے۔''

''ہرّا۔۔۔ اسی خوشی میں ہو جائے کوئی ریفریشمنٹ۔ چلئے مریم اس راستے کی دیوار کو بھی ڈھونڈ لیں ابھی اس کی موجودگی ہی بھلی ہے۔ اسے کسی قانونی طریقے پر ہی راہ سے ہٹائیں گے۔''

دونوں لائبریری سے باہر نکلے تو مریم بے حد پرسکون تھی۔ سارا مسئلہ گویا حل ہو گیا تھا۔

❁❁❁❁

فائنل ایئر بھی ختم ہو گیا۔ امتحان دیتے ہی وہ جوہر آباد آ گئی۔ ماں اور باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد بھی اس نے خود کو تنہا محسوس نہ کیا تھا۔ ریاض احمد بخاری کی ساری شفقت و محبت مریم کے لیے تھی کہ وہ ان کی اکلوتی بہن تھی۔ ریاض محل میں وہی رونق اور وہی ہنگامے تھے۔

ریاض احمد اپنے پرائے سب کے لیے مہربان تھے۔ امیر اور غریب کے تفاوت کا احساس کیے بغیر وہ ہر ایک سے لطف و کرم کا سلوک رکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ دوست تو دوست دشمن بھی ان کے حسنِ سلوک

کے قائل تھے، مریم کی انّا کی بیٹی اختر مریم کو بہنوں کی مانند عزیز تھی۔ جب سے مریم کورس مکمل کر کے لوٹی تھی اختر کا ایک ایک لمحہ مریم کی خاطر مدارت میں گزر رہا تھا۔

آج کل وہ اپنا جہیز بھی مکمل توجہ سے بنا رہی تھی۔ ایک دو ماہ میں شادی ہونے والی تھی۔ امداد حسین اس کے دل کی دھڑکنوں میں بس گیا تھا۔ جو ریاض احمد بخاری کے منشی کا جواں سال خوب صورت لڑکا تھا۔ مریم کو خبر تھی یہ شادی اختر اور امداد دونوں کی خواہش پر ہو رہی ہے لہٰذا وہ بھی اختر کو چھیڑنے سے باز نہ رہ سکی۔ جب اختر سرخ دوپٹے پر گوٹہ لگاتی اس کے چہرے پر جھلمل کرتے کئی خوب صورت رنگ لہراتے رہتے اور مریم کے تصور میں محسن رضا آجاتے۔ جنہوں نے بہت جلد اپنے بابا رضا علی نقوی کو بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے پانچ سالہ رہائش کے دوران بھائی جان کی مرضی کے خلاف ایک بار بھی رضا ہاؤس کا رخ نہیں کیا تھا۔ لیکن محسن رضا کے کمرے کا تصور بخوبی کر لیتی کہ محسن رضا نے اپنے متعلق اور اپنے شب و روز اور اردگرد کے متعلق ایک ایک بات اسے بتا رکھی تھی۔ اس سے تنہائی کے لمحات کاٹنا دوبھر ہو جاتا تو وہ وسیع لان میں بچوں کے سنگ تتلیاں پکڑ کے، بھاگ دوڑ کر کے، انہیں کھیلتا دیکھ کے وقت کاٹنے کی کوشش کرتی۔ ریاض احمد بخاری کے تینوں بیٹے اسے برابر ہی پیارے تھے اور آفاق تو اس کی گود میں رہ کر پروان چڑھا تھا اس لیے مریم سے مانوس بھی بہت زیادہ تھا۔ جب وہ پھپھو جانی کہہ کر اس سے لپٹتا تو من میں ٹھنڈک ہی ٹھنڈک اترتی چلی جاتی۔ جب سے وہ ریاض محل آئی تھی آفاق کا اٹھنا بیٹھنا، پڑھنا لکھنا، سونا جاگنا سب مریم کی ہمراہی میں ہو گیا تھا۔

اکثر جب اختر مریم کے پاس بیٹھی اپنے جہیز کی کوئی نہ کوئی چیز تیار کرنے میں مصروف ہوتی۔ آفاق دھاگے الجھا دیتا، کبھی سوئی چھپا دیتا، کبھی چھوٹی سی قینچی ادھر اُدھر کر دیتا۔ اور ہزار منت سماجت اور خاصے جرمانے کی ادائیگی کے بعد اختر کو گم شدہ چیز مل پاتی۔ اکثر شام کو مریم آفاق اور اختر کے ساتھ سیر کے لیے چلی جاتی۔ کافی دور تک سرسبز مرغزاروں میں گھومنا پھرنا اور دور چلے جانا اچھا لگتا۔ آفاق آگے بھاگ جاتا اور جب مریم تیز قدموں سے اس کی طرف لپکتے ہوئے راستے کے نشیب و فراز کی وجہ سے لڑکھڑا جاتی تو وہ تالیاں بجاتے ہوئے خوب ہنستا۔ ایسے ہی ایک دن وہ تینوں سیر کے بعد واپس آ رہے تھے کہ بل کھاتی اونچائی کی طرف آتی سڑک پر اسے محسن رضا کی گاڑی نظر آ گئی۔ دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ سرخ رنگ کے دوپٹے کے ہالے میں گلابی ہوتا چہرہ اختر کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکا۔ جسم بے جان سا ہو گیا۔ وہ محسن رضا کا سامنا کرنے کی جرأت اپنے اندر نہ پا رہی تھی۔ جھٹ درختوں کی اوٹ میں ہو گئی۔ اختر کو تو کسی بات کی خبر ہی نہیں تھی۔ وہ معمول کے مطابق اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔

❁❁❁❁

گھر میں گویا طوفان سا آ گیا تھا یہ سن کر کہ محسن رضا عاصمہ کے بجائے اپنی کلاس فیلو عالیہ کی دوست مریم بخاری سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ بے شک چھوٹے ہونے کے سبب وہ گھر بھر کے لاڈلے تھے۔ احسن رضا اُن پر جان نچھاور کرتے تھے۔ عالیہ خانم کے لیے وہ بے حد عزیز ہستی تھے۔ ماں باپ کے جیون کی بہت بڑی آس اور خوشی، لیکن یہ بات کسی کو بھی منظور نہ تھی، حتیٰ کہ اس عالیہ خانم کو بھی جسے مریم بخاری سے بہنوں جیسا پیار تھا اسے بھابھی بنانے کا حوصلہ نہ تھا۔

رضا علی کی گرج دار آواز نے در و بام لرزا دیے۔ عابدہ خانم نے دوٹوک انداز میں محسن رضا کا فیصلہ مسترد کر دیا۔ احسن رضا نے اس فیصلے کی صورت میں محسن رضا سے ہر ناتا توڑ لینے کا اعلان کر دیا۔ لیکن محسن کا فیصلہ پھر بھی اپنی جگہ قائم رہا۔

سب سے روٹھے رہنے پر، کمرے میں بند ہو جانے پر، کھانے پینے کے پروگرام میں سخت بے قاعدگی پر راتوں کی نیندیں حرام کر لینے پر، رونے اور گڑگڑانے پر، یہاں تک کہ عابدہ خانم کی منت سماجت کرنے پر بھی گھر والوں کے رویوں میں سرِ مُو فرق نہ آیا۔

وجہ صرف اور صرف عاصمہ نقوی کی ذات تھی جو کہ ان کی خالہ زاد بھی تھی اسے چھوڑ کر رضا علی نقوی کسی آسمانی حور کو بھی بہو کا درجہ دینے پر تیار نہ تھے۔ اور یہ ان کا آخری فیصلہ تھا۔ جبکہ محسن رضا وہ بھلا عاصمہ کے بارے میں ایک پل کے لیے بھی کیا سوچے اور کیسے سوچتے کہ انہوں نے سارے کے سارے دل میں مکمل حقوق کے ساتھ مریم بخاری کو بسا رکھا تھا۔

اُن کا جواب ایک انکار ہی تھا جو ہر دم لبوں پر تھا۔ گھر کی مکدّر فضاؤں میں ایک پل کے لیے بھی سکون نہ تھا۔ بلکہ خاندان بھر میں محسن رضا کی اس ضد اور ہٹ کا چرچا تھا۔ اور لوگ کسی نئی صورتِ حال کے منتظر تھے۔ انہوں نے مریم بخاری سے بہت جلد اپنے بابا کو بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اور ایک ایک دن عذاب بن کر نازل ہو رہا تھا اُن پر۔ پر بات کہیں بنتی نظر ہی نہ آتی تھی۔ ایک رات جب عالیہ خانم انہیں دودھ دینے کے لیے آئیں تو وہ بے خواب آنکھوں میں سرخیاں لیے سارے جہان سے خفا خفا سے نظر آئے۔ بہنوں کے دل بھائیوں کے لیے کیسے تڑپتے ہیں اس کا اندازہ عالیہ کو ان ہی لمحوں میں ہوا۔ انہوں نے محسن رضا کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے عالیہ کی انگلیاں بھگو گئے۔

''بھائی میں تمہارے لیے کیا کروں؟''

''میں مر جاؤں گا عالی! پلیز تم بابا جان کو راضی کرو۔'' انہوں نے عالیہ کے کندھے تھام لیے۔

''کیسے کروں۔ ان کی نا، ہاں میں نہیں بدل سکتی یہ تم بھی جانتے ہو محسن۔''

''عالی! وہ میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ اس جیسی لڑکیاں دنیا میں بہت کم ہیں۔ نایاب ہیں۔ زندگی میری ہے اسے بسر بھی میں نے کرنا ہے پھر کیوں نہ اپنی مرضی سے بسر کروں۔ مجھے تو کبھی یہ خبر نہیں رہی کہ عاصمہ نام کی کوئی لڑکی میری شریکِ حیات بنا دی جائے گی۔''

''بزرگوں کا خیال تھا، بچپن سے اگر یہ خیال دل میں ڈال دیا جائے تو لڑکے یا لڑکیاں اپنا کیریئر آسودگی سے مکمل نہیں کر سکتے۔ ذہن تقسیم ہو جاتا ہے۔''

''اچھا۔۔۔ ذہن کی تقسیم انہیں گوارا نہ تھی اور یہاں جو جسم و جاں کو تقسیم کیا جا رہا ہے۔ وہ تو ٹھیک ہے نا۔''

''تو تم کیا کر سکتے ہو محسن؟''

''میں ہر حال میں مریم سے شادی کروں گا بس اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ نہیں جاتے بابا جانی تو نہ جائیں۔ کل میں ریاض محل جا رہا ہوں عالی! تمہیں بھائی کی خوشیوں میں شریک ہونے کا ارمان ہو تو

میرے ساتھ چلی چلنا۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔ منزل کا حصول تم بن بھی ممکن ہے۔ اگر تقدیر میں ہوا تو۔''

''محسن رضا! تم بہت سنگ دل ہوئے جا رہے ہو۔''

''افسوس ہے عالی! تم پورے گھر کے پتھر دل کو فراموش کر کے میری سنگ دلی کا شکوہ کر رہی ہو۔ مریم کو پانے کے لیے راستے کی ہر دیوار کو ہٹا کر میں اس تک ضرور پہنچوں گا۔''

عالیہ سہم سی گئی۔ دونوں طرف انا اور خود داری تھی۔ بزرگوں کو روایتوں کا پاس تھا رشتے داریاں عزیز تھیں۔ محسن رضا کو دل کے جذبوں کا احترام تھا۔ وہ عزیز از جان مطلوب تھی۔

دوسرے دن گیارہ بجے وہ گاڑی لے کر جوہر آباد کی طرف چل دیے۔ راستے میں ایک دو گھنٹے کے قیام کے بعد شام کے اندھیاروں سے قبل وہ جوہر آباد پہنچ گئے۔ ریاض محل کسی گمنام جگہ کا نام نہ تھا۔ پہنچنے میں کوئی دیر نہ لگی۔ گاڑی پورچ میں روک کر وہ اترے تو لان میں بیٹھے ریاض احمد بخاری نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور اٹھ کر ان کی طرف بڑھے۔

❁❁❁❁

انہوں نے پذیرائی اچھے انداز میں کی۔ محسن رضا کو اس بات نے کافی حوصلہ دیا۔ کافی دیر ان سے محوِ گفتگو رہے۔ چائے پر ان کے شریک رہے۔ اینکسی تک ان کی راہنمائی کی۔ محسن رضا ریاض احمد بخاری کے حسنِ سلوک کے قائل ہو گئے۔ ان کی نظریں چہار اطراف مریم کو ڈھونڈتی رہیں۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ رات کے کھانے پر ریاض احمد نے انہیں اندر ہی بلوا لیا۔ اور کھانے کی میز پر انہوں نے مریم کو دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں محبت کے پیغام ایک دوسرے تک پہنچ گئے۔ مریم ان کی آمد پر کس قدر خوش تھی۔ اس کا احساس اس کا چہرہ دیکھ کر بخوبی ہو گیا۔ کھانے سے زیادہ محسن رضا دیدارِ محبوب سے سیراب ہوئے۔ اب یہ کالج کا ماحول تو نہ تھا۔ ایک محل نما گھر ریاض محل تھا جہاں اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے اور گفتگو کرنے کے بھی اپنے آداب تھے۔

ریاض احمد محوِ گفتگو رہے بلکہ انہوں نے محسن کو ذاتی خرچ سے بنائے گئے ہاسپٹل میں جاب کی آفر بھی کی۔ جسے محسن رضا نے دلی طور پر قبول کرتے ہوئے خوشی سے ہاں کی۔ اور اس پیش کش کو اپنے لیے نیک شگون جانا۔ کھانے کے وقت اختر بھی کمرۂ طعام میں موجود تھی۔ ڈش لاتے اور لے جاتے ہوئے اس نے بغور محسن رضا کو دیکھا۔ جن کی موجودگی میں مریم کے چہرے پر دھنک رنگ بکھرے جا رہے تھے۔ آفاق اپنی پھپھو کے پہلو میں بیٹھا موٹی موٹی خوب صورت آنکھیں محسن پر جمائے پلکیں جھپک جھپک کے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد ریاض احمد محسن کے ساتھ وہاں سے اٹھ گئے۔

اپنے کمرے میں جاتے ہی مریم نے بیرونی سمت کھلنے والا دریچہ کھولا۔ محسن روش پر چلتے ہوئے اینکسی کی طرف جا رہے تھے۔ مریم سخت مجبوری سے وہیں کھڑی انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

''یہ کون ہیں پھپھو؟'' آفاق کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ آفاق کرسی پر چڑھ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔

''یہ ڈاکٹر محسن رضا ہیں آفاقی۔ میرے کلاس فیلو۔'' مریم نے آفاق کو گود میں بھر لیا۔

''اچھے ہیں نا۔''

''بالکل نہیں۔ اگر وہ آپ کے کلاس فیلو ہیں تو انہوں نے ہمیں گود میں کیوں نہیں اٹھایا۔ پیار کیوں نہیں کیا۔ ٹافیاں کیوں نہیں دیں۔'' آفاق نے ان کے اچھا نہ ہونے کی کئی دلیلیں دے ڈالیں۔ مریم مسکرادی۔

''ابھی وہ آپ سے واقف نہیں ہیں۔ بہت جلد وہ آپ کو مجھ سے بھی زیادہ پیار کریں گے۔'' مریم کے تصور میں حسین و رنگین مستقبل آ گیا۔

''اچھا۔۔۔ ابھی آپ نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں آپ کا دوست ہوں۔'' مریم ہنسنے لگی۔

''جی ہاں۔ ابھی انہیں خبر نہیں۔''

محسن رضا اندر داخل ہو گئے تو مریم دریچے سے ہٹ کر بستر کی طرف آ گئی۔ حسب معمول آفاق کو کہانی سنائی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے وہ سو گیا۔ تو مریم نے اختر کو بلایا۔ وہ آفاق کو اس کی آیا کے پاس چھوڑ آئی۔

واپس آ کر قالین پر بیٹھتے ہوئے اختر نے ایک گہری نگاہ مریم پر ڈالی۔

''یہ مہمان کہاں سے آئے ہیں بی بی؟''

''کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' مریم خوشی سے معمور لہجے میں بولی۔

''اُدھر بیگم صاحبہ کے کمرے میں زور و شور سے ان کا ذکر ہو رہا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ کہہ رہی تھیں کلاس فیلو ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ غیر مردوں کی آمد و رفت اس گھر تک بھی ہو جائے۔'' مریم نے چونک کر اختر کی طرف دیکھا۔

''پھر بھائی جان نے کیا کہا۔''

''میاں صاحب خاموش تھے۔ بس یہی کہا، اس بات کو غلط رنگ نہ دو۔ وہ مریم کی سہیلی کا بھائی بھی ہے۔ میں وہاں رک کر تو کچھ نہیں سن سکتی تھی لیکن چلتے چلتے یہ دو باتیں میں نے سن لی ہیں۔ آپ کا ذکر آیا تو مجھے پریشانی ہوئی کہ جانے کیا بات ہے۔''

مریم نے جواب میں خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔

اُس میں تو اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ کھانے کی میز پر بھائی جان کے سامنے محسن رضا سے کوئی بات بھی کر لیتی اور اختر سے اس بارے میں ویسے بھی کیا کہتی۔

❁❁❁❁

دوسرا دن حسب معمول طلوع ہوا۔ آج مریم کو آفاق کے ساتھ اس کے اسکول جانا تھا۔ کوئی تقریب تھی جس میں بیگم ریاض احمد بخاری کو بطور چیف گیسٹ مدعو کیا گیا تھا۔ ناسازیٔ طبع کی بنا پر مریم کو شرکت کرنا پڑی۔ اختر نے اس کے لیے خاصا خوب صورت اور منفرد لباس منتخب کیا۔ اصرار کر کے ہلکے پھلکے زیور بھی پہنائے اور زبردستی میک اپ کرنے پر بھی آمادہ کیا۔ اختر نے بھی ساتھ جانا تھا۔ آفاق کو تیار ہونے میں دیر تھی۔ مریم پورچ میں آ گئی۔ ڈرائیور گاڑی باہر نکال چکا تھا۔ اور آفاق کے آنے کی دیر

تھی۔ مریم نے بے اختیار دائیں جانب دیکھا۔ اینکسی کے اونچے ورانڈے میں محسن رضا کھڑے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی لپک کر آئے۔ مریم نے بھی قدم آگے بڑھائے اور لان میں دونوں ایک دوسرے کے قریب آ کر رک گئے۔

''صبح بخیر مریم۔۔۔'' ان کے چہرے پر روشن صبح جیسا نور پھیلا تھا۔

''صبح بخیر۔۔۔'' اس نے نظریں جھکا لیں۔

''آپ کو میرے انتظار کی خاصی زحمت اٹھانی پڑی۔'' وہ بجھی بجھی مسکراہٹ کو خوشیوں کے ہجوم میں گم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

''لیکن پُر امید تو ہر حال میں رہی۔'' مریم کی نگاہیں ان کے سراپے میں الجھی رہیں۔

''کدھر جا رہی ہیں آپ صبح ہی صبح؟''

''دس بج چکے ہیں اور تقریب کا وقت دس بجے تھا۔'' مریم کو اس تجاہل عارفانہ پر ہنسی آئی۔

''بہر حال اچھا ہوا کہ آپ کو آج ہی کہیں جانا تھا۔ ورنہ میں تو اب بھی ورانڈے میں کھڑا آپ تک پہنچنے کی ترکیب ہی سوچ رہا تھا۔'' محسن رضا نے اسے مطلع کیا۔ ان کی بات درست تھی۔ کہاں وہ کالج کا ماحول کہاں یہ ریاض محل۔ جہاں گفتگو بھی ناپ تول کر کی جاتی تھی۔ کب اجازت تھی مریم کو کہ وہ ایک اجنبی اور غیر مرد محسن رضا سے بات بھی کرے۔

مریم نے معذرت طلب کرتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''مریم آپ سے صرف ایک بات کہنا تھی۔ ایک اجازت طلب کرنا تھی۔''

''کہیے نا۔''

''میں حسب وعدہ رضا علی نقوی صاحب کو یہاں لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ انہیں خاندانی فیصلوں اور رشتوں کا بہت پاس ہے اور مجھے آپ عزیز ہیں۔ کل سے آیا ہوں۔ لیکن اتنی بڑی بات آپ کے بھائی جان سے کہنے کی ہمت نہیں پا رہا۔ بہر حال آج کسی وقت اپنا دستِ طلب ان کے سامنے ضرور دراز کر دوں گا۔''

''محسن۔ آپ کے والد۔۔۔ میرا مطلب ہے خود آپ کے والد یہ بات کہتے تو۔۔۔'' وہ شرما لجا رہی تھی، گھبرا رہی تھی۔

''یہی تو بتا رہا تھا میں مریم۔ میں آپ کی خاطر اپنے گھر اور اپنے خاندان کے سب ناتے توڑ آیا ہوں۔ بابا جان نے مجھے عاق کر دیا ہے۔ وہ میری آرزو کی تکمیل میں میرا ساتھ دینے سے قاصر ہیں اور میں ان کے فیصلے اپنے آپ پر لاگو کرنے سے، دنیا میں اور چاہیے بھی کیا سوائے ایک دولت کے جسے عام لفظوں میں احساسِ محبت کہا جاتا ہے۔''

''محسن۔۔۔! آپ۔۔۔''

''آگے کچھ نہ کہیے گا مریم۔ میں کئی سنگلاخ راستوں پر چل کے دنیا جہاں کی ناراضگیاں دامن میں بھر کے آپ تک پہنچا ہوں۔ آپ کی ایک معمولی سی بات بھی پندارِ محبت کی دشمن بن جائے گی۔ آپ کی کشش مجھے یہاں تک کھینچ لائی، یہ آپ کی فتح ہے۔ خدا کرے آپ کی فتح میری فتح میں بدل جائے

زندگی کو اس کے سوا کچھ چاہیے بھی نہیں۔"

"پھپھو۔۔۔" آفاق کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ ہڑبڑا کر پلٹی۔ اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھی۔ مریم نے محسن رضا کی باتوں پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے غور کیا وہ چہرہ جو مریم کے سامنے تھا۔ اُسے سامنے پا کر کھلا کھلا سا تھا اُس چہرے پر چھائی پریشانیاں مسکراہٹوں کی اوٹ سے جھانک کر مریم تک اپنا پیام پہنچا چکی تھیں۔ محسن اس کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ آئے تھے۔ یہ بات دکھ کا باعث تھی۔ ایک انتہائی قدم تھا۔ محسن کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

"پھپھو۔۔۔! آپ کے کلاس فیلو آپ سے کیا کہہ رہے تھے؟"

"وہ کہہ رہے تھے آفاق بہت اچھا بچہ ہے آج شام جب میں ٹافیاں لاؤں گا تو تب اسے گود میں اٹھاؤں گا اور پیار بھی کروں گا۔"

"میں نے تو انہیں سلام بھی نہیں کیا، وہ کیا سوچیں گے پھپھو، آفاق بدتمیز ہے۔"

"چلو واپسی میں کر لینا سلام۔"

"نہیں تب وہ سوچیں گے میں ٹافیوں کے لالچ میں سلام کر رہا ہوں۔"

وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ مریم کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔

تقریب میں بہت سے لوگ مدعو تھے۔ ان میں اکثریت مریم کے لیے غیر آشنا تھی آفاق وہاں جاتے ہی بچوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ وہ چند معزز خواتین کے ساتھ خاموش سی بیٹھی ظاہراً ان کی باتیں سن رہی تھی لیکن باطناً محسن رضا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

دو تین گھنٹوں میں ہی واپسی ہو گئی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے مریم نے ارد گرد دیکھا۔ آفاق بھاگ کر اینکسی کی طرف چلا۔ وہ سبک خرامی سے چلتی بیرونی دروازے کی سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ تبھی وسیع و عریض ڈرائنگ روم سے آتی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"آپ کسی مناسب انداز میں اُسے ٹال دیتے بلکہ صاف انکار کر دیتے۔" یہ بیگم ریاض احمد بخاری تھیں۔

"میں کیا کہتا سوائے اس کے کہ ایسے فیصلے ایک پل میں نہیں کیے جاتے۔ وقت صرف ہوتا ہے سوچا جاتا ہے۔"

"سوچا تو وہاں جاتا ہے جہاں ہلکی سی امید یا رضامندی کا دخل ہو۔ یہ بات ایک حقیقت ہے کہ مریم کی شادی سجاد کے ساتھ ہو گی اور اس کے وطن واپس آنے میں اب دیر بھی کیا ہے۔"

"بہرحال اب بھی کیا ہرج ہو گیا ہے۔ میں فون پر اسے اپنے جواب سے آگاہ کر دوں گا۔"

"آپ کی یہی کوتاہ اندیشی مجھے سخت ناپسند ہے۔ بات کو لٹکائے رکھنا تو گویا آپ کا فرض ہے۔ آپ اسے مجھ سے بات کرنے کا کہتے تو میں اسے سمجھاتی بلکہ سبق دیتی کہ اسے ریاض محل تک آنے اور اتنا بڑا سوال کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔"

"صفیہ بیگم! آپ تو خوامخواہ ہی ناراض ہو رہی ہیں۔ یہ سب تو ہماری مرضی پر منحصر ہے۔ ہم نہ چاہیں تو کیا ہو سکتا ہے؟ آپ تسلی رکھیں ہم مناسب الفاظ میں اسے انکار کر دیں گے۔"

مریم کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ وہ تیز قدم اٹھاتی راہداری عبور کر کے اپنے کمرے تک آ گئی۔ چند قدموں کے اس فاصلے نے اسے تھکا دیا۔

کیا محسن چلے گئے تھے؟ انہوں نے بھائی جان سے بات کی تھی؟ کیا کہا تھا؟ ایسے کئی سوال اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

اچھا تو سجاد بخاری اب وطن واپس لوٹنے والے ہیں۔ اور بھابھی مجھے ان کی خوشیوں کی بھینٹ چڑھانے میں ذرا بھی تاخیر نہ کریں گی۔

سجاد احمد بخاری مریم کے تایا زاد بھائی تھے اور اس کی بھابھی صفیہ بیگم کے بھائی۔ خاندان میں ادلے بدلے کی شادی کا رواج تھا جس کے تحت ریاض بخاری اور مریم دونوں ہی تایا کے گھر سے منسوب تھے۔ باوجود اس کے کہ سجاد بخاری عمر میں مریم سے کافی بڑے تھے اور جب کہ مریم صرف مڈل پاس کرنے کے بعد نویں میں داخلہ لینے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ وہ پانچ سال پاکستان میں پریکٹس کرنے کے بعد یو۔کے چلے گئے تھے اسپشلائزیشن کے لیے۔ اور وہاں جاتے ہی ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ مریم کے بابا حضور نے سجاد کی اس حرکت پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔ اور باوجود اس کے کہ وہ ریاض احمد کی شادی بھابھی کے گھر کر چکے تھے۔ انہوں نے بھائی کے گھرانے سے سب تعلقات توڑ دیے تھے۔

صفیہ بیگم کو اجازت تھی کہ وہ جب چاہیں اپنے والدین کے گھر آ جا سکتی ہیں۔ بیٹی کے ٹھکرائے جانے کا انہیں بہت صدمہ تھا۔ پھر ریاض احمد بخاری نے انہیں سمجھایا۔ تسلی و تشفی دی۔ اور یہ جواب بھی پیش کیا کہ وہ کردار کے لحاظ سے سجاد کو مریم کے لیے پسند نہیں کرتے تھے۔ اچھا ہوا کہ سجاد نے شادی کر لی۔ مریم کے لیے خاندان میں رشتوں کی کمی نہیں۔

پھر بابا حضور بھی یہ دنیا چھوڑ گئے۔ مریم کے لیے ریاض احمد بخاری ایک سائبان کی صورت رہ گئے۔ گھر پر بھابھی جان کی حکمرانی کا دور آ گیا۔ ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ پورے دس سال، ان دس سالوں میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سجاد بخاری نے امریکی بیوی کو طلاق دے دی۔ اور دو بچوں کو پاکستان اپنے والدین کے پاس چھوڑ دیا۔ پھر واپس چلے گئے۔ مغرب کی چکا چوند زندگی میں کھوئے رہے۔ کئی لڑکیوں سے جی بہلایا، سہارے کے لیے ایک ہندوستانی لڑکی کو اپنایا۔ لیکن عادات و خصائل کے اختلاف کے سبب زیادہ دن نباہ نہ ہو سکا۔ اسے بھی چھوڑ دیا۔ اور آج وہ سن رہی تھی کہ اسے سجاد کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

جسم و جان عجیب پریشانی اور اضمحلال کا شکار ہو گئے۔ لیکن کسی سے کچھ کہنے سننے کا کوئی موقع نہ تھا۔ نہ وہ ایسا سوچ پا رہی تھی۔

اختر نے اس کو اندر آتا دیکھ لیا تھا۔ لپک کر پیچھے آئی اور مریم کو اوندھے منہ بستر پر پڑا روتے دیکھا تو گھبرا کر قریب آئی۔

''بی بی۔۔! مریم بی بی۔۔۔! کیا بات ہے کسی نے آپ سے کچھ کہا ہے؟'' مریم نے روتی آنکھوں سے دیکھا۔

''بی بی۔۔۔! آپ کی ایک امانت میرے پاس ہے۔ اگر آپ رونا بند کردیں گی تو میں آپ کو دوں گی۔'' اختر بے موقع بے سبب مسکرائی۔

''کیا ہے اختر۔ لاؤ دکھاؤ۔''

اختر نے دوپٹے کے آنچل سے ہاتھ سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

نرگس کے خوب صورت بے داغ پھولوں کا گچھا اختر کے ہاتھ میں تھا۔ اور ایک لفافہ بھی۔

''بی بی! جاتے وقت انہوں نے مجھے دی تھی یہ امانت۔ بے چارے، بہت پریشان تھے۔ بیگم صاحبہ خود انیکسی میں گئی تھیں۔ کتنی دیر وہیں رہیں۔ جانے کیا بات تھی۔'' مریم کے لیے ساری خبریں حیران کن تھیں، تو شاید اسی لیے بھابھی جان نے آج کا فنکشن چھوڑ دیا۔

اس نے نرگس کے پھول سرہانے رکھ دیے۔ اور تہ شدہ ورق کھول کر پڑھنے لگی۔

''عزیز از جان مریم!

ایک کے بعد ایک کر کے سارے سہارے شاید اسی طرح چھوٹتے ہیں۔ میں آپ کے در پر بڑی امیدیں لے کر آیا تھا۔ یہ علم نہ تھا کہ آپ کے دامن میں جو کچھ تھا آپ وہ اپنی خوشی سے کسی اور کے لیے محفوظ کر چکی ہیں۔ کوئی منزل نہیں، نہ راستوں کے نشان ہیں پھر بھی زندگی کا سفر جاری رہے گا۔ دعا گو رہوں گا کہ خدا آپ کو ساری کی ساری خوشیاں عطا فرمائے۔

گھر والوں سے ناتا توڑ لیا ہے تو وہاں لوٹ کر نہ جاؤں گا۔ جانے کہاں ٹھکانہ ہوگا۔ لیکن دل خانہ خراب کی وحشتیں شاید کہیں بھی سکون سے رہنے نہ دیں۔ ان آنکھوں کو شاید ہمیشہ آپ کے دیدار کی طلب رہے۔ میں شاید ساری عمر انتظار میں مبتلا رہوں۔ ویسے گردشِ زمانہ نے فرصت دی تو کسی دن روبرو آ کر یہ ضرور پوچھوں گا کہ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے مجھے اپنی شخصیت کے طلسم میں جکڑ کر کہیں کا نہ چھوڑا۔ غیر محسوس انداز میں میرے دل میں اتر گئیں۔ خواب میری آنکھوں میں بسا دیے، حسین رنگوں، خوشبوؤں اور رنگا رنگ گلابوں کے خواب، مجھے دیوانہ بنا دیا اور خود دامن چھڑا گئیں آخر کیوں؟ مریم! درحقیقت مجھے آپ سے اس دھوکے بازی کی امید نہ تھی۔ بہرحال زندگی کا سفر بہرطور کٹے گا لیکن یقین ہے کہ تنہا ہی بنا کسی ہم سفر کے۔''

مریم حیران تھی یہ کیسے شکوے تھے جو آپ ہی آپ محسن کو اس کی ذات سے پیدا ہو گئے تھے۔ اس نے کیسی بے وفائی کی۔ کیسا دھوکا دیا۔ نرگس کے پھول آنکھوں سے لگا کر وہ پھر رو دی۔

''کیا لکھا ہے بی بی؟''

''کچھ نہیں اختر، کچھ بھی نہیں، تم مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

''بی بی! آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں۔ مگر میں جانتی ہوں وہ خفا ہو کر گئے ہیں یہاں سے۔ بیگم صاحبہ کی اور ان کی ساری گفتگو میں نے سن لی تھی۔''

''اچھا۔۔۔''

''ہاں بی بی۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ آپ سجاد میاں کو پسند کرتی ہیں اور ان کے واپس آنے پر شادی ہو جائے گی آپ کی۔''

''اُف۔۔۔میں انہیں پسند کرتی ہوں۔''مریم نے حیران ہو کر اختر کو دیکھا۔

''بی بی۔۔۔!وہ بہت اچھے ہیں۔انتہائی سچے اور کھرے نوجوان۔انہوں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ وہ آپ کو بہ دل و جان چاہتے ہیں اور عمر بھر کے لیے آپ کو شریکِ زندگی بنانا چاہتے ہیں آپ کی خاطر انہوں نے والدین سے ٹکر لی اور جب وہ نہ مانے تو گھر چھوڑ دیا۔

لیکن بیگم صاحبہ نے ایک نہ سنی بلکہ سخت لہجے میں تنبیہ کی کہ آئندہ وہ ایسا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔لڑکیوں کو آزادی مل جائے تو ایسی نادانیاں وہ قدم قدم پر کرتی ہیں۔اور سرپرست ہر غلطی کو فیصلہ تو نہیں مان سکتے۔اس صورت میں جبکہ والدین نے انہیں عاق کر دیا ہے۔انہوں نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی۔اور یہ کہ آئندہ وہ ہرگز انہیں یہاں برداشت نہیں کریں گی۔''

''اوہ۔۔۔اختر۔۔۔!یہ کیا ہوا؟یہ سب کیسے ہوا؟''

''جب وہ جا رہے تھے تو میں ان کے جانے سے پہلے ہی بازار کے بہانے محل سے نکل گئی۔نشیب کی طرف جانے سے پہلے ہی میں نے انہیں روک لیا۔وہ سخت آزردہ تھے،بے حد پریشان تھے،بی بی جب میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا تو سمجھ گئی تھی سب کچھ۔بس اسی لیے ہمت کر کے چلی گئی۔وہ گاڑی سے اترے اور چشمے کے قریب کافی دیر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔یہ نرگس کے پھول انہوں نے وہیں دیے تھے اور ایک پیغام بھی۔''زندگی کے ایک ایک لمحے میرا انتظار کرنا۔''

مریم چپ چاپ بیٹھی تھی۔اس کی آنکھیں اب بھی نیر بہا رہی تھیں۔

''اختر۔۔۔!تم میری بہن ہو میری غمگسار ہو اختر۔''

''نہیں بی بی یہ بندی تو آپ کی خادم ہے کنیز ہے۔آپ کی وفادار ہے۔''

''اختر۔۔۔!تم نے انہیں کیا کہا۔''

''وہ کچھ جو شاید آپ بھی نہ کہہ پاتیں۔میں نے انہیں ساری حقیقت بتا دی۔یہ بھی بتا دیا کہ آپ کے بابا حضور نے صرف سجاد میاں سے دور رکھنے اور بچانے کی خاطر آپ کو ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔وہ ہرگز تیار نہ تھے اس بات پر کہ آپ کی شادی سجاد میاں سے ہو۔''

اختر کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

''مریم بی بی انہوں نے میرے سامنے عہد کیا کہ آپ کی شادی اُن کے سوا کسی سے نہیں ہو سکتی۔وہ ہر قیمت پر آپ کو حاصل کریں گے۔''

مریم کے اندر پھر بھی اطمینان و سکون نہ اُتر سکا۔

''جب تم نے ان سے ملاقات کی تو پھر وہ خط مجھے کیوں دیا۔''

''اُن ہی کا حکم تھا بی بی۔کہ پہلے یہ خط اُسے دینا۔اور خط پڑھ کر اگر وہ پریشان ہو جائے تو میرا پیغام دے دینا۔''

مریم مسکرا پڑی۔ یہ بات محسن نے اُسی انداز میں کی تھی۔ پرانے انداز میں۔

❁❁❁❁

دن گزرتے رہے۔ انتظار جوان رہا۔ دید کی طلب دل میں اُسی طرح قائم رہی لیکن آنکھیں ایسا کوئی نظارہ نہ پاسکیں۔ روزانہ وہ دامن کوہ میں آفاق اور اختر کے ساتھ جاتی۔ روزانہ ہی محسن کی آمد کی آس لگائے نظریں راستے پر جمائے رہتی لیکن وہ کہیں سے آتے دکھائی نہ دیتے۔ ایسی ہی ایک شام سجاد نقوی کی گاڑی ان کے قریب آکر رک گئی۔ بہترین تراش کے خوب صورت سوٹ میں ملبوس آنکھوں میں رتجگوں کے آثار لیے سجاد بخاری نے مریم کی طرف دیکھا تو مریم کے دل سے خوف اور سہم کی لہریں اٹھیں اور پورے جسم میں پھیل گئی۔

''ہیلو مریم!'' انہوں نے گاڑی کا دروازہ اس کے لیے کھولا۔

''آپ کب آئے۔'' خوف کی ابھرتی ڈوبتی لہروں کے درمیان اس نے پوچھا۔

''کل ہی پہنچا اور آتے ہی آپ کی طرف چلا آیا۔ مبارک ہو کہ آپ ڈاکٹر ہوگئیں۔''

''شکریہ۔''

آفاق حیرت سے انہیں تک رہا تھا۔

''پھپھو کیا یہ بھی آپ کے کلاس فیلو ہیں۔'' اُس نے اپنی دانست میں کھوج لگایا۔

''نہیں آفاقی یہ آپ کے ماموں ہیں۔'' سجاد نے آفاق کا بازو تھام کر اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔

مریم اور اختر بھی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

سجاد بخاری کے آنے سے ریاض محل میں ہلچل سی مچ گئی۔ صفیہ بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ریاض احمد بخاری اپنے عم زاد کی آمد پر اُن کے آگے بچھے جارہے تھے۔ دو کمرے فوری طور پر ان کے لیے مکمل آراستہ کیے گئے۔ رات کے کھانے پر زبردست اہتمام ہوا۔ محل میں موجود تمام رشتہ دار آج کھانے کی میز پر موجود تھے۔ مریم ریاض احمد کے بائیں طرف خاموش سی بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ سجاد بخاری کھانے کے ساتھ اہل محفل کو باتوں سے بھی محظوظ کررہے تھے۔ ریاض احمد ہر بات پر قہقہہ لگا کر دلی خوشیوں کا اظہار کررہے تھے۔ صفیہ بیگم فخر سے بار بار بھائی کی طرف دیکھتیں۔ اور پھر مریم پر نظر ڈالتیں۔

باتوں ہی باتوں میں اس ہسپتال کا ذکر بھی آگیا۔ جس کی تعمیر پر ریاض احمد زر کثیر خرچ کررہے تھے۔

''سجاد بھائی! بس آپ کی ڈاکٹری اور سرجری جوہر آباد کے عوام کے کام آئے تو بہتر ہے آپ ہاسپٹل کا نظام سنبھال لیجیے۔''

''ہاں سجاد بھائی! مریم بھی خیر سے ڈاکٹر ہے۔ ہاؤس جاب سے ہم نے روک لیا تھا۔ آپ دونوں مل کر ہمارا ہاسپٹل سنبھال لیں۔ اس سے بڑی خوشی میرے لیے کیا ہوگی۔ ویسے اتنی طویل جدائی کے بعد تو دل چاہتا ہے ایک پل بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں۔'' صفیہ بیگم نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''نہیں صفو! آئی ایم ساری۔۔۔ میں امریکا کی اتنی اچھی جاب کس طرح چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے تو

دو ماہ بعد واپس جانا ہے۔ میں صرف عباس اور شیری کی خاطر آیا ہوں۔''

''خیر ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔ چلیے اب آپ اکیلے آئے ہیں واپسی میں تین اور ہستیاں آپ کی شریکِ سفر ہوں گی۔''

سجاد بخاری نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ مریم نے صفیہ بیگم کی طرف دیکھا جو اس لمحے مریم کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

یہ واضح اشارے تھے جو چیخ چیخ کر مریم کو مطلع کر رہے تھے۔ رات کے لمحے اسی سوچ کی نذر ہو گئے۔ دوسرا دن طلوع ہوا، وہ ناشتے پر بے دلی سے شریک ہوئی۔ پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات درو بام پر اتر آئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں محفل جمی تھی۔ سب لوگ ہنس بول رہے تھے۔ لیکن مریم اپنے کمرے میں تھی۔

رات کا لباس بہت جلد بدل کر وہ ڈریسنگ روم سے باہر آئی تو صفیہ بیگم اس کے بیڈ کے قریب کوچ پر نیم دراز تھیں۔ اسے دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھیں۔

''خیر تو ہے مریم۔ آج تم ڈرائنگ روم میں نہیں آئیں۔ سجاد بھائی بار بار تمہیں پوچھ رہے تھے۔''

''میری طبیعت کچھ ناساز تھی۔''

''میرا خیال ہے سجاد بھائی سے زیادہ قابل ڈاکٹر یہاں کہیں نہیں ہوں گے۔ تمہاری طبیعت تو شاید ان کی باتوں سے ہی ٹھیک ہو جاتی۔'' وہ مسکرائیں۔

مریم چپ رہی۔

''ہاں مریم! اصل میں میں تم سے کہنے آئی تھی کہ کل علی الصبح ہمیں لاہور جانا ہے۔ سجاد بھائی تمہارے لیے بہت کچھ اپنی پسند سے امریکا سے ہی لے آئے ہیں۔ کچھ خریداری وہ تمہاری پسند پر یہیں سے کرنا چاہتے ہیں۔''

''مگر کیوں بھابھی جان؟ صرف میرے لیے کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ ان کا خاص رشتہ جو تم سے جڑنے والا ہے۔''

''مگر میں تو اس معاملے سے بالکل بے خبر ہوں۔''

''بے خبر کیوں؟ میرا خیال ہے کہ تم بچپن سے ہی اپنی نسبت سے آگاہ ہو۔ وہ تو چچا حضور کی ضد میں یہ رشتہ اس وقت طے نہ ہو سکا۔ لیکن تم جانتی ہو۔ تمہارا بیاہ کسی صورت سجاد بھائی کے علاوہ کسی اور سے نہیں ہو سکتا۔''

''آپ حالات کو غلط طریقے پر بیان کر رہی ہیں بھابھی جان۔ بابا حضور ہمیشہ سے اس رشتے سے نالاں تھے۔ سجاد صاحب کا کردار ہمیشہ ان کی نگاہ میں رہا۔ جس کی بنا پر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ رہ گئی اب کی بات تو۔ بھلا میری مرضی کے بغیر یہ سب فیصلے بالا بالا کس طرح ہو سکتے ہیں۔ میں ایک باشعور لڑکی ہوں اور اپنا اچھا برا سب خوب سمجھتی ہوں۔''

''خیر ضرور ایسا ہو گا۔ لیکن تمہیں خبر ہے اس وقت اس دنیا میں سب سے زیادہ قریبی رشتہ ریاض کے سوا کسی کا نہیں۔ وہ تمہارے بھائی اور سرپرست ہیں اور تم کس حد تک ان کی رائے کا احترام کرتی ہو۔

یہ مسئلہ بھی ان ہی کا ہے۔''

''رائے کا احترام پوری زندگی کے معاملے میں، میں صرف اپنے دل کا کروں گی۔ بھائی جان سے زیادہ مجھے نہ کوئی عزیز ہے نہ کسی کا احترام مجھے مطلوب ہے۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ میری مرضی کے خلاف اپنا کوئی بھی فیصلہ مجھ پر صادر نہیں کریں گے۔'' مریم نے آج بڑی جرأت اور ہم سے اتنا کچھ کہہ دیا تھا۔ صفیہ بیگم نے حیران ہو کر مریم کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بڑے معنی خیز انداز میں مریم ہو مخاطب کیا۔

''مریم! میں نے آج تک اس معاملے میں تم سے کوئی بات نہیں کی۔ لیکن آج تمہیں بتانا ناگزیر ہو گیا۔ تمہارے دل کی رائے سے میں آگاہ ہوں۔ وہ دو ٹکے کا چھوکرا جس کے خاندان کا بھی کچھ پتا نہ تھا۔ تمہارے ایما پر تمہیں ہم سے مانگنے آیا تھا۔ ہم بھلا کیونکر تمہارا ہاتھ اسے تھما دیتے۔ میں نے اس کی روانگی کے وقت اسے سب کچھ بہت اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ اور اگر تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ وہ دوبارہ یہاں آئے گا۔ اور ریاض اسے اپنے دامن میں پناہ دے دیں گے، تو یہ صرف ایک خواب ہے جس کی تعبیر مایوسی کے سوا کچھ نہیں۔ تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ تم بخوشی سجاد بھائی کے سنگ رخصت ہو جاؤ۔ کیا نہیں ہے ان کے پاس۔ خاندانیت، دولت، جاہ و حشمت، عہدہ، تعلیم، آخر کس چیز کی کمی ہے؟ رہ گئیں ان کی شادیاں تو اگر چچا حضور ان سے زیادتی نہ کرتے تو وہ ایسا قدم بھی نہ اٹھاتے۔ بہر حال اب بھی کیا بگڑا ہے۔ تم ان کی عم زاد ہو۔ خاندانی عورت کی عزت اور وقار کی اور بات ہوتی ہے۔''

''لیکن بھابھی جان! مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی کسی خوبی سے مرعوب ہوں نہ متاثر۔ عورت کو سب سے پہلے خلوص اور ایثار کی ضرورت ہوتی ہے۔ وفا کی طلب ہوتی ہے۔ یہ باقی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں سدا ایک محرومی کے احساس کا شکار نہیں رہنا چاہتی۔ میں ان کے بارے میں ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے تمہارے بھائی جان نے بھیجا تھا۔ میں یہ جواب اُن تک پہنچا دوں گی۔'' وہ اٹھیں اور مزید کچھ کہے بغیر باہر چلی گئیں۔

❁❁❁❁

''مریم۔۔۔!'' ریاض احمد کی گونج دار آواز نے مریم کا دل دہلا دیا۔ وہ سہمی ہوئی چند قدم آگے بڑھی اور رک گئی۔

''ہم نے سنا ہے کہ تم نے لاہور جانے سے انکار کر دیا ہے۔''

''جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ بھائی جان۔''

''اس کا کوئی سبب؟'' ریاض احمد بخاری سخت غصے میں تھے۔ مریم نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

''بھائی جان! کیا یہ آپ کا فیصلہ ہے۔ یہ آپ کا حکم ہے۔''

''بالکل۔''

''جبکہ آپ کو علم ہے بابا حضور۔۔۔''

''ریاض احمد بخاری نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہر وقت اور زمانے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں مریم۔ ہم سجاد بھائی سے تمہاری شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہ ہم سب کی خواہش ہے۔ اور بہن ہونے کے ناتے تم اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتیں۔''

''بھائی جان۔۔۔!''

''ہم جانتے ہیں تمہارے دل کی بات۔ تمہارا جذباتی فیصلہ تمہاری تعلیم کا سلسلہ بابا حضور کی خواہش پر شروع ہوا تھا۔ آج اگر وہ بھی بقید حیات ہوتے تو وہ بھی یہ گوارا نہ کرتے کہ ایک غیر خاندان کے اکیلے وکیلے لڑکے کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ دے دیتے۔ ہماری اپنی روایات ہیں۔ تم ہماری اکلوتی بہن ہو۔ جو ہر آباد کے ہر شخص کی نظریں اسی طرف لگی ہیں کہ ہم خاندانی روایات کا کس حد تک پاس کرتے ہیں۔ ہماری نظر میں سجاد بھائی سے بہتر کوئی شخص تمہاری رفاقت کے لائق نہیں ہے۔''

ریاض احمد نے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔ ان کے لب و لہجے نے احتجاج کی قوتیں چھین لیں۔ اور مریم کا سر جھک گیا۔

لاہور جانے کی تیاری اُس نے یوں کی جیسے کوئی مقتل گاہ کی طرف جانے کے لیے تیار ہو۔ صفیہ بیگم اور اختر بھی شریکِ سفر تھیں۔ صفیہ بیگم بڑی شان سے بھائی کے ساتھ رونق افروز تھیں۔ اور مریم اختر کے ساتھ پیچھے بیٹھی تھی۔ دوڑتی گاڑی میں بیٹھی وہ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان معلق ہو کر نیم جاں ہوئی جا رہی تھی۔

ایک دن سفر کی تکان میں گزر گیا۔ دوسرے دن صبح ناشتے پر صفیہ بیگم نے ہدایات جاری کیں۔ آج مریم کو سجاد کے ساتھ بازار جانا تھا۔ نو بجے وہ کسی معمول کی طرح تیار ہو کر باہر آ گئی تھی۔ اور ڈرائیور نے اسے دیکھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا۔ جب سجاد بھی برآمدے میں آتے نظر آئے۔

انہوں نے کیا کیا خریدا اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ وہ بے دلی سے ہوں ہاں میں گویا پسند کا اظہار کر رہی تھی۔ جیولرز کی بڑی ساری دکان پر زیورات کی خریداری میں مصروف سجاد سیلز مین سے محوِ گفتگو تھے۔ جب اچانک مریم کی نظر اپنے سے سات آٹھ فٹ دور کھڑے محسن رضا پر پڑی اور اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''محسن۔۔۔!'' وہ زیرِ لب بڑبڑا کر رہ گئی اس اثنا میں محسن بھی اُسے دیکھ چکے تھے۔ کئی رنگ اُن کے چہرے پر آئے اور گزر گئے۔ مریم کا جی چاہا بھاگ کر اُن کے قریب جائے ان سے بیگانگی کی وجہ اسی جگہ کھڑے کھڑے ہی پوچھ لے، ان کی مدد طلب کرے۔ ان سے پناہ مانگے۔ لیکن محسن کی نگاہوں میں یکا یک سما جانے والی اجنبیت نے اس کے قدم ساکت کر دیے۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ ضبط کے پہرے دل و نگاہ پر بٹھائے خود کو بیگانگی کے حوالے کر دینا خاصا کٹھن تھا۔ بس اسی طرح جیسے کڑی دھوپ میں سایۂ دیوار کی طرف بھاگنے کی قوت رکھتے ہوئے آدمی نہ جا سکے۔ بس ایسے ہی جیسے ٹھنڈے پانی کا پیالہ لبوں سے لگانے کے باوجود اس کے پینے پر قادر نہ ہو۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بھی وہ بار بار مڑ کر دیکھتی رہی۔ لیکن محسن رضا دوبارہ نظر نہ آئے۔ رہائش

گاہ تک آتے آتے اس کی تمام قوتیں جواب دے گئیں۔ ڈرائیور نے جونہی گاڑی روکی وہ ایک دم باہر نکلی اور کسی کا انتظار کیے بغیر اندر چلی گئی۔

''آپ میرے سامنے آ کر مجھے ایک اور امتحان میں مبتلا نہ کرتے۔ آپ میرے لیے کچھ بھی نہیں ہیں۔ میں آپ کو بھول جانے کی دعا کرتی ہوں۔ مجھے زندگی اسی طرح گزارنا ہے، جیسے بھائی جان چاہتے ہیں، میں آئندہ کبھی اس شہر میں قدم نہ رکھوں گی جہاں آپ ہیں۔ تاکہ کوئی یاد میرا دامن نہ تھام لے۔ مجھے مڑ کر آپ کی طرف جانے پر مجبور نہ کرے۔''

بے معنی سوچیں اس کا دامن تھامے رہیں۔ یہاں تک کہ صفیہ بیگم نے اسے بلوا بھیجا۔ وہیں سجاد بھی موجود تھے۔ سگار کے طویل کش لیتے وہ خاموش بیٹھے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ اور صفیہ بیگم خریدی ہوئی اشیاء پر تعریفی و تنقیدی تبصرہ کر رہی تھیں۔ تمام اشیاء دیکھنے کے بعد ایک طرف رکھ دی گئیں۔ تبھی صفیہ بیگم بولیں۔

''اختر آ گئی ہو تو چائے بنوا لو مریم۔ سر میں کچھ درد سا ہو رہا ہے۔''

''کیوں اختر کہاں گئی تھی؟'' مریم نے پوچھا۔

''یہیں قریب ہی کے گھر میں۔ میری دوست بیگم افضل کے ہاں۔''

''میں دیکھتی ہوں۔'' مریم اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ابھی وہ خواب گاہ سے چند قدم آگے گئی تھی کہ اس نے بدحواسی سی اختر کو اپنے کمرے سے نکلتے دیکھا۔

''مریم بی بی۔۔۔! مریم بی بی!'' اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ مریم گھبرا گئی۔

''کیا بات ہے؟''

''ادھر کمرے میں آیئے۔'' مریم اس کے کہنے پر اپنے کمرے کی طرف چلی۔

''ہاں بتاؤ نا اختر تم نے تو مجھے پریشان کر دیا۔''

''بی بی وہ مجھے ملے تھے۔''

''کون؟'' مریم کا دل دھڑک دھڑک گیا۔ کہیں وہی تو نہیں کہ دل کو جس کی آہٹ کی آس ہر دم رہتی ہے۔

''بی بی وہ ڈاکٹر محسن رضا۔''

''کہاں۔۔۔؟'' وہ پریشان ہو گئی۔

''گھر کے باہر سڑک پر ہی۔۔۔ میں تو انہیں دیکھ کر گھبرا گئی۔ اگر کہیں سجاد میاں انہیں دیکھ لیتے۔۔۔ یا بیگم صاحبہ تو کیا ہوتا۔''

''کیوں آئے تھے وہ یہاں؟'' مریم نے بے محل سا سوال کیا۔

''وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''نہیں اختر نہیں۔ تم نے ان سے کہہ دیا ہوتا، انہیں بتا دیا ہوتا۔ میں اُن سے کبھی نہیں مل سکتی۔''

مریم آبدیدہ ہو گئی۔

''وہ بہت پریشان تھے بی بی۔ بے حد دل گرفتہ۔ وہ تو بس وہیں کھڑے رہنے پر مصر تھے۔ میں

نے اُن سے وعدہ کیا کہ شام کو میں بی بی کو سیر کے لیے باہر لے آؤں گی آپ مل لیجیے گا۔ مریم بی بی! مجھ سے ان کی بے چینی دیکھی نہ جا رہی تھی۔ بس انہوں نے میرے آگے ہاتھ نہیں جوڑے۔ وہ آپ سے بہت ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''اچھا تم جاؤ اختر۔ بھابھی جان چائے کا کہہ رہی تھیں۔''

مریم آرام کرسی پر گر سی گئی۔ اس کی قلبی کیفیات بڑی عجیب سی تھیں۔ پل سے بھی قبل اڑ کر محسن تک پہنچنے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن عقل کی ہر دلیل دل کی خواہشات کو کچل کر نئے سفر کی طرف جانے کی سفارش کر رہی تھی۔ کیا کرتی وہ، سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

شام کو وہ اختر کے ہمراہ باہر جا رہی تھی۔ سجاد بخاری کسی دوست سے ملنے گئے تھے اور صفیہ بیگم مسز افضل کے ساتھ محوِ گفتگو تھیں۔

❁❁❁❁

''مریم میں تمہاری خاطر پورے جہان سے ناتا توڑ چکا ہوں۔ میں نے زندگی تم سنگ گزارنے کا عہد کیا ہے۔ تم نہیں تو پھر کوئی بھی اس زندگی میں نہیں آئے گا۔ میری وفا کو یوں نہ ٹھکراؤ مریم۔ زندگی چار دنوں کا کھیل تو نہیں ایک طویل کٹھن سفر ہے۔ جہاں قدم قدم پر ایک مخلص اور ہمدرد شریکِ حیات کی ضرورت ہے۔ میں تمہارے سوا کسی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر سکتا۔ میں مردہ زندگی نہیں چاہتا۔ مجھے تمہاری طلب ہے مریم۔ میں تمہیں زمانے سے ٹکرا کر چھین لینے کی ہمت رکھتا ہوں۔ خدارا مریم! میرے اعتماد کو کرچی کرچی نہ کرو۔ بولو تم سجاد بخاری کی زندگی میں جا کر چین پا سکتی ہو۔ وہ ہرگز تمہارے لائق نہیں ہے۔ وہ ایک عیاش مرد جس کی زندگی دھوکا کھانے اور دھوکا دینے پر مشتمل ہے تمہارا شریکِ حیات نہیں بن سکتا۔ خود کو جاہلانہ رسم و رواج کے حوالے نہ کرو مریم۔''

''محسن۔۔۔! یہ بھائی کی رضا ہے ان کی خوشنودی ہے۔''

''نہیں یہ ظلم اور حق تلفی ہے۔ اور تم ایک باشعور لڑکی ہو اپنے اچھے برے کی پہچان رکھو۔''

''کچھ چیزیں آدمی کو اپنے آپ سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہیں محسن۔''

''کیا مجھ سے بھی زیادہ کوئی اور چیز عزیز ہے مریم بخاری۔'' مریم اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''مریم! تمہاری خاطر میں نے ایک زمانے سے ٹکر لی ہے۔ تم میری انا کی مانگ بھی بن گئی ہو۔ میں اُن کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ کہ میں تمہیں پانے میں ناکام رہا ہوں۔ نہیں مریم۔ میں اتنا عرصہ تم سے غافل رہا اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں تمہیں بھول گیا۔ ہاؤس جاب کی۔ ملازمت حاصل کی۔ گھر سنوارا۔ تمہارے رہنے کے قابل بنانے کی کوشش کی۔ تمہارے استقبال کے ضروری لوازمات خریدے۔ اور اب تم تک پہنچنے کی سعی کرنے لگا تھا کہ تم خود یہاں آ گئیں۔ مریم تمہاری بھابھی صاحبہ نے میری جو توہین کی تھی۔ اس کا احساس مجھے ریاض محل کے اندر کبھی قدم نہیں رکھنے دے گا۔ لیکن تمہاری خاطر میں جو ہر آباد ہزار بار آ سکتا ہوں۔ بولو مریم۔ تم نے کیا فیصلہ کیا۔ کیا سوچا۔''

''محسن پلیز محسن! مجھے ایسا قدم اٹھانے کی ترغیب نہ دیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں بھائی جان کو کوئی دکھ دینا نہیں چاہتی۔''

''بھائی جان کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ صرف اپنی بیوی کی خوشنودی کی خاطر تمہیں ایک نااہل شخص کے حوالے کر دیں۔ زندگی ایک بار ملتی ہے مریم۔ اس کی رعنائیوں پر انسان کا پورا حق ہے پھر میں تمہیں کوئی غلط راستہ تو نہیں دکھا رہا۔ کل ہی تم سے شادی کر سکتا ہوں۔ تم ایک بار یہ ہاتھ تھام تو لو مریم۔ مریم میں دل و ذہن دونوں کے ہاتھوں سخت مجبور ہوں۔ تمہاری صورت دل میں بسا کر، تمہاری سوچوں میں کھو کر، اور پھر تم سے دور رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ بہت تنہا ہوں مریم مجھے آباد کر دو۔ میرے دل کا مکان تمہارے قبضے میں ہے۔ میرا گھر تمہارا منتظر ہے۔ آؤ مریم۔ آؤ اسے اپنے وجود کی روشنی بخش دو۔ میں عمر بھر تمہاری محبت کا یہ احسان نہ بھولوں گا۔''

محسن رضا جذباتی سے ہو گئے۔ ان کا گلوگیر لہجہ مریم کے دل میں اتر گیا۔ زندگی لمحے بھر میں اسے بہت عزیز ہو گئی۔ اس نے ہامی بھر لی۔ محسن کا ہاتھ شاید زندگی میں پہلی بار تھاما اور کبھی نہ چھوڑنے کے لیے۔

❁❁❁❁

دوسرے دن اس نے نہایت اطمینان سے صفیہ بیگم سے بازار جانے کی اجازت طلب کی اور اختر کے ساتھ چلی آئی محسن کے دوستوں کی موجودگی میں نکاح ہو گیا۔ اور دو چار گھنٹوں میں وہ گھر لوٹ آئی۔ جملہ حقوق محسن رضا کے نام کر کے اس کے دل کو کوئی بے سکونی اور اضطراب محسوس نہ ہوا۔

پندرہ دن میں ہی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ صفیہ بیگم نے دھوم دھام سے مریم کو رخصت کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور جس دن شام کو بارات آنے والی تھی۔ اسی صبح محسن رضا آدھمکے۔ چند ذمہ دار افسران سمیت۔ اور آتے ہی مریم کی رخصتی کا مطالبہ کر دیا۔ ریاض احمد بخاری ایس۔ پی علی حسین اور مجسٹریٹ صغیر احمد مرزا کی موجودگی میں ہکا بکا کھڑے ان کا منہ دیکھ رہے تھے۔

''یہ سب ایک بہتان ہے علی حسین صاحب۔ مجھے بدنام کرنے کی ایک سازش ہے۔''

''یہ حقیقت ہے ریاض احمد بخاری صاحب وہ میری منکوحہ ہے۔'' محسن رضا نے نکاح نامہ ان کے آگے کر دیا۔

ریاض احمد بخاری کی غیرت و حمیت پر کاری ضرب تھا۔ وہ نکاح نامہ جس پر واقعی ان کی ہمشیرہ مریم بخاری کے دستخط اس کی رضامندی کی صورت درج و ثبت تھے۔ وہ غم و غصے سے سرتاپا کانپ اٹھے۔ اندر گئے۔ مریم سے باز پرس کی۔ جواب مثبت پا کر اسی وقت چار کپڑوں میں اسے باہر لے آئے۔ اور ان افراد کے سامنے اُسے محسن رضا کے حوالے کر دیا۔ دروازے تک آ کر کڑے لفظوں میں ہمیشہ کے لیے اس سے ہر قسم کا ناتا توڑ لینے کا اعلان کیا۔ اور چلے گئے۔

ریاض محل میں ایک طوفان سا آ گیا۔ تباہی مچ گئی۔ ریاض احمد بخاری اپنے بیڈ روم میں بند ہو کر رہ گئے۔ سجاد بخاری اور ان کے گھر والے ٹیلی فون پر اس سانحے کی خبر سن کر شادی کے پروگرام ملتوی کر کے دوڑے چلے آئے۔

نئی زندگی کی ابتدا روتی آنکھوں اور سہمے ہوئے دل کے ساتھ ہوئی۔ مریم محسن کی محبت میں اتنا بڑا قدم اٹھا کر چین ہرگز نہ پا سکی۔ ریاض محل اور اس میں رہنے والے ریاض احمد بخاری ہر دم اس کے

اعصاب پر سوار رہے۔ جنہیں وہ بہت بڑا دکھ دے آئی تھی۔ محسن رضا کی محبت کی تابانیاں اسے سنبھالا نہ دے سکیں۔ اس کے تصور میں سدا اپنے بھائی کا چہرہ رہا۔ جس پر وقت رخصت عجیب وغریب احساسات تھے۔ مریم نے ان کے اعتماد کو ریزہ ریزہ کیا تھا۔ وہ ٹوٹ سی گئی تھی۔ بکھرنے لگی تھی۔ لیکن محسن کو کوئی ملال نہ تھا۔ وہ رسم ورواج کے نہیں صحیح انسانی اقدار کے قائل تھے۔ سخت نفرت تھی انہیں جھوٹے رواجوں اور رواجوں کی چکی میں مظلوم بن کر پستے لوگوں سے۔ مریم کو بھی وہ کامل دیکھنا چاہتے تھے ہنسی مسکراتی پرسکون شریکِ حیات کی صورت میں۔ ان کی شادی کی خبر ان کے اہل خانہ تک بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ علی الاعلان اسی معاشرے میں اپنے اہل خانہ سے بہت نزدیک رہ رہے تھے۔ اکثر بازاروں میں تفریح گاہوں میں، سڑکوں پر آتے جاتے کبھی مریم کی ہمراہی میں اور کبھی تنہا ان کا سامنا گھر کے مختلف افراد سے ہو جاتا لیکن وہ ذرّہ برابر نوٹس نہ لیتے۔ وہ اپنی خواہشات کو جائز اور مریم کو اپنا حق تصور کرتے تھے۔ اور اسے پا کر بے حد پرسکون تھے۔

رفتہ رفتہ انہوں نے مریم کو اپنے رنگ میں ڈھال لیا۔ اب مریم کو بھی ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ کولیگ ڈاکٹرز کے ہاں آنا جانا جن میں اکثر ان کے کلاس فیلو ہی تھے۔ مریم کی خواہش تھی کہ وہ سروس کرے، لیکن محسن اسے صرف ہاؤس وائف دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک اچھی بیوی جو آئندہ ان کے بچوں کی بہترین ماں ثابت ہو سکے۔

ان کے شب وروز مریم کے لیے تھے۔ مریم کو وہ کسی بہت ہی قیمتی شے کی طرح عمر بھر سنبھال کر رکھنا چاہتے تھے انہیں اس قربانی کا بے حد احساس تھا۔ جو مریم نے ان کی محبت کی خاطر دے ڈالی تھی۔ وہ زندگی بھر اسے کسی اور غم سے آشنا نہ کرنے کا عہد کر چکے تھے۔ اور اپنی کوششوں میں کافی حد تک کامیاب بھی تھے۔

وقت کے ساتھ حالات کی تبدیلی اکثر ناگزیر ہی ہوتی ہے کہ یکسانیت موت کا دوسرا نام ہے۔

شادی کو ایک سال ہوئے دو چار دن ہی گزرے تھے، اس دن وہ مختلف سامان سے لدے پھندے مریم کو پکارتے گھر میں داخل ہوئے تو ان کے قدم ڈرائنگ روم کے دروازے میں ہی رک گئے۔ پورا خاندان ان کے گھر میں موجود تھا۔ سوائے رضا علی نقوی ان کے بابا جان کے۔ اور مریم مسکراتے چہرے کے ساتھ ان سب میں گھری بیٹھی تھی۔ احسن رضا کے جڑواں بچے شیر دل اور سونیا اس کی گود میں تھے۔ جنہیں وہ پیار کر رہی تھی۔ جدائی کو ڈھائی سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ عالیہ بھاگ کر ان کے گلے لگی۔ احسن رضا سے وہ خود آ ملے۔ بھابھی نے انہیں لپٹا لیا۔ شہریار بھی انہیں پہچان چکا تھا۔ ٹانگوں سے آلپٹا۔ اور آخر میں وہ عابدہ خانم کے پاس آ گئے پیاسی ممتا نے جی بھر کے سیراب ہونا چاہا تو محسن بھی ماں کے قدموں میں گر کر رونے لگے۔

''میرے ضدی بیٹے۔ ہم سب تمہاری ضد کے آگے ہار گئے۔'' انہوں نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

''گھر چلو محسن۔ بابا جان آن کی خاطر زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں وہ اپنے لاڈلے رضی کے لیے بے حد اداس ومضطرب ہیں۔'' احسن رضا نے سنجیدگی سے کہا۔

''محسن دیکھو انکار نہیں کرنا۔ سنا ہے بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔'' عالیہ نے اسی پرانے انداز میں کہا۔

محسن گم صم بیٹھے اپنی انگلیوں سے کھیل رہے تھے۔ جانے کن سوچوں میں گم تھے اور اشک دامن بھگوئے جا رہے تھے۔

''محسن! ہم تو مریم کو لے کر جانے والے تھے اگر تم نہ آتے۔''

''نہیں بھابھی! مریم میری مرضی کے خلاف وہاں کیسے جا سکتی تھی۔ وہ میری ہر بات سے بخوبی آگاہ ہے۔''

''تو وہ گھر کسی غیر کا ہے۔ اپنے گھر ہی جانا تھا اُس نے بیٹا۔'' عابدہ خانم نے کہا۔

''نہیں امی جان جو گھر محسن کا نہیں ہو سکتا وہ مریم کا کیسے ہو گیا۔''

''محسن پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ والدین کو اپنی اولاد کسی حال میں بھی غیر عزیز نہیں ہوتی۔ وہ تو بس دھمکی تھی بابا جان کی۔ ہم لوگ ان ہی کے ایما پر تمہیں لینے آئے ہیں۔'' احسن سدا کے صلح جو اور خاموش طبع تھے۔ بات فیصلہ کن انداز میں کرتے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ آپ سب کی آمد کے احترام میں میں آپ کے ساتھ گھر چلا جاؤں یہ تو ممکن ہے لیکن مریم نہیں۔ یہ تو اسی وقت جا سکے گی۔ جب بابا جان اسے ایک بہو کی حیثیت سے اپنی شفقت و محبت کی گھنی چھاؤں میں یہاں سے لے جائیں گے۔''

''تو ٹھیک ہے تم چلو اور انہیں لے آؤ۔''

مریم نے اُن سب کی خاطر تواضع بڑے اچھے انداز میں کی۔ بچوں سے اُسے بے حد پیار تھا۔ شیر دل اور سونیا اس کے پاس رہے۔ اس سے مانوس سے ہو گئے۔ سہ پہر کو محسن رضا تمام اہل خانہ کے ساتھ رضا ہاؤس چلے گئے اور شام کا اندھیرا ابھی پوری طرح پھیل نہ پایا تھا کہ اپنے والد کے ہمراہ لوٹ آئے۔

❁❁❁❁

رضا ہاؤس میں مریم کا استقبال دلی خلوص کے ساتھ ہوا۔ وقت گزر جائے تو ہاتھ نہیں آتا لیکن خوشی کے کھوئے ہوئے لمحات کی یاد میں آدمی بہت کچھ پا لینے کی سعی ضرور کرتا ہے۔ رضا علی نقوی نے بھی بہت کچھ لینے اور دینے کی کوشش کی۔ خوشی کی اس تقریب میں پورے اہل خاندان کو مدعو کیا۔ صرف عاصمہ کے گھر والوں نے اس تقریب میں شرکت نہیں کی۔ جس پر عابدہ خانم کو سخت ملال ہوا۔ رضا علی نقوی نے مریم کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنا خلوص اس پر نچھاور کیا۔ اہل خاندان نے فیصلہ سنا دیا کہ یہ غیر معمولی شکل و صورت محسن کو دیوانہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

عالیہ کو بھائی کی وفاؤں پر حیرت تھی۔ احسن اسے تقدیر کا فیصلہ قرار دیتے تھے اور عابدہ خانم نے اسے اپنی زندگی کی بہت بڑی شکست اور دل کی خلش مان لیا تھا۔ رضا ہاؤس میں آ کر مریم کے شب و روز کے طریق بدل گئے تھے۔ کام کرنے کے لیے کئی نوکر موجود تھے۔ بھابھی کو مریم کے ساتھ اکلوتے دیور کی وجہ سے جو اُن کا عم زاد بھی تھا بے حد انس ہو گیا تھا۔ احسن رضا مریم کو ریاض احمد بخاری کا عکس نظر آتے۔ اور رضا علی نقوی تو ویسے بھی بذات خود مرنجاں مرنج طبیعت کے خوش مزاج آدمی تھے۔ مریم دل سے اُن

کا احترام کرنے لگی تھی اور حقیقی والد کی طرح اُن سے پیار کرنے لگی تھی۔ اس کے معمولات میں رضا علی اور عابدہ خانم کے چند کام بھی شامل ہو گئے۔ جن میں بیڈ ٹی سرفہرست تھی۔ محسن کے ہاسپٹل جانے کے بعد وہ رضا علی کے پاس آجاتی۔ اُن کی باتیں مذہب اور اخلاق پر ایک مکمل درس ہوتیں۔ اخبار سنتے اور خبروں پر تبصرہ کرتے۔ بلکہ کئی گھریلو معاملات، کاروباری مسئلے اس سے ڈسکس کرتے۔

زندگی کے رموز و کنایہ سے آگاہ کرتے۔ تب مریم کو احساس ہوتا اتنے اچھے بابا جان نے محسن پر سختی کیسے کی ہوگی۔ تب وہ سوچتی کہ محسن اگر آنکھیں بند کر کے ان کی بتائی راہوں پر چلتے تو یہ ان کا حق تھا۔ ایک دن رضا علی کہنے لگے۔

''بیٹی! میں سوچتا ہوں میں نے ناحق محسن کی مخالفت کی۔ اُس کی بات نہ مانی محسن اگر ضد نہ کرتا تو اتنی اچھی بچی میری بیٹی کیسے بنتی۔ سچ پوچھو تو میں اگر تمہیں دیکھ چکا ہوتا، تم سے مل چکا ہوتا تو کبھی انکار نہ کرتا۔''

مریم ہنس پڑی۔ صرف بیٹے سے نہیں، بیٹے کے باپ سے بھی مریم کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔

''بابا جان! اس کا مطلب تو یہ ہے محسن سے ملتی یا نہ ملتی آپ سے ملاقات ضرور کرتی پہلے۔'' وہ بھی ہنس پڑے۔

''شریر لڑکی! ہم سے مذاق۔''

قریب بیٹھی عابدہ خانم کو اس التفات پر کوئی خوشی نہ تھی۔ کل تک رضا علی نقوی اس کا نام سننا گوارا نہ کرتے تھے اور آج محبت کا یہ عالم تھا۔

مریم نے چند دنوں میں رضا ہاؤس کے مکینوں کے دل جیت لیے۔ شہریار ہو یا شیر دل سونیا ہو یا مونی۔ سب کے سب اُس کے گرد جمع تھے۔ احسن بھائی کو ایک پل مریم نظر نہ آتی تو وہ لپک کر اس کے کمرے تک آجاتے۔ بھابھی کو ہر معاملے میں مریم کی صلاح مطلوب تھی۔ عالی تو ہمیشہ سے اس کی دوست تھی اور عابدہ خانم بھی محسن کی وجہ سے اُسے کافی اہمیت دیتی تھیں اور رضا علی وہ تو یوں محسوس کرنے لگے تھے کہ مریم سدا اُن کے قریب رہی تھی۔ کبھی بھی جدا نہ تھی۔ اور اسی محبت پر عابدہ خانم کے دل میں مریم کے خلاف نفرت میں اضافہ ہونے لگا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ مریم نے جس جادو کے زیر اثر محسن کو دیوانہ کیا تھا۔ اسی سحر کے زور سے وہ رضا علی کا دل جیت چکی ہے۔ لیکن وہ خاموش تھیں۔ کیا کرتیں، کیا کر سکتی تھیں وہ۔

اُن ہی دنوں عالیہ کی شادی بھی ہو گئی۔ اور وہ ایران چلی گئی۔ احسن رضا کاروباری دورے پر باہر گئے تو بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے گئے۔ گھر میں محسن، مریم اور رضا علی یا عابدہ خانم کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ پورے رضا ہاؤس کا نظام رضا علی اور عابدہ خانم نے مریم کے حوالے کر دیا۔ محسن مریم کو ایک باوقار زندگی اور خصوصی مقام دلا کر بے حد خوش تھے۔ روز مرہ زندگی سے مطمئن ہو کر اب وہ رضا ہاؤس میں رونق بڑھانے کی بابت سوچنے لگے۔ مریم کے دل میں بھی یہ آرزو ہمک رہی تھی۔ اب زندگی صرف اسی کمی کا شکار تھی۔ رضا علی کی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی شامل ہو گئی تھی جس کی قبولیت بہت جلد ہو گئی۔ اور مریم کو ایک خوب صورت سی مصروفیت مزید مل گئی۔

زندگی کی رنگینوں سے لطف اندوز ہوتے مستقبل کے خوب صورت پروگرام بناتے۔ ادھورے خاکوں میں یہ محبت کے رنگ بھرتے دن بیتتے چلے گئے۔

محسن رضا کو حکومت نے اسپیشلائزیشن کے لیے باہر بھیجنا چاہا۔ محسن رضا ایک پل کی جدائی گوارا نہ کر سکتے تھے۔ صرف اسی شرط پر جانے کو تیار تھے کہ مریم ان کے ساتھ جائے۔ ان ایام میں تو خصوصاً وہ اسے اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ بات انہوں نے رضا علی کو بھی بتادی۔ عابدہ خانم نے بھی سنا۔ اور دونوں نے مریم کے ساتھ جانے کی شدید مخالفت کی۔ گو دونوں کے انکار میں یکسانیت تھی۔ لیکن پس پردہ وجوہات میں زبردست اختلاف۔ رضا علی تھوڑے عرصے میں جو چند ماہ پر محیط تھا مریم کے عادی ہو گئے تھے۔ اُن کا خیال تھا گھر کی ویرانی انہیں کاٹنے کو دوڑے گی۔ عابدہ خانم نے اعتراض کیا تھا کہ ایسی حالت میں دیارِ غیر میں رہنا مناسب نہیں۔ بچے کی پیدائش کے بعد جبکہ احسن رضا بھی لوٹ آئیں گے۔ مریم کو ان کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

ان کا اصرار اتنا شدید تھا کہ محسن رضا کو دل کے سارے تقاضے بالائے طاق رکھ کر تنہا جانا پڑا۔ وقتِ رخصت انہوں نے کئی بار بلکہ بار بار مریم کو گلے لگایا۔ اپنے دلِ ناداں کو تسلیاں دیں اور جلد ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ اچھے بھلے رضا علی نقوی کو ایک شب مرضِ قلب نے آگھیرا۔ بروقت علاج، حفاظتی اقدامات کے باوجود دوسرے دورے میں ہی وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وقتِ رخصت مریم ان کے سرہانے بیٹھی تھی۔

ہاسپٹل کے پرائیویٹ روم میں مریم کو یوں لگا تھا گویا اس کے بابا حضور ایک بار پھر مر گئے ہوں۔ عابدہ خانم نے اس سانحے کے اطلاع محسن رضا کو دی نہ احسن رضا کو۔ اہلِ خاندان نے انہیں سپردِ خاک کیا اور ایک کہانی اس صورت میں اختتام پذیر ہو گئی۔

گھر میں ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ جس میں عاصمہ اور اس کے خاندان کی آمد و رفت بھی شامل تھی۔ مریم کو محسن کی دوری اور رضا علی کی موت نے نڈھال کر دیا۔ وہ بستر سے لگ گئی۔ گھر کا نظام عاصمہ کی والدہ اور عاصمہ نے سنبھال لیا۔ اور مریم ایک دم ہی گھر میں موجود فالتو شے کا روپ اختیار کر گئی۔ طبیعت کی افسردگی اور اضمحلال نے بیماری کی صورت اختیار کر لی۔ عابدہ خانم کی نگاہوں میں یکا یک سرد مہری اور نفرت اُمڈ آئی۔ عاصمہ نے اسے دشمنِ جان خیال کیا اور راشدہ خانم کا تو بس نہ چلتا کہ وہ اسے کچا چبا جائیں، جس نے ان کی بیٹی کا سہاگ چھین لیا تھا۔

اُن ہی دنوں جانے کس طرح عابدہ خانم کا رابطہ صفیہ بیگم سے قائم ہو گیا۔ مریم اس سے بالکل بے خبر تھی۔ اکثر صفیہ بیگم ٹیلی فون پر عابدہ خانم اور راشدہ خانم سے بات کرتیں بلکہ یہاں تک کہ وہ خود راشدہ خانم کے گھر آئیں اور انہیں مریم کے کرتوتوں سے آگاہ کیا۔ عابدہ خانم ہر صورت مریم سے نجات پا کر اپنی بھانجی کو محسن رضا کی زندگی میں داخل کرانا چاہتی تھیں۔ اس پروگرام کو تقویت صفیہ بیگم کے اعتماد کے ووٹ نے دی۔ اور سب سے پہلا قدم جو عابدہ خانم نے اٹھایا وہ تھا محسن کے خطوط مریم تک نہ پہنچانے کا عمل۔ مریم جو خط لکھ کر نوکر کے حوالے کرتی، اسے عابدہ خانم اپنے قبضے میں کر لیتیں۔ ایک تو

بچے کی وجہ سے طبیعت کی خرابی۔ دوسرے یہ نئی صورت حال۔ اب تو اٹھتے بیٹھتے عابدہ خانم اُسے طعنے دیا کرتیں۔ بھائی کی عزت کو خاک میں ملانے کے طعنے، محسن کو اسیر کر لینے کے طعنے اور نہ جانے کیا کچھ۔ مریم کی حالت روز بروز ابتر ہوتی چلی گئی۔ اُسے دکھ تھا اپنی تنہائی کا۔ رضا علی کی وفات کا۔ اور پھر محسن کی بیگانگی کا۔ جنہوں نے اس کو خط تک نہ لکھا تھا۔ ایک دن وہ رضا ہاؤس کے باہر اُسی حالت میں کھڑی تھی جس حالت میں ریاض محل سے محسن کی طرف آئی تھی۔ لیکن اس وقت میں اور آج میں بے حد فرق تھا۔ اُس دن محسن رضا اس کے ساتھ تھے اور آج وہ بھرے جہاں میں بالکل تنہا تھی۔ اور اس بات سے بھی بے خبر کہ یہ سارا کھیل اس کی بھابھی جان کے ایما پر اس کے ساتھ کھیلا گیا تھا۔

تنہائی کے اس عالم میں اور کہاں جاتی وہ۔ رہ رہ کے ریاض محل کا خیال آ رہا تھا۔ کچھ بھی ہو ریاض احمد بخاری اس کے بھائی تھے۔ اسے ہرگز دھتکار نہیں سکتے۔

نازک صورت حال میں وہ جانے کس طرح جوہر آباد تک پہنچی۔ اُسے اپنا ہوش ہی نہ تھا۔ مہربان ہم سفروں نے اس کا خیال رکھا اور اسے اس کے مطلوبہ مقام تک پہنچا دیا۔

رات کی تاریکی میں ریاض محل کے سنگی در و دیوار پُر ہیبت انداز میں سر اٹھائے اسے اپنی راہ روکتے نظر آ رہے تھے۔ لیکن خونی رشتوں کی مضبوطی اور پائیداری کا احساس لے کر اس نے دستک دے ڈالی۔ بڑا سا دروازہ کافی دیر بعد کھلا اور سامنے کھڑا امداد حسین حیران و ششدر رہ گیا۔

''بی بی۔۔۔! آپ۔۔۔ آپ یہاں کیسے۔۔۔؟ اس حالت میں کیوں؟''

وہ سخت حیران تھا۔ الٹے قدموں جا کر اپنی بیوی اختر کو لے آیا۔ دونوں کی شادی ہو چکی تھی اور آج کل وہ اختر کو لے کر ریاض محل کسی کام سے آیا تھا۔ اختر اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ سہارا دے کر اندر تک لائی۔ ملازموں کے اس کوارٹر میں جہاں وہ عارضی طور پر رہائش پذیر تھے۔ وہ پلنگ پر گرتے ہی حواس کھو بیٹھی۔ اختر رات بھر اس کے سرہانے جاگتی رہی۔ صبح یہ خبر جانے کس طرح صفیہ بیگم اور ریاض احمد بخاری تک پہنچ گئی۔ اختر اور امداد حسین نے مارے خوف کے ریاض احمد بخاری کا سامنا ہی نہیں کیا۔ اور علی الصبح چلے گئے۔ مریم گرتی پڑتی اندر برآمدے تک پہنچی تھی کہ ایک آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

''اندر آنے کی جرأت نہ کرنا مریم! یہ دروازے تم پر بند ہیں۔'' صفیہ بیگم سخت غصے کے عالم میں سامنے تھیں۔

اُن کے پیچھے ریاض احمد بخاری قہر و غضب کا طوفان بنے آ رہے تھے۔

''اس سے قبل کہ میرے ہاتھ انسانی خون سے رنگین ہو جائیں تم چلی جاؤ مریم! تم میرے لیے اُسی دن مر گئی تھیں۔''

''بھائی جان۔۔۔ مجھے۔۔۔''

''خبردار۔۔۔! کوئی بکواس نہ کرنا۔''

''میں معافی چاہتی ہوں بھائی جان۔''

''کیسی معافی۔۔۔ غیرت و عزت کا جنازہ نکالنے والے کو کیونکر معاف کروں۔ میرا خون کھول رہا ہے مریم۔ مجھے ڈر ہے میں تمہارا گلا نہ گھونٹ بیٹھوں۔ چلی جاؤ۔۔۔ چلی جاؤ۔''

''نہیں بھائی جان۔۔۔خدارا۔۔۔میرا دنیا میں کوئی نہیں۔''

''وہ کہاں ہے جس کے مان پر تم نے ہمیں ذلیل و رسوا کر کے یہ گھر چھوڑ دیا تھا۔ کیا اس نے بے وفائی کی؟ یا تمہیں ہی چھوڑ دینے کی عادت ہے۔''

''بھائی جان۔۔۔خدا کے لیے۔''

''خبردار مریم! یہ تمہارے بھائی ہوں تو ہوں میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔'' صفیہ بیگم نے کڑے لہجے میں کہا۔

''میں نے کیا کہا ہے مریم! تم جاتی ہو یا میں نوکروں سے دھکے دے کر باہر نکلواؤں۔'' ریاض احمد دو قدم آگے بڑھے اور اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ مریم نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔ یہ وہی بھائی تھے جنہیں مریم پر جان لٹا دینے کا دعوا تھا۔ آج اُن کی نگاہوں میں ذرّہ برابر ہمدردی محبت اور خلوص نہ تھا۔ قہر و غضب اور خشونت ہی خشونت تھی۔

نہ پیروں تلے زمین رہی تھی نہ سر پر آسمان۔ مریم نے آخری نظر بھائی پر اور بھائی کے اونچے محل پر ڈالی اور ریاض محل سے نکل آئی۔

اس کی منزل کہاں تھی۔ اس سے بے خبر۔ لٹی لٹی، اجڑی اجڑی مریم۔ بے نام و نشان راستوں پر چلی جا رہی تھی کہ اچانک نشیب کے اُسی گزار میں جہاں وہ ہمیشہ اختر کے ساتھ سیر کے لیے آتی تھی۔ اختر نے اس کا راستہ روک لیا۔ اور مریم راہ کا خیال کیے بغیر اختر کے گلے لگ کر رو پڑی۔

امداد حسین نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بی بی! میں اس لائق تو نہیں پھر بھی میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔ چاہے آپ کچھ عرصہ رہنا چاہیں یا عمر بھر اور مجھے بڑے سرکار کی ناراضی کا بھی کوئی خوف نہیں اگر آپ سے ہمدردی کی سزا کے طور پر وہ مجھے جان سے مار ڈالیں تو بھی کچھ پروا نہیں۔''

''امداد حسین! میں تو بالکل تہی دامن ہوں۔ سوائے دکھوں کے میرے پاس کچھ نہیں۔''

''تو کیا ہوا؟ میں آپ کے سارے دکھ اپنی چھوٹی سی جھولی میں سمیٹنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ آپ چلیے تو سہی۔''

یوں امداد حسین کی وفاداری اور اختر کی محبت مریم کو باقر پور لے آئی۔ بے چارہ امداد حسین مریم کا لکھا ہر خط غیر ممالک جانے والے لفافوں میں ڈال کر پوسٹ کرتا رہا لیکن ایک کا جواب بھی نہ آیا۔ امداد حسین تو کجا مریم بھی اس بات سے بے خبر تھی کہ اسے عابدہ خانم نے جان بوجھ کر غلط ایڈریس دیا تھا کہ اگر کبھی کوئی خط ان کی نظروں سے بچ کر ڈاک میں چلا بھی جائے تو عمر بھر پھرنے کے بعد بھی محسن رضا تک نہ پہنچے۔

اور اسی کشمکش کے عالم میں ایک سرد رات مریم ایک بیٹی کو جنم دے کر محسن کے انتظار کی طوالت اور زمانے کی سرد مہری سے گھبرا کر اس جہان سے رُخصت ہو گئی۔ وقتِ رخصت اس نے اختر سے کہا۔

''اختر! اس بچی کو میری قیمتی امانت سمجھنا۔ جس کے حقدار اس دنیا میں محسن اور بھائی جان ہیں۔ بھائی جان کو اس کے بارے میں ضرور بتا دینا۔ کبھی جو انہیں مجھ سے اپنے رشتے کا احساس ہو تو شاید وہ

اسے اپنے دل میں جگہ دے دیں۔"

اس کا نام شبنم بھی مریم کی آرزو پر رکھا گیا۔ اور یہ وہ نام تھا جو محسن رضا نے منتخب کر رکھا تھا۔

مریم مر گئی۔ ایک داستان اس پر ختم ہوئی۔ لیکن شبنم کا وجود اسی کہانی کا اگلا حصہ بن گیا۔ مریم ہزاروں لواحقین کے ہوتے ہوئے بھی خاموشی سے سپرد خاک کر دی گئی۔

ریاض احمد بخاری کو اس سارے حادثے کی خبر تک نہ ہوئی یہاں تک کہ وہ ایک بار جب باقر پور آئے تو امداد حسین کو اس کی وفاداری، نمک حلالی اور ایمانداری کے سبب اپنی جاگیر کا نگران بنا گئے۔ شبنم ان دنوں ایک سال کی معصوم سی بچی تھی۔ دوسری بار جب وہ آئے تو وہ دو سال کی ہو چکی تھی۔ بے حد معصوم اور پیاری سی بچی۔ ریاض احمد بخاری اسے دیکھ کر چونک سے گئے۔ سارے عکس مریم کی ذات کے تھے۔ لیکن انہیں اس بات کا وہم بھی نہیں تھا۔ جب سے مریم جدا ہوئی تھی۔ وہ اندر سے بجھ سے گئے تھے۔ لیکن کوئی رازداں ایسا نہ تھا جس سے دل کی اس شکست کا ذکر کر سکتے۔

شبنم نے آگے بڑھ کر اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ ریاض بخاری مسکرا پڑے۔

"امداد حسین! تمہاری بچی تو بہت پیاری ہے۔" انہوں نے بے اختیار اس کومل کلی کو گود میں اٹھا لیا۔

"یہ میری بٹیا رانی ہے سرکار! میرے دل کا ٹکڑا۔ ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے مجھے۔"

"اچھا۔۔۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔"

وہ مریم سے کافی بڑے تھے عمر میں۔ مریم کو انہوں نے گود میں کھلایا تھا۔ اپنی کوئی بیٹی تھی نہیں، بار بار اس کا بچپن سامنے آ رہا تھا۔ اسی کی یاد آ رہی تھی۔

"بڑے سرکار۔۔۔!"

"ہوں۔۔۔" وہ گہری سوچ میں مبتلا تھے۔

"بڑے سرکار۔" اس نے پھر مخاطب کیا۔

"بولو نا امداد حسین۔۔۔! کیا بات ہے؟" ریاض احمد بخاری نے توجہ اس کی طرف مبذول کی۔

"ایک معصوم سی امانت آپ کی میرے پاس ہے۔" وہ جلدی سے کہہ گیا۔ ریاض احمد بخاری شبنم کے سر پر نرمی سے ہاتھ پھیر رہے تھے۔

"معصوم سی امانت۔ یہ کیسی بات ہے امداد حسین۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔"

"کیا چکر ہے۔۔۔ صاف صاف کہو امداد حسین۔" ریاض بخاری کو تجسس ہوا۔

"پہلے وعدہ کریں سرکار۔ اگر وہ امانت آپ لے لیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ اُسے مجھ سے جدا نہیں کریں گے۔"

"ہاں ہاں۔ تم کہو تو سہی۔"

"سرکار یہ بٹیا رانی میری نہیں آپ کی ہے سرکار آپ کی۔"

"کیا فضول باتیں کر رہے ہو امداد حسین۔" وہ پریشان سے ہو گئے۔

''فضول باتیں نہیں سرکار۔ یہ مریم بی بی کی بچی ہے آپ کی بھانجی، آپ کا خون۔'' ریاض احمد بخاری نے ایک دم شبنم کو خود سے جدا کر دیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو امداد حسین۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ نہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔''

''نہیں سرکار۔۔۔! آپ تسلی سے میری بات سن لیں۔''

تب امداد حسین نے سب کچھ بلاکم و کاست انہیں سنا دیا۔ اور یہ سن کر ریاض احمد بخاری شبنم کو آغوش میں بھر کر دل کھول کے روئے۔ ایک چھوٹے آدمی کو راز دار بنا کر اس کے سامنے زخم کھول کر وہ ہلکے پھلکے ہو گئے۔

''امداد حسین! ہم نے مریم کو معاف کیا۔ بخدا ہم نے معاف کیا۔ تم اس کے گواہ ہو۔ لیکن ہم یہ بات بھری دنیا میں نہیں کہہ سکتے۔ کہ لوگ ہمیں بے غیرت کہنے لگیں گے۔ اس بچی کو ہم دنیا کے سامنے سینے سے نہیں لگا سکتے کہ ہمیں احباب کے طعنوں کا ڈر ہے۔ ہم مجبور ہیں، بے حد مجبور، ہم اسے ریاض محل نہیں لے جا سکتے۔''

اب یہ مریم کی نہیں ہماری امانت ہے۔ ہماری ذات کی دشمن مریم نہیں محسن رضا ہے۔ اس بچی کے بارے میں اسے کبھی خبر بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اور نہ ہی کسی اور پر ہمارا اور اس کا تعلق ظاہر ہو۔ ہم اس کی پرورش کے لیے ممکنہ سہولیات تمہیں دیں گے۔ اس کی تربیت عمدہ خطوط پر ہو۔ ہم اپنی مریم کی بیٹی کو وہ محبت دیں گے جو مریم کے لیے ہمارے دل میں تھی۔''

پھر وہ گاہے بہ گاہے آتے رہے۔ شبنم سے مل کر انہیں قلبی سکون کی دولت ملتی۔ میڈم انجلا کو ریاض بخاری نے صرف شبنم کی خاطر یہاں رہائش رکھوائی، اسکول کھلوایا۔ وہ شبنم کو امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے نہ رکھنا چاہتے تھے کہ لوگ مشکوک نہ ہو جائیں۔ لیکن پھر بھی وہ ایک منفرد انداز میں پرورش پا رہی تھی۔ اختر کی قسمت میں اولاد تھی ہی نہیں۔ اس نے ممتا کے حقیقی جذبے بھی شبنم پر لٹا دیے تھے۔ امداد حسین کے من کا چین تھی وہ۔ اور کردار سیرت کے لحاظ سے بھی ہزاروں لڑکیوں میں ممتاز تھی۔

مڈل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے پر ریاض احمد بخاری خود آئے۔ اور اس کے لیے ڈھیروں ڈھیر ادبی کتب بطور تحفہ لائے۔ جب وہ بڑے ادب سے بڑے سرکار کہہ کر انہیں مخاطب کرتی تو ریاض احمد دل مسوس کر رہ جاتے جی چاہتا، اسے سینے سے لگا کر پیار کریں۔ لیکن وہ زیرِ لب مسکرا کر رہ جاتے کہ انہیں اپنے ارمانوں کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک خوب صورت وقت کا انتظار تھا۔

رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے حویلی سے نکل کر پیدل پگڈنڈی پر جاتے ہوئے امداد حسین سے کہا۔

''امداد حسین! ہم نے سوچ بچار کے بعد اپنی الجھن کا حل نکالا ہے۔''

''فرمائیں سرکار۔''

''ہم فصلِ خریف کے موقع پر اپنے صاحبزادے آفاق کو یہاں بھیج رہے ہیں۔ وہ کچھ عرصہ یہیں رہے گا۔ تم۔۔۔ میرا مطلب ہے امداد حسین، شبنم اور آفاق کو اتنا موقع ضرور مہیا کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہو کر ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ میں چاہتا ہوں جو خواہش میرے دل میں ہے اس کا اظہار

آفاق کی زبان سے ہو۔ اور میں اپنے بیٹے کی آرزو کے احترام میں تمہاری ''بیٹی'' کو اپنی بہو بنالاؤں تو دنیا والوں کو زیادہ حیران ہونے کا موقع نہ ملے۔''

امداد حسین بے طرح خوش ہو گیا۔

''میں سمجھ گیا سرکار۔۔۔! سمجھ گیا۔ ان شاء اللہ آپ بے فکر رہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔ میری بٹیا رانی کو اپنا حق مل جائے مجھے اور کیا چاہیے۔''

لیکن ہر خواب کو صحیح تعبیر نہیں ملتی نا۔ آفاق آئے۔۔۔ آفاق نے شبنم کو دیکھا، چاہا، پایا اور چلے گئے۔

اُن کی آرزو کا اظہار صفیہ بیگم تک محدود رہا۔ جسے انہوں نے اس سختی سے دبایا کہ آفاق والد کے سامنے اس معصوم خطا کا اظہار بھی نہ کر سکے اور دیارِ غیر چلے گئے۔

❁❁❁❁

شبنم جہاں بھی رہی اپنے وجود کی اہمیت سے بے خبر رہی۔ باقر پور میں تھی تو اس سے نا آشنا کہ وہ باقر پور کی مالک خود تھی۔ کیونکہ جائیداد کا یہ حصہ مریم کے نام تھا۔ اور قانونی طور پر مالک اس کی اولاد ہی ہو سکتی تھی۔ اب محسن رضا کے گھر میں آئی تو خود کو بالکل بے سہارا اور بے مایہ جان کر اس احسان کے بوجھ تلے دبی ہوئی کہ محسن رضا نے اسے بیٹی سمجھ کر اپنے دامن میں چھپا لیا تھا پناہ دی تھی۔ مریم اس گھر سے گئی تھی۔ تو محسن کی امانت کا بوجھ لے کر، شبنم رضا ہاؤس میں آئی تو ریاض محل والوں کی ایک زندہ نشانی اس کے وجود میں پرورش پا رہی تھی۔ دونوں اتفاقات عجیب تھے۔ بنانے والے نے کیا مقدر بنایا تھا۔

شبنم چند دنوں میں بالکل صحت یاب ہو گئی۔ تو محسن رضا نے چھوٹے پیمانے پر ایک تقریب منعقد کی۔ جس میں تمام اہلِ خانہ کے سوا چند ایک قریبی عزیز موجود تھے۔ جس میں انہوں نے بڑے واضح الفاظ میں شبنم کو اپنی بیٹی کا درجہ دیا۔ اور اسے سب سے متعارف کرایا۔ محسن رضا اپنی پسند سے شبنم کے لیے مختلف رنگوں کے خوب صورت ریڈی میڈ سوٹ لائے۔ ہلکی پھلکی جیولری اور ڈھیر ساری اشیائے ضرورت۔ شبنم کے لیے یہ نئی زندگی نئے لوگ، نیا ماحول سب کچھ ہی حیران کن تھا۔ محسن رضا اس بات پر بے حد خوش تھے کہ ان کی ذات کسی کی جان بچانے کا وسیلہ بن گئی تھی۔ بھابھی اور عالیہ شبنم سے مل کر بے حد خوش تھیں۔ دونوں نے اسے مریم کے بارے میں بتایا کہ وہ ہو بہو ان کی شکل تھی۔ تو وہ اس عجیب اتفاق پر بے حد حیران ہوئی۔ پھر مریم کی تصویریں دیکھ کر اسے ہر حال میں یقین کرنا پڑا۔ اس شام لڑکوں کی پوری پارٹی خوش خوش اِدھر اُدھر آ جا رہی تھی۔ گلابی لباس میں ملبوس شبنم کو شہریار اور شیر دل کی پسندیدگی کی نگاہیں اپنے اندر جذب کر لینے کو تیار تھیں۔ شاید یہ اس کے حسن کا تقاضا تھا۔ یا کوئی اور بات۔ شہریار آنے بہانے بار بار قریب سے گزر رہے تھے۔ لیکن شیر دل اس سے کافی دور دوستوں میں گھرے مسلسل اسے اپنی نگاہوں کی زد میں رکھے ہوئے تھے۔

طارق اور شارق شبنم کے ہم عمر ہی تھے۔ رضی انکل ان کے آئیڈیل تھے اور شبنم کو اس گھر میں اُن ہی کے توسط سے یہ مقام ملا تھا۔ لہٰذا وہ اس کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔ عابدہ خانم ہال کے وسط میں رکھے بڑے سارے صوفے پر بیٹھی تھیں ایک طرف بھابھی اور شبنم تھیں۔ دوسری طرف عالیہ خانم۔

شبنم کی صحت یابی کی خوشی میں عابدہ خانم اسے تحفہ دینے کی ابتدا کی تو ارد گرد تحفوں کے انبار لگ گئے۔ شہریار نے خوب صورت رسٹ واچ سے نوازا۔ سونیا نے کانچ کی باریک چوڑیاں اس کے ہاتھوں میں پہنائیں۔ سمیعہ، ربیعہ نے مل کر اس کے لیے بنارسی ساڑھی خریدی۔ طارق اور شارق نے موتیوں کا پیارا سا سیٹ دیا۔ شہریار کو اپنا تحفہ سب سے قیمتی اور خوب صورت لگ رہا تھا۔ خاصے اترائے ہوئے تھے۔

''مما۔۔۔! آپ کے شیر دل صاحبزادے کہاں چھپ گئے۔ دینے دلانے کے معاملے میں آپ نے انہیں کنجوس ہی پیدا کیا تھا یا بعد میں ہو گئے۔''

سونیا کو اپنے جڑواں بھائی سے بے حد پیار تھا۔ اور شہریار جان بوجھ کر ایسی باتیں کہتے تھے۔

''جی ہاں ساری سخاوت آپ پر جو ختم ہو گئی تھی۔ وہ بے چارے پیدائشی کنجوس نہ ہوتے تو کیا ہوتے۔''

''شیر دل بھائی پر کنجوسی کا الزام فٹ نہیں آتا بھائی جان۔'' مہ ناز نے جسے سب پیار سے مونی یا مونا کہتے تھے دور سے آواز لگائی۔

''اگر وہ کنجوس ہوتے تو سونی باجی کو ساتھ کیوں لاتے۔''

سب نے قہقہہ لگایا۔ اسی وقت نیوی بلو سوٹ میں ملبوس شیر دل ہال میں داخل ہوئے۔ بڑے وقار کے ساتھ چلتے وہ عابدہ خانم کے قریب آ کر رک گئے۔

''شیر دل اپنی عم زاد کے لیے آپ کیا تحفہ لائے۔'' محسن رضا نے خوش دلی کے ساتھ سوال کیا۔

''رضی انکل! ہم نے خدا کے حکم سے انہیں نئی زندگی دی کیا اس کے علاوہ بھی کچھ دینا تھا؟'' وہ مسکرائے۔

''جی ہاں، جناب رسم و رواج کے احترام میں۔'' سونیا نے پیار سے بھائی کو دیکھا۔

انہوں نے کوٹ کی جیب سے چین نکال کر آگے بڑھائی جس میں لفظ "S" کا پینڈنٹ واضح انداز میں جھول رہا تھا۔

''S'' جو شیر دل کا بھی پہلا حرف تھا اور شبنم کا بھی۔ چین شیر دل کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔

''شبنم جی! اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ چین آپ کے گلے میں ڈال دوں۔'' شیر دل کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ چہرے کی سرخی اور سیاہ آنکھوں سمیت بے حد بھلی لگ رہی تھی۔

''آپ سب لوگ مجھے تحفوں کے انبار تلے دبائے جا رہے ہیں۔'' شبنم نے باری باری سب کو دیکھا۔

''معاف کرنا بیٹی۔ یہ تم پر کوئی احسان نہیں۔ محسن تو زندگی بھر ہم لوگوں کو دیتے ہی آئے ہیں۔ آج ہی تو تمہارے بہانے ہمیں دل خوش کرنے کا موقع ملا ہے۔ ہم سے یہ خوشی نہ چھینو۔'' بھابھی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

اس اثنا میں شیر دل ایک قدم آگے بڑھ آئے۔ تو شبنم نے سر جھکا دیا۔ اور شیر دل نے چین کا ہک کھول کر ہاتھ آگے بڑھائے اور چین شبنم کے گلے میں ڈال دی۔

''شکریہ۔'' شبنم کی دھیمی سی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ پھر مسکرانے لگے۔

رات کی تنہائی میں بستر پر دراز شبنم اپنے کل اور آج کا موازنہ کرنے میں مصروف تھی۔ اختر اور امداد حسین کی یاد نے آنسو بہانے پر مجبور کیا تو رضا ہاؤس میں ملنے والی محبتوں پر اسے خواب کا گمان بھی ہوا۔ محسن رضا کی ذات نے ڈھیروں ڈھیر احساسِ تحفظ اسے بخش دیا تھا۔ یہ سب لوگ اسے دل کے قریب محسوس ہوئے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کا جائزہ لیا۔

وہ کون تھی؟

کیا تھی؟

کہاں سے آئی؟

کس ارادے سے آئی؟

اور کہاں آ پہنچی؟

کیا خبر کل اس کے ساتھ کیسے حالات ہوں۔

پھر اس نے سوچا۔ اگر محسن رضا نے اپنی سادگی اور عظمت کے تحت اسے اپنی زندگی میں اتنی اہمیت دے دی ہے تو وہ اس انسیت اور خلوص کا غلط فائدہ نہیں اٹھائے گی۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنے دل میں خود کو اس گھر میں ایک ملازمہ ہی سمجھے۔ التفات کی گھنیری چھاؤں میں بھی اسے وہ ناز و انداز یاد آئے۔ جو اختر اور امداد حسین اٹھایا کرتے تھے۔ تب وہ پھر سسک اٹھی۔ والدین جس حیثیت اور رتبے کے تھے۔ اسے تو شہزادی سمجھتے تھے۔

''بابا! میں تمہاری مجرم ہوں، مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہیں بہت بڑا دکھ دیا۔'' پھر ایک دم اسے خیال آیا۔ اسے نہ پا کر دونوں پر کیا گزری ہوگی۔ لوگوں نے اُن پر کیا کیا طعنہ زنی کی ہوگی؟ انہوں نے زمانے والوں سے کیا کہا ہوگا؟

''ہائے میرے بابا اور اماں۔'' اتنا سوچتے ہی ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور وہ بے اختیار چیخیں مار کر رونے لگی۔

آواز سن کر کئی لوگ اس کے کمرے کی طرف دوڑ کر آئے۔ آنے والوں میں سرِ فہرست بھابھی تھیں جن کا کمرا اس کے کمرے کے ساتھ تھا۔

''دروازہ کھولو بیٹی کیا ہوا؟'' انہوں نے دروازہ پیٹ ڈالا۔

''دروازہ کھولو شبنم۔۔۔ شبنم۔۔۔!'' سونیا کی آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی کئی اور آوازیں ابھریں۔

تو شبنم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس کی زار و قطار بہتی آنکھیں اب بھی دریا بہانے پر تلی ہوئی تھیں۔ بھابھی نے اسے بازوؤں میں تھام لیا۔

''کیا ہوا شبنم بیٹی! کیا بات ہے؟ کوئی خواب دیکھا کیا ڈر گئیں؟''

وہ اُن کے سینے سے لگ کر اور بھی شدت سے رونے لگی۔ اسی اثنا میں عالیہ خانم آ گئیں۔

ظاہری حالات کی روشنی میں سب اُس کے صدمے کی گہرائی سے آگاہ تھے۔ سب نے ہی اپنی اپنی جگہ اسے دلاسے دیے، تسلی دی، پیار کیا اور سونیا اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ عالیہ خانم اور بھابھی

اس کے ساتھ تھیں۔

''آئندہ تم اس کمرے میں تنہا نہیں سوؤ گی شبنم۔ سونیا کا کمرا تم دونوں کے لیے ہوگا۔'' بھابھی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اسے دودھ میں گلوکوز ملا کر پلایا۔ کافی دیر اس کے پاس بیٹھی رہیں اور جب وہ نارمل ہوگئی تو دونوں چلی گئیں۔

سونیا ان دنوں ایف۔ اے سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی جبکہ شیر دل ایف۔ ایس۔ سی میں تھے۔ شہریار نے بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے اکنامکس میں داخلہ لے رکھا تھا۔ اور مونا میٹرک میں تھی۔ چند دن بعد محسن رضا شبنم کے لیے کورس کی کتابیں لے آئے اور وہ اپنے ماضی کو فراموش کرنے کی کامیاب کوشش کرتی ہوئی اسٹڈی میں مصروف ہوگئی۔ وہ راہیں چھوڑ کر جن پر چلتے چلتے کبھی آفاق احمد کا سامنا ہوجانے کی توقع کی جاسکتی تھی۔ شبنم کا مجبور دل کئی بار رو اٹھا۔ لیکن اس زندگی سے سارے ناتے توڑ کر اب بے خبر رہنا ہی بہتر تھا۔ کہ یہ دنیا تھی اور اس دنیا کے کچھ اصول تھے۔ محسن رضا اس کی زندگی میں بے حد اہمیت اختیار کر گئے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران تھی کہ لوگ انسانی ہمدردی کی خاطر اتنا کچھ کرتے ہیں۔ بے حد حیران تھی وہ سب کی زبانی یہ سن کر کہ محسن رضا نے سارے زمانے سے ٹکر لے کر اپنی پسند سے شادی کی تھی اور دو ڈھائی سال میں ان کی رفاقت ابدی جدائی میں بدل گئی تھی۔ بس اس کے بعد محسن دوسری شادی کا تصور بھی نہیں کر سکے۔ ان کے کائنات احسن رضا کے بچے ہیں جنہیں اپنا کہہ کر جن سے محبت کر کے وہ ناکام زندگی کو مسلسل بہلائے جا رہے ہیں۔

کچھ دنوں بعد اُسے یہ بھی علم ہوگیا کہ اپنی بیوی مریم کی خاطر انہوں نے بچپن کی منکوحہ کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس سے نکاح مریم کی موت کے بعد بھی قائم رہا۔ مگر محسن رضا نے اسے نہیں اپنایا۔ بلکہ لوٹ کر آتے ہی طلاق دے دی تا کہ وہ کسی اور جگہ شادی کر کے اپنا گھر آباد کر سکے۔ عاصمہ کو اس نے پہلی بار شہریار کی برتھ ڈے پارٹی پر دیکھا۔ خاندان کے کئی اور لوگ بھی موجود تھے۔ سب نے شبنم کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی۔ طرح طرح کی باتیں کیں۔ لیکن سونیا اور مونی نے اسے اس ساری تنقید و بحث سے بہت دور رکھا۔ لوگوں میں اس کی ذات حیرت کا سبب بھی تھی اور جن لوگوں نے مریم کو دیکھ رکھا تھا انہوں نے کئی قسم کی باتیں کیں اور شبنم کے وجود کو پراسرار قرار دیا۔

سالگرہ کی تقریب ختم ہوئی تو اہل خانہ ہال میں ہی ادھر اُدھر کے صوفوں پر براجمان اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو میں موضوع عاصمہ اور ان کی بیٹی تھیں۔ عابدہ خانم اب تک اس زیادتی کے احساس کو ختم نہ کر سکی تھیں ان کی بھانجی اُن کے گھر میں بہو بن کر نہ آسکی تھی۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے انتہائی ڈرامائی انداز میں مریم کا وجود اس گھر سے ہٹا دیا تھا۔ جس کے بارے میں آج تک خبر نہ تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ تب بھی محسن رضا نے عاصمہ کے ساتھ شادی سے انکار کر کے ان کا دل مزید دکھا دیا تھا۔ اب وہ اس کمی کا ازالہ اس صورت میں کرنا چاہتی تھیں کہ عاصمہ کی بیٹی جس کی عمر تیرہ چودہ برس ہی تھی۔ لڑکوں میں سے کسی ایک سے منسوب ہوجائے اور کسی بہانے عاصمہ کو رضا ہاؤس میں تھوڑا بہت مقام مل سکے۔ سو انہوں نے بزرگانہ اثر و رسوخ اور رعب داب کو بروئے کار لاتے ہوئے اسی محفل میں اعلان کر دیا کہ شہریار اور اسما کی منگنی کچھ دنوں بعد کر دی جائے گی۔ اکیس سالہ شہریار اس

اچانک افتاد پر گھبرائے گھبرائے سے تھے۔ انہوں نے ابھی تک تعلیم کے سوا کسی چیز کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ لیکن دادی ماں کے فیصلے کو رد کرنا یا اس اس کے خلاف آواز اٹھانا ان کے لیے ناممکن تھا۔ لڑکیوں نے انہیں مبارک باد دی۔ اسی بہانے ٹریٹ لینا چاہی۔ اور سب نے سونیا کے کمرے میں جا کر خوب دھما چوکڑی مچائی۔ سونیا اور مونی نے گلا پھاڑ کر ''دیساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا'' گایا۔

سمیعہ اور ربیعہ نے ان کا ساتھ دیا۔ اور شبنم ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کے اس سلسلے کو دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ ان دنوں اس کی حالت بے حد نازک تھی۔ اٹھنے بیٹھنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔ اس لیے وہ اکثر کمرے میں بند کورس کی کتابیں دیکھتی رہتی۔ کھانا کھانے میز پر بھی نہ جاتی۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک سہ پہر جب سب چائے کے لیے میز پر موجود تھے۔ محسن رضا اس کے پاس چلے آئے۔ انہیں دیکھ کر وہ کھڑی ہونے لگی۔ تو انہوں نے جلدی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بٹھا دیا۔

''بیٹھی رہو بیٹی۔ میں ابھی ہاسپٹل سے لوٹا ہوں۔ تم سے ایک ضروری بات کہنے آیا تھا۔ میں نے تمہارا کیس ڈاکٹر راشدہ کے حوالے کر دیا ہے۔ کل بھابھی جان کے ساتھ ہاسپٹل چلی جانا۔ میں کچھ عرصے کے لیے ایک طبی وفد کے ساتھ امریکا جا رہا ہوں۔ اپنی کوئی پریشانی گھر والوں سے چھپا کر نہ رکھنا۔ سب تمہارے ساتھ ہوں گے۔ خدا تمہارا محافظ اور نگہبان ہو۔ میں جلد لوٹ آؤں گا۔''

محسن تیسرے دن روانہ ہو گئے۔ اور جاتے ہوئے ساری ذمہ داری بھابھی پر ڈال گئے۔

شبنم کی بے آب و گیاہ صحرا جیسی زندگی میں وہ خوب صورت پھول جانے کیسے کھل اٹھا۔ جس نے نہ صرف حیات کے ویران صحرا کو رونق بخشی بلکہ اسے جینے کا حوصلہ بھی بخش دیا۔ محسن رضا تک یہ اطلاع امریکا میں پہنچ گئی۔ اور انہوں نے وہیں سے ہی اس کا نام حسن رضا منتخب کر کے بھابھی کو بتا دیا۔ نومولود حسن گھر بھر کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ ایک عرصے سے اس گھر میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس لیے سب نے ہی اس کا استقبال خوشی کے ساتھ کیا۔

ساتویں دن شبنم گھر لوٹ آئی۔ اس کے آرام کا، غذا کا بخوبی خیال رکھا گیا اور گھر آتے ہی بھابھی نے حسن کو یہ کہہ کر سنبھال لیا کہ آج سے یہ بچہ اُن کا ہے شبنم کا نہیں۔ مکمل طور پر صحت یاب ہوتے ہی شبنم نے اپنی بھرپور توجہ تعلیم کی طرف لگا دی۔ حسن کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ حسن تو ایک کھلونا تھا۔ دن بھر مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوتا رہتا۔

محسن رضا لوٹ کر آئے تو تین ماہ کا گل گوتھنا بچہ جانے کیوں انہیں دل کے بہت قریب لگا۔

''اوہ بابا!۔۔۔ پیارا بابا۔۔۔! بھئی یہ ننھا فرشتہ یہاں کیسے آ گیا۔'' انہوں نے بے اختیار اسے گود میں بھر کر چوم لیا۔

''بھابھی دیکھیے میری زندگی میں کیسی رونق آ گئی۔ بیٹی تو ملی تھی ایک عدد پیارا سا بیٹا بھی مل گیا۔''

''یہ تمہارا نہیں میرا بیٹا ہے محسن۔ ہم نے شبنم سے سودا طے کر لیا ہے۔ بے شک پوچھ لو۔'' شبنم شرمائی، گھبرائی خاموش سی بیٹھی تھی۔

محسن رضا ہنس پڑے۔

''شوق سے شوق سے۔ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''ہاں بیٹی۔۔!'' انہوں نے شبنم کو مخاطب کیا۔

''اب تم اپنا سفر نئے سرے سے شروع کر دو۔ یہ بچہ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ تم تعلیم حاصل کرو۔ اور جو لائن اختیار کرنا چاہو میں ہر قسم کے تعاون کو تیار ہوں۔''

''میرا سر تو آپ کے احسانات کے سامنے جھکا ہے۔ میرے لیے تو یہی بہت ہے کہ آپ نے میری جان بچا کر مجھے عذابِ مسلسل سے بچا لیا۔ مجھے پناہ دی، عزت دی، سر چھپانے کو ٹھکانہ دیا۔ مجھے میری طلب سے بھی بڑھ کر ہر شے دی۔ آپ مجھے اسی حال میں رہنے دیں۔ مجھے جدوجہد کی کیا ضرورت ہے۔ میرے لیے تو اس گھر کی خادمہ بن کر رہنا بھی باعثِ فخر ہوگا۔ بس اتنا احسان کر دیجیے گا کہ یہ بدنصیب بچہ زندگی کے کارزار میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو سکے۔'' بڑے دنوں سے دل میں چھپی بات لبوں تک آ گئی۔

محسن رضا حیرت سے اسے تکتے رہے۔

''شبنم۔۔۔!'' انہوں نے اسے عجیب انداز میں پکارا۔

''شبنم۔۔۔! ہم لوگوں نے تو تم سے ایسا کوئی سلوک نہیں کیا۔ جس کے تحت تم اپنے آپ کو یہاں خادمہ تصور کرنے لگو۔ شاید تم نے میرے فیصلے کو دل سے قبول نہیں کیا۔ شاید تمہیں میری بیٹی کہلانا پسند نہیں۔ تم اس بچے کو بدنصیب کہہ رہی ہو جس کی آمد نے میرے مردہ دل میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ مجھے افسوس ہے شبنم کہ میرا التفات تمہیں اعتماد نہیں دے سکا۔ بیٹی! ایسی کوئی کمی تو میں نے نہیں چھوڑی۔''

ان کا دل بھر آیا، لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

''آپ غلط سمجھ بیٹھے۔ بھلا کون سی کمی رہ گئی ہے۔ نہیں نہیں۔۔۔ بات کمی کی نہیں زیادتی کی ہے ڈاکٹر صاحب۔ میں ایسی محبت کے لائق ہی کہاں ہوں۔''

''تم کس لائق ہو۔ یہ ہم نہیں وقت خود بتائے گا۔ تم جلدی سے اپنی کہی ہوئی باتیں واپس لو۔ ہم سے معافی طلب کرو۔ اور پھر جا کے امتحان کی تیاری کرو۔''

شبنم کے ساتھ ساتھ بھابھی بھی ہنسنے لگیں اور شبنم نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پیار بھرے انداز میں محسن رضا کی طرف دیکھا تو انہوں نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وقت کا گھوڑا دوڑتا رہا۔ ماہ و سال کا سفر لگے بندھے انداز میں جاری رہا۔ جب حسن سات سال کا سمجھ دار اور ذہین بچہ ہوا اس وقت شبنم کے بابا امداد حسین کا خواب بھی پورا ہو گیا۔ اب شبنم سترہ برس کی وہ نادان سی دوشیزہ نہیں تھی جس نے آنکھیں بند کر کے ایک ابن آدم کو اپنا سب کچھ مان کر وفا کی لاج رکھنے کو اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اب وہ زمانے میں ایک اچھے مقام کی مالک شبنم رضا تھی جس کی قابلیت کے پیشِ نظر تعلیم سے فارغ ہوتے ہی گورنمنٹ کالج میں جاب مل گئی تھی۔ اور جو بڑے اعتماد سے زندگی کے سفر میں قدم آگے بڑھا رہی تھی۔

ان سات سالوں میں اور بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ سب نے مل کر فیصلہ کیا تھا۔ محسن رضا کے گھر کی آبادی کا۔ جسے شبنم نے انتہائی کوشش کے بعد محسن رضا سے منوا ڈالا۔ اور عمر کا ایک بڑا حصہ تنہا

گزار دینے کے بعد وہ شادی پر راضی ہو گئے۔ ڈاکٹر فرزانہ ان ہی کے ہاسپٹل میں جاب کرتی تھیں۔ ان کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ سید خاندان سے تھیں۔ مناسب رشتہ نہ مل سکنے پر شادی نہ ہو سکی تھی۔ محسن رضا کی شرافت، قابلیت اور اعلیٰ کردار سے سخت متاثر تھیں۔ گھر والوں نے سلسلہ جنبائی شروع کیا اور چند ماہ میں وہ محسن کی شریکِ حیات بن کر گھر میں آ گئیں۔ رضا ہاؤس محبت شانتی اور خلوص کا گہوارہ تھا۔ ہر شخص محبت کی تفسیر، ہر دل ایثار کا خوگر۔ عابدہ خانم کو اس اقدام نے خاصی مسرت دی۔ فرزانہ سے انہوں نے محبت کا سلوک کیا۔

جیسے ہی شہریار تعلیم سے فارغ ہوئے اور احسن رضا کی کوششوں سے انہیں مرکزی حکومت میں ایک اچھا عہدہ مل گیا۔ عابدہ خانم نے ان کی شادی کا اصرار کیا۔ اور محسن رضا کی شادی کے بعد شہریار کی شادی بھی ہو گئی۔ رضا ہاؤس جیسے وسیع و عریض گھر میں جہاں یہ تبدیلیاں آئیں۔ وہاں تعمیری طور پر بھی اضافہ کیا گیا۔ اسما اس گھر میں بڑے کروّ فر کے ساتھ رخصت ہو کر آئی اور آتے ہی گھر کے نظام میں کئی تبدیلیوں کا سبب بن گئی۔ جن میں سے ایک تبدیلی گھر میں گروہ بندی کی تھی۔ شہریار سیدھے سادے نوجوان تھے۔ ان کی ممانے ان کی تربیت سادگی اور نیک نیتی کے درس دے کر کی تھی۔ لیکن اسما چھوٹی سی عمر میں چالاک عورتوں سے کم نہ تھی۔ اس پر اسے عابدہ خانم کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ اس نے شہریار کو شیشے میں اُتار لیا۔ اور وہی عام سی گھریلو باتیں سب کے درمیان وجہ تنازعہ بن گئیں۔ فرزانہ نے اس گھر میں قدم رکھا۔ محسن رضا نے اس پر شبنم اور حسن کی اہمیت واضح کر دی۔

مریم کے بارے میں بتا دیا۔ انہوں نے صاف کہا اگر فرزانہ اس گھر میں مالک بن کر آئی ہے تو یہ شبنم کا احسان ہے کہ اس نے محسن رضا کو شادی پر آمادہ کیا۔ ورنہ انہوں نے تو اپنی آرزوئیں اور احساسات مریم کے ساتھ ختم کر ڈالے تھے۔

فرزانہ کے لیے شبنم کا وجود، محسن کی اس کے لیے محبتیں سب کچھ ہی ناقابلِ برداشت تھا۔ عاصمہ بیٹی سے ملنے آتی تو اس کی ملاقات فرزانہ سے ضرور ہوتی۔ عاصمہ کے دل میں محسن کے خلاف نفرت ہی نفرت تھی سو اس نے بلکہ اسما نے فرزانہ کی ہمدردیاں اس سے اظہار ہمدردی کر کے جیت لیں۔ ان ہی دنوں فرزانہ نے بھی ایک بیٹے کو جنم دیا جو محسن رضا کے لیے واقعی متاعِ عزیز تھا۔ شبنم محسن رضا کی ویران زندگی میں بہاروں کے اس دخل پر بے حد مسرور تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ ان ایام میں کئی نگاہوں کا خار بن چکی تھی۔

محسن رضا کے بعد باقی جو لوگ شبنم سے غیر محسوس طور پر محبت کرنے لگے تھے۔ اُن میں سرِ فہرست شیر دل کی ہستی تھی۔ جو روزِ اوّل ہی شبنم کی ذات کے سحر میں کھو کر اپنا آپ اس کے نام کر بیٹھے تھے۔ ایف ایس سی کے بعد وہ رضا ہاؤس سے چلے گئے تھے۔ اور اب سات سال بعد جب ''شبنم رضا'' اپنا کیریئر مکمل کر چکی تھی۔ وہ بھی فلائٹ لیفٹیننٹ ہو گئے تھے۔ اور بڑے عرصے بعد گھر آئے۔ شبنم کالج گئی ہوئی تھی۔ اپنی گاڑی میں وہ اسے لینے چلے آئے۔

شبنم حسبِ معمول محسن رضا کے انتظار میں گیٹ پر آئی تو شیر دل کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ فل یونی فارم میں ملبوس شیر دل نے ایک دم اسے سیلوٹ دے مارا۔ شبنم کی مسرت بھری نگاہیں اُن پر جم

گئیں۔

''آپ کب آئے؟''

''تمیز سیکھئے محترمہ پروفیسر صاحبہ۔ کیا واقعی آپ کو خبر نہیں کہ جب کوئی بندہ اتنی مدت بعد اتنی اچھی پوزیشن میں لوٹ کر آئے تو اس کا استقبال کس طرح کیا جاتا ہے۔'' وہ اترائے اترائے سے کہہ رہے تھے۔

''آپ نے موقع ہی کب دیا۔'' شبنم اُن کے نئے انداز پر زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

''خیر جلدی سے یہ بتا دیجیے کہ اس یونی فارم میں کیسا لگ رہا ہوں۔''

''اے ون۔'' خدا نظرِ بد سے بچائے۔'' شبنم کو دلی خوشی ہو رہی تھی۔

''آمین۔'' خوب صورت مسکراہٹ لبوں میں دبائے شیر دل نے کہا۔ وہ گاڑی میں آ بیٹھی۔

''آپ نے بتایا نہیں کب آئے۔''

''ابھی دو گھنٹے قبل۔''

''بغیر اطلاع کے۔''

''جی ہاں۔ اگر مطلع کر کے آتا تو آپ کیا کرتیں۔''

''ریڈ کارپٹ ویلکم نہ کرتی، کم از کم کچھ تو آپ کی آمد کی خوشی میں اہتمام ہوتا۔'' شبنم کی اس شوخی اور کھنکتے لہجے نے انہیں چونکا دیا۔

''اچھا۔ ویسے ایک بات پر سخت حیرت ہے۔''

''کس بات پر؟''

''کہ ہم میں تو جو تبدیلیاں آئیں سو آئیں۔ آپ بھی انسان بن گئیں۔''

''پہلے کیا تھی؟''

''صرف اللہ میاں کی گائے۔''

''خوب۔ یعنی آج تک آپ مجھے گائے ہی سمجھتے رہے۔''

''اور بھی بہت کچھ۔'' شیر دل نے دزدیدہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اس لہجے پر شبنم سٹپٹا سی گئی۔ کہ وہ اچانک بولے۔

''شبنم۔ وہ پینڈنٹ کیا ہوا۔ جو ہم نے آپ کو ایک خوب صورت موقع پر عنایت کیا تھا۔'' دونوں کی نظریں یک بیک اٹھیں۔ ایک دوسرے سے ملیں اور یک بیک ہی گلے میں جھولتے ''S'' پر پڑیں۔

''بڑی حفاظت سے رکھا آپ نے اسے کیوں بھلا؟''

''کسی بھی تحفے کا یہ حق بنتا ہے کہ اسے حفاظت سے رکھا جائے اور پھر یہ تو۔۔۔''

''جی ہاں سمجھ گیا یہ تو میرا دیا ہوا تحفہ تھا۔ سید شیر دل نقوی کا۔'' انہوں نے ایک ہاتھ سینے پر رکھا۔

''شبنم کیا واقعی میں تمہیں اس قدر عزیز ہوں کہ تم نے اسے ہمیشہ ایک عزیز شخص کے حوالے سے عزیز رکھا۔''

''کیوں نہیں، اس گھر میں آ کر شبنم ذرّے سے آفتاب بن گئی۔ یہ گھر اور اس کے باسی اُسے کیسے

عزیز نہ ہوں گے اور آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ شیر دل آپ تو میرے محسن، میرے مسیحا ہیں۔ مجھے نئی زندگی دینے والے۔ خودکشی کے عذاب سے بچانے والے۔ آپ کو تو میں مر کر بھی نہیں بھلا سکتی۔'' شبنم رنجیدہ سی ہوگئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''میں کیا تھی۔ آپ لوگوں کے التفات نے مجھے کیا بنا دیا۔ ایسی ہزار زندگیاں اگر میرے پاس ہوں اور وہ میں آپ سب کی محبت میں گزار دوں تو یہ بھی کم ہوگا۔''

''شبنم! بس تم یہی ایک زندگی ہمارے نام لگا دو۔''

''جی۔۔۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ اسی زندگی میں ہم سب سے محبت کرتی رہو تو کافی ہے۔'' انہوں نے ایک دم بات کا پہلو بدل دیا اور گاڑی کو ایک دم ٹرن کر کے رضا ہاؤس کے گیٹ میں داخل کیا۔

شام کی چائے پر سب لوگ موجود تھے۔ حسن محسن رضا کی گود میں بیٹھا اُن سے باتیں کیے جا رہا تھا۔ اُن کے ساتھ فرزانہ براجمان تھی۔ شہریار اور اسما بھی موجود تھے۔ سونیا اور شبنم ایک ساتھ بیٹھی تھیں۔ جبھی شیر دل آئے اور شہریار اور شبنم کے درمیان والی خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''ہیلو ایوری باڈی۔'' انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹکتے ہوئے حسن کی طرف دیکھا۔

''رضی انکل۔ یہ آپ کا حسن بیٹا تو بہت بڑا ہو گیا۔ ارے بھئی حسن صاحب آپ ہم سے تو ملے ہی نہیں۔''

''اجنبی لوگوں سے ملنا اُن سے باتیں کرنا ہمیں پسند نہیں۔ ہیں نا پاپا۔'' محسن رضا کو وہ پاپا کہہ کر بلاتا تھا۔

''اوہ مائی سن یہ کوئی اجنبی نہیں آپ کے ماموں ہیں۔''

''حسن کو اپنے پاپا کے سوا کسی سے پیار نہیں۔ گہرا رشتہ جوان ہی کے ساتھ ہے۔'' فرزانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شبنم نے فرزانہ کی طرف دیکھا۔

''آپ نے سچ کہا آنٹی۔ مجھے خود ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان سے میرا جنم جنم کا رشتہ اور تعلق رہا ہو۔ ان کی خوشی اور ان کے دُکھ سب کے سب میرے دل پر اثر کرتے ہیں۔''

''ہاں کچھ ناتے ضرور اتنے ہی مستحکم ہوتے ہیں کہ آدمی چاہنے پر بھی انہیں توڑ نہیں سکتا۔'' فرزانہ نے پھر ایک تیر محسن رضا کی طرف بڑھایا۔

''بات آپ نے ٹھیک کہی ہے آنٹی۔ یہ شاید روحانی ناتے ہوتے ہیں۔ جو دوری پر طویل عرصہ گزر جانے پر بھی نہیں ٹوٹ سکتے۔''

''اپنی اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے۔ پھر دل موہ لینے کے فن ہوتے ہیں کچھ لوگ سارے جہان کو اپنا اسیر بنا لیتے ہیں۔''

یہ اسما تھی۔ جسے شہریار کے لبوں سے شبنم کی تعریف ایک دن بھی اچھی نہ لگی تھی۔

''یہ کیسی عالمانہ گفتگو شروع ہوگئی۔ کچھ ہمیں بھی تو خبر ہو۔'' محسن نے مسکرا کر کہا۔

''انکل رضی۔ آپ کو شکار اور ڈاکٹری کے علاوہ کسی بات کی سمجھ آتی ہی نہیں ہے۔'' سونیا نے شکوے کے انداز میں کہا۔

''نہیں، نہیں سونیا بی بی! انہیں ڈاکٹری اور شکار کے علاوہ بھی ایک شے سے دلچسپی ہے۔ کیا تمہیں خبر نہیں۔''

''جی ہاں ضرور خبر ہے۔۔۔ اور وہ شے شبنم اور حسن ہیں۔'' سونیا نے سخت لہجے میں کہا۔

شبنم نے حیران ہو کر سونیا کی طرف دیکھا۔

''فرزانہ آنٹی۔ آپ میری بزرگ ہیں لیکن پلیز ہر بات سوچ سمجھ کر کیا کیجیے۔''

''جی ہاں سوچ سمجھ کر ہی میں نے یہ بات کہی ہے۔''

''وہ کس طرح؟''

''سونیا بی بی ابھی یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ میں چاہتی ہوں کہ خدا کرے کبھی تمہاری سمجھ میں نہ آئیں۔''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟'' سونیا نے پوچھا۔ سب خاموشی سے دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ایک ایسی عورت جس کے شوہر کے اعصاب پر ایک خوبرو لڑکی آسیب کی طرح سوار ہو، کہہ بھی کیا سکتی ہے۔'' فرزانہ نے ایک دم کھلے لفظوں میں کہہ دیا۔ محسن چونک اٹھے۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ فرزانہ؟''

''وہی جو ایک حقیقت ہے۔''

''کیسی حقیقت؟'' محسن رضا ہکا بکا تھے۔

''مجھے زیادہ کچھ کہنا بھی نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ کو اپنے بچے کی نسبت حسن زیادہ عزیز ہے۔ کیوں؟ مریم سے مشابہت رکھنے والی یہ لڑکی اگر آپ کو اس دیوانگی کی حد تک عزیز ہے تو مجھ سے شادی کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے ہی رکھ لیا ہوتا گھر میں۔''

فرزانہ اتنا کہہ کر کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

''فرزانہ۔۔۔!'' محسن رضا چیخ اٹھے۔

''آنٹی۔۔۔'' شیر دل نے بھی کرسی چھوڑ دی۔

شہریار نے حیران ہو کر سب کی طرف دیکھا۔ اسما اپنی جگہ بیٹھی زیرِ لب مسکراتی رہی۔ سونیا کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔

اور شبنم۔۔۔

اُس کے تو بدن میں گویا خون کا قطرہ تک نہ رہا تھا۔ صدمے سے اُس کے اعصاب ایک دم جواب دے گئے تھے۔ ہاتھ پیر یخ ہو گئے تھے۔

فرزانہ کے پیچھے محسن بھی کمرے سے نکل گئے۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔

''یہ سب کیا ہے سونیا۔ اس گھر میں ایسی باتیں کب سے ہونے لگیں؟''

''جب سے نئے لوگوں کے قدم آئے۔''

''آپ لوگوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہو۔ یا سیاہ کو سفید سمجھ رکھا ہو تو ٹھیک ہے لیکن ہر ذی شعور اس بات کو سمجھتا ہے۔ حقیقت حقیقت ہی ہوتی ہے۔'' اسما نے زہر خند سے کہا۔

''بھابھی۔۔۔ آپ خاموش رہیے۔ میں سب سمجھتی ہوں کہ یہ سب جھگڑا کس نے کھڑا کیا ہے۔''

''کیا سمجھتی ہو تم سونیا۔ ذرا مجھے بھی تو پتا چلے۔ نہ جانے تم لوگوں کو ایک غیر اور بے سہارا لڑکی سے اس قدر ہمدردی کیوں ہے۔ کیا دلچسپی ہے آخر؟''

''یہی ہمدردی ہے کہ وہ بے سہارا لڑکی تھی۔'' سونیا نے چبا چبا کر لفظ ادا کیے۔

''تم بھلا کب اُس کے بارے میں کچھ سنو گی۔ سب سے بڑی رازدار تو تم ہو اس کی۔ ویسے سونیا بیگم ذرا خاندان میں جا کر ایک ایک کی باتیں سن کر دیکھو کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔''

''کیسی باتیں؟ کس کی باتیں؟'' شیر دل بول اٹھے۔

''بھابھی بیگم! میری ایک بات سُن لیں۔ جسے شبنم کے متعلق کچھ کہنا ہو، مجھ سے کہے اور اپنا انجام دیکھتا رہے۔ فرزانہ آنٹی رضی انکل کے ناتے قابل احترام ضرور ہیں۔ لیکن جب وہ شبنم کے بارے میں غلط بات کہیں گی تو میں اُن سے بھی نپٹ لوں گا۔ اس لیے کہ اس غیر اور بے سہارا لڑکی کو میں اپنی زندگی بنا چکا ہوں اور بہت جلد شریکِ حیات بنانے والا ہوں۔''

کئی وزنی پہاڑ شبنم کے سر پر آ پڑے۔ یک نہ شُد دو شُد والا معاملہ ہو گیا۔

اس نے گھبرا کر باری باری سب کی طرف دیکھا۔ اسما نگاہوں میں حیرانی بھرے۔ شیر دل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شیر دل نے اپنا مضبوط و توانا ہاتھ شبنم کی طرف بڑھایا۔

اور ایک جھٹکے سے اسے کرسی سے اٹھا دیا۔

''میں نے سمجھا تھا تم میں سچ مچ انسانوں والی خُو بُو پیدا ہو گئی ہے لیکن نہیں۔ تم اب بھی وہی ڈری سہمی دبّو سی لڑکی ہو۔''

''شیر دل۔۔۔! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''وہی جو میرے دل و دماغ کا فیصلہ ہے۔''

''کیا میری رسوائیوں میں کوئی کمی رہ گئی ہے جسے آپ پورا کرنا چاہتے ہیں۔ میں بہت جلد یہ گھر چھوڑ دوں گی۔ بہت جلد۔'' وہ رونے لگی۔ حسن منہ کھولے حیران سا کھڑا تھا۔

اسی اثنا میں بھابھی وہیں آ گئیں۔ ساتھ ہی احسن رضا موجود ہوئے۔

''کیا ہوا؟ کیا ہو گیا؟ محسن کیوں لڑ رہے ہیں فرزانہ سے؟'' بھابھی نے سونیا سے پوچھا۔

''مما اس گھر میں ذہنیتیں مسموم ہو گئی ہیں۔ زنگ آلود ہو گئی ہیں۔ اس گھر میں ریاکاری، بدگمانی اور برے خیالات کا قبضہ ہو گیا ہے۔ یہاں منافقت کا راج ہے۔ اچھائیوں اچھی سوچ کو موت آ گئی ہے۔'' شیر دل نے سخت غصے کے عالم میں جواب دیا۔

''شیر دل بھائی تو حد سے بڑھنے لگے ہیں۔ ویسے فرزانہ آنٹی نے کوئی بعید از قیاس بات تو نہیں کہی۔ ایسا تو اکثر ہو جایا کرتا ہے۔'' اسما نے کندھے اُچکائے۔

''بھابھی بیگم آپ بھی اپنی حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کیجیے۔ آپ ان رضی انکل پر رکیک الزام لگانے کی کوشش کر رہی ہیں جو بھرے جہان میں ہر شے سے زیادہ ہم لوگوں کو عزیز ہیں۔ جن کی شرافت، پارسائی اور اعلیٰ کردار پر ہم سب کو فخر ہے اور میں آپ کی اس نام نہاد دشمنی کے سبب سے بھی خوب آگاہ ہوں۔''

''شیر دل بھائی آپ بھی تول کر بات کیجیے۔ ایک دو ٹکے کی لڑکی کی محبت میں جس نے اس گھر کے ہر مرد کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے، آپ کو میری توہین کا کوئی حق نہیں۔'' اسما نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ وہ تو شہریار کی ہر حرکت کا نوٹس لیتی تھی۔

بھابھی جوان کے جھگڑے کا سبب پوچھنے آئی تھیں۔ اس نئی افتاد پر اور بھی پریشان ہو گئیں۔ احسن رضا خاموش کھڑے یہ باتیں سن رہے تھے ایک دم غصے میں آ گئے۔

''اسما کیا تم لوگوں کی نگاہ میں کسی کا کوئی لحاظ یا شرم نہیں ہے۔ کیا کہہ رہی ہو تم اور کیا کہہ رہے ہیں یہ شیر دل؟''

شیر دل پپا کی وجہ سے غصہ ضبط کیے ہوئے تھے بولے۔

''پپا! صاف سی بات ہے۔ ان کو اور فرزانہ آنٹی کو شبنم کے اس گھر میں رہنے پر اعتراض ہے۔ رضی انکل کو ملوث کر کے شبنم کی ذات پر کیچڑ اچھالی جا رہی ہے۔''

''اسما اس گھر میں اب تک ایسی باتوں کا کوئی دخل نہیں رہا۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ شبنم ہماری بیٹی ہے۔ سونیا اور مونی سے بڑھ کر عزیز ہے۔ ہمیں اس کی معصومیت، قابلیت اور ذہانت پر فخر ہے۔ شبنم اس گھر کا ضروری حصہ ہے۔ فرزانہ بھابھی کو شبنم کی رہائش پر اعتراض ہے تو بے شک وہ اپنے شوہر کو لے کر سرکاری رہائش گاہ میں منتقل ہو جائیں۔ لیکن اسماء بی بی میں آپ کو اس کے بارے میں کوئی غلط بات کہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

وہ کمرے سے نکل گئے۔ شبنم نے حسن کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے حسن کو سینے سے لگا کر رُکے ہوئے سارے آنسو بہا ڈالنا چاہے۔

''چھوٹے سرکار! مجھے علم ہوتا کہ جرم محبت کی سزا کا دورانیہ اتنا طویل ہو گا تو میں بھول کر بھی آپ کے دیے فریب میں مبتلا نہ ہوتی۔ اب مجھے یہ ٹھکانا بھی چھوڑنا ہو گا، کیونکہ عزت کے بغیر زندگی بالکل بے کار ہوتی ہے۔''

''آپی۔۔۔!'' حسن نے اسے پکارا۔

''مت روئیں آپی۔ ورنہ میں بھی رو پڑوں گا۔ میں مما کو بلانے جا رہا ہوں۔'' وہ اپنا آپ چھڑا کر بھاگ گیا اور شبنم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

''شبنم۔۔۔ شبنم۔۔۔!'' سونیا کی گھبرائی ہوئی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔

''شبنم رضی انکل جا رہے ہیں۔ بریف کیس تیار کر رہے ہیں۔''

''میں خود بھی جا رہی ہوں سونیا۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں احسان فراموش بن رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں جو کچھ آپ لوگوں نے میرے ساتھ کیا اس سنگ دل اور بے درد زمانے میں اپنے خون سے

بھی اس کی توقع رکھنا عبث ہے۔ لیکن میں یہاں سے ضرور چلی جاؤں گی۔ مجھے حق بھی نہیں تھا سونیا۔ میں نے بہت کچھ ناجائز طور پر یہاں سے لے لیا جو کسی طور پر بھی واپس نہیں کر سکتی لیکن آئندہ کے لیے احتیاط تو کر سکتی ہوں۔''

''کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ جو کچھ تم نے اس گھر سے لیا وہ تمہارا نصیب تھا شبنم۔ تم نے ہم لوگوں کو دیا بھی تو بہت کچھ۔ رضی انکل کی ویران اور اجاڑ زندگی میں تمہارے دم سے رونق آئی۔''

''نہیں نہیں سونیا! میں یہ نہیں سن سکتی۔ مت کہو ایسا مجھے۔ کیا خبر تھی لوگ اسے اتنے غلط انداز میں سوچتے رہے۔ میری ذات سے اتنی غلط باتیں منسوب کرتے رہے۔ نہیں سونیا مجھ میں ایسی باتیں برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں۔''

''شبنم۔۔۔! مجھے یہ بتاؤ تم نے رضی انکل سے کیا رشتہ جوڑا؟ انہوں نے تمہیں کیا سمجھا اور کیسا تعلق نبھانے کی کوشش کی۔'' سونیا نے فوراً کہا۔

''وہ سب کچھ تمہارے سامنے ہے سونیا۔ لیکن۔۔۔!''

''لیکن ویکن کیا۔ انسان کی زندگی میں جب کوئی مقصد ہو اور مقصد بھی نیک ہو تو اس پر زمانے کے سرد و گرم کا اثر نہیں ہونا چاہیے ورنہ منزل نہیں مل سکتی۔ تمہارا اس گھر میں ایک مقام ہے۔ سب کے دلوں میں ڈھیر ساری جگہ ہے۔ اب تو تمہاری ایک خاص معاشرتی حیثیت ہے۔ تمہیں حسن کو پروان چڑھانا ہے۔ اسے اعلیٰ مقام تک پہنچانا ہے اور اس نیک مقصد کو تم لوگوں کی بے مقصد باتوں پر قربان کرنے لگی ہو۔''

''میں صرف یہ جانتی ہوں سونیا۔ ڈاکٹر صاحب پر آنٹی فرزانہ اور ان کے بچے کا حق ہے۔ اور میں کوئی حق تلفی نہیں کرنا چاہتی جو کچھ انہوں نے اب تک میرے لیے کیا۔ کیا وہ کافی نہیں ہے؟ احسان کا بدلہ یہی ہے کہ میں اس دنیا سے چپ چاپ نکل جاؤں۔''

''تم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی شبنم۔ تم وہی سات سال پہلے والی شبنم ہو۔ جو حالات کی تلخی سے گھبرا کر موت کو گلے لگانے چلی تھی۔ یہ زندگی ہے جس کے ہزاروں پرابلم ہیں اور ان کو حل کرنا انسان کا کام ہے۔ اتنی سی بات پر ہمت ہار گئیں۔ چلو چل کر رضی انکل کو روک لو۔''

''نہیں سونیا۔ مجھ میں تو ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں۔ میں کیسے جاؤں۔'' وہ اب بھی نیر بہائے جا رہی تھی۔

لیکن سونیا اسے گھسیٹ کر عمارت کے اس حصے کی طرف لے آئی جہاں محسن رضا کی رہائش تھی۔

خواب گاہ میں وہ بڑی تیزی سے اپنی الماری صاف کرنے میں لگے تھے۔ ضرورت کی چیزیں پیک کر رہے تھے اور فرزانہ منہ پھلائے ایک کونے کے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ دونوں کمرے میں داخل ہوئیں تو محسن رضا نے مڑ کر دیکھا اور ان کے حرکت کرتے ہاتھ رُک گئے۔

شبنم کی بھیگی آنکھیں ان کا دل چیر گئیں۔ وہ ان پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب۔۔۔!'' اتنا کہتے ہی وہ پھر رو پڑی۔

''آپ میری بدنصیبی میں حصہ دار بنے تھے۔ یہ احسان میں مرتے دم تک نہ بھول سکوں گی لیکن

میں آپ کو مزید کوئی دکھ دینا نہیں چاہتی۔ میں جا رہی ہوں۔ مجھے کالج کی طرف سے رہائش گاہ مل سکتی ہے۔ اور میں ایک دو دن میں وہاں شفٹ ہو سکتی ہوں۔ میری وجہ سے آپ گھر چھوڑ جائیں یہ تازیانہ میرے احساس کو بے طرح اذیت دے گا۔''

وہ خاموش کھڑے رہے۔ کئی ساعتیں گزر گئیں۔ پھر وہ آگے بڑھے اور انہوں نے شبنم کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

''بدنصیب تو میں تھا بیٹی۔ عمر بھر کی تلاش کے بعد جسے پایا اسے لمحوں میں کھو بیٹھا۔ پھر آوارہ گردی ہی قسمت میں لکھی گئی۔ تم زندگی میں آئیں تو جیسے زندگی کو زندہ رہنے کا بہانہ مل گیا۔ میں نے گھر میں رہنا، محفلوں میں بیٹھنا اور زندگی سے لطف اندوز ہونا سیکھا۔ تم نے مجھے سکھ ہی سکھ دیا۔ میری ذات کا ہر دم خیال رکھا، میری خدمت کی۔ تمہارے اصرار پر میں نے گھر بسا لیا۔ تم نے مجھے اتنا کچھ دیا جو شاید حقیقی بیٹی بھی نہ دے سکتی۔ تم تو بہار بن کر میری زندگی میں داخل ہوئیں۔ شرمندہ تو میں تم سے ہوں۔ میری وجہ سے آج تم پر ایسا غلط الزام لگا۔ اس گھر میں رہنے کا کیا فائدہ جہاں رہ کر میں تمہیں کوئی تحفظ نہ دے سکوں۔''

جانے کب شیر دل کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ایک دم محسن رضا کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''شبنم کو آپ کے تحفظ کی ضرورت نہیں ہے انکل لیکن آپ یہاں سے نہیں جائیں گے۔ شبنم کا فیصلہ درست ہے۔ اسے ہی یہاں سے جانا چاہیے۔ میں نے پپا سے بات کر لی ہے۔ دادی اماں کو بھی بتا دیا ہے۔ میں بہت جلد شبنم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ آپ کا گھر اور اہل خانہ آپ کو مبارک ہوں۔''

شبنم نے گھبرا کر محسن رضا کو اور محسن رضا نے شبنم کو دیکھا۔

شیر دل نے محسن رضا کا بریف کیس کھول کر ان کی اشیائے ضرورت پھر الماری میں رکھنا شروع کر دیں۔ محسن کمرے سے باہر نکل گئے۔ شبنم اور سونیا بھی چلی گئیں۔

فرزانہ اسی طرح صوفے پر بیٹھی رہیں۔ اچانک حالات نے عجیب سی کروٹ لی تھی۔

❁❁❁❁

''احسن! یہ قطعی ناممکن ہے کہ ایک بے نام و نشان بے سہارا لڑکی جو بظاہر اپنے آپ کو بیوہ بتاتی ہے۔ اصل حقیقت کیا ہے اس کی کسے خبر۔ یہ بچہ کس کا ہے ہم سب اس سے انجان ہیں۔ محسن رضا تو شروع سے علیحدہ مزاج کے ہیں۔ انہوں نے بھلا کبھی کوئی صحیح فیصلہ کیا۔ لیکن یہ شیر دل تو سمجھ دار اور باشعور ہے۔ اچھے برے کی پہچان رکھتا ہے شبنم کا وجود محسن کی ایک بالک ہٹ سمجھ کر میں نے اس گھر میں برداشت کیا۔ بادل ناخواستہ اسے اہمیت دی مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ میرے اتنے لائق فائق خوبرو پوتے کی بیوی کہلائے۔ اس خالص سید خاندان میں بے نام و نشان لڑکی بہو کی حیثیت سے شامل نہیں ہو سکتی۔ میں تم سب کو اس زیادتی کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔''

عابدہ خانم کو جب سے شیر دل کی اس آرزو کی خبر ہوئی تھی انہیں پل کے لیے بھی چین نہ آتا تھا۔ انہوں نے احسن رضا کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور واضح الفاظ میں انہیں بتا دیا۔

''غضب خدا کا، کیا شیر دل کے لیے لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے کہ وہ ایک بیوہ سے، ایک بچے کی

ماں سے شادی کرے گا۔ پورا خاندان منتظر ہے میرے بیٹے کا۔ میں جس طرف اشارہ کردوں لڑکی والے خود آگے بڑھ کر رشتہ دینے کو تیار ہوں گے۔''

''امی حضور! بات تو شیر دل کی ہے۔ آپ اسے سمجھا دیں۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔'' احسن رضا اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔

''تم باپ کس بات کے ہو۔ اولاد پر اتنا بھی رعب نہیں تمہارا۔'' عابدہ خانم نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''مجھے اس دن کی خبر ہوتی تو میں شبنم کو ہرگز یہاں رہنے کی اجازت نہ دیتی۔ ویسے بھی اب بہت ہو چکی ہے۔ اسما نے مجھے بتایا ہے آج جو کچھ ڈرائنگ روم میں ہوا۔ ایک غیر لڑکی کی اتنی ہمت کہ اس کی خاطر محسن بیوی سے الجھ پڑے۔ شیر دل نے اسما سے تلخ کلامی کی۔ یہ تو فساد کی جڑ بن گئی ہے میرے پُرسکون رضا ہاؤس میں ایسے جھگڑوں کی کوئی جگہ نہیں۔ ویسے بھی محسن کو زیادہ ہمدردی ہے تو اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دے کر چلتا کریں۔ اب تو ویسے بھی محسن کی مہربانیوں سے وہ خود کفیل ہو گئی ہے۔ اسے خود احساس ہوتا تو وہ اس گھر سے چلی جاتی۔''

احسن خاموش رہے۔ اسی اثنا میں فرزانہ ان کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''آؤ آؤ بیٹی۔'' عابدہ خانم نے انہیں پاس بٹھانا چاہا لیکن وہ کھڑی رہیں۔

''امی جان! میں گھر جا رہی ہوں اپنا مختصر سا سامان میں نے لے لیا ہے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ آپ کو مطلع کر دوں امی جان! عورت کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت ہے کہ اس کی موجودگی میں اس کا شوہر ایک دوسری عورت کو اپنی زندگی میں اس قدر اہمیت دیتا ہو۔ وہ بھی ایسی صورت میں کہ کوئی واضح رشتہ بھی اس کے ساتھ نہ ہو۔ میں جا رہی ہوں۔ اگر محسن صاحب خود کو اس سحر سے نکال کر مجھے اپنی زندگی میں کوئی مقام دینے کے قابل ہو جائیں تو آپ مجھے بتا دیجیے گا میں لوٹ آؤں گی۔''

''بیٹی۔۔! سنو تو سہی۔'' عابدہ خانم نے انہیں پکارا لیکن وہ غصہ میں کھٹ پٹ کرتی طویل راہداری کو عبور کر گئیں۔

''لو آج بھابھی گئی کل بہو چلی جائے گی تمہاری۔ بس تم سب لوگ اسے سامنے بٹھائے بیٹھے رہنا۔''

''امی جان غلطی سراسر فرزانہ بھابھی کی ہے۔'' احسن نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''تم اپنے بھائی سے کم ہو کیا۔ اس کلموہی سے تمہیں کم ہمدردی ہے کوئی۔ ٹھیک ہے۔ پھر میں یہ گھر چھوڑ دیتی ہوں۔ تم رہو اور تمہاری وہ چہیتی۔''

عابدہ خانم سخت غصے میں تھیں۔ احسن پریشان تھے۔ اتنے میں محسن وہیں آ گئے۔ ان کے ساتھ ہی بھابھی اور شیر دل بھی تھے اور سونیا بھی۔

سب اِدھر اُدھر پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''پپا! میں نے دادی اماں کو بتا دیا ہے۔ میں نکاح کے معاملے میں رسموں کا قائل نہیں ہوں۔ خالص اسلامی طریقے پر سب کچھ ہوگا۔ آپ جسے مدعو کرنا چاہیں کر لیں۔ میری چھٹی صرف تین دن باقی

ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان دنوں میں یہ مرحلہ طے ہو جائے۔"

"شیر دل! بزرگوں کے ہوتے ہوئے تم کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز کب ہو۔ شبنم سے تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔" عابدہ خانم نے انہیں ٹوکا۔

"وہ کیوں؟" شیر دل کے انداز میں سعادت مندی کا دخل نہیں تھا۔

"یہ پوچھنا بھی تمہارا کام نہیں۔"

"آخر کوئی وجوہات تو ہوں گی۔"

"کئی وجوہات ہیں۔"

"لیکن ان سے میں بھی آگاہ ہوں اور جن پر آپ کو اعتراض ہے مجھے نہیں۔ میں آپ کو بتا دوں کہ یہ فیصلہ میں نے اس دن کر لیا تھا جس دن اس کے گلے میں اپنے نام کی زنجیر پہنائی تھی۔ اس نے مجھے ناز و ادا کے جال میں نہیں پھنسایا دادی اماں۔ مجھے اس گھر میں آئے چند دن ہوئے ہیں لیکن میں ہر بات سے آگاہ ہوں دادی اماں! کچھ چہرے باطن کی تفسیر ہوتے ہیں۔ شبنم کا ماضی، اس کا حال، اس کا کردار، ذہانت، شرافت اعلیٰ نسبی سب کچھ اس کے چہرے پر تحریر ہے۔ وہ اپنی ذات میں جو کچھ بھی ہے میرا انتخاب ہے اور مجھے اپنے دماغ کے اس فیصلے پر ہمیشہ فخر رہے گا۔"

"ٹھیک ہے میاں۔ اگر تمہارے والد کی جرأت ہو کہ وہ میری مرضی کے خلاف قدم اٹھالیں تو ضرور اٹھائیں۔"

احسن رضا بے حد سعادت مند اور فرماں بردار قسم کے بیٹے تھے۔ ان میں عابدہ خانم کو ناراض کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ برسوں پہلے بھائی کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اب بیٹا سامنے تھا۔

"شیر دل! میں اپنی والدہ کی مرضی کے بغیر ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ آئی ایم سوری مائی سن۔ اس کے علاوہ کوئی لڑکی تمہیں پسند ہو تو۔۔۔"

"سوری پپا! ذہن کے معیار پر ہر لڑکی پوری نہیں اتر سکتی۔ آئی ایم ویری سوری۔" شیر دل سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ کسی کے پاس کرنے کے لیے شاید بات ہی نہ تھی۔

"آفٹر آل۔۔۔ میں شبنم کو اپنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ آپ لوگوں کو میری خوشیوں سے واسطہ نہیں تو کیا ہوا۔ دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ اور وہ تنہا اپنی ذات سے خوشیاں اور غم شیئر کرتے ہیں۔ تنہا خوشیاں سیلیبریٹ کرتے ہیں اور تنہا ہی غموں سے دنیا سجاتے ہیں۔"

شیر دل کمرے سے نکل گئے۔

اس سے اگلا دن خاموشی سے بیت گیا۔ شیر دل کہیں چلے گئے تھے۔ رات کو بھی گھر واپس نہ آئے۔ دوسرے دن ناشتے کی میز پر شبنم کو نہ پا کر محسن رضا اور سونیا ایک ساتھ شبنم کے کمرے میں آئے تو نہ حسن موجود تھا نہ شبنم۔

ایک دم کئی خیال دونوں کے اذہان میں آئے۔

"کہاں گئی شبنم؟"

دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر محسن کی نظر

سامنے میز پر رکھے کاغذ پر جا پڑی۔

''ڈاکٹر صاحب! گھر کے سب لوگ مجھ سے خفا ہو گئے۔ جو کچھ ان چند دنوں میں میرے سامنے آیا۔ وہ میں نے بھول کر بھی نہ سوچا تھا۔ آپ نے میری خاطر جو کچھ کیا وہ تا زیست میرے دل پر نقش رہے گا۔ سوچتی ہوں کہ میں تو عمر بھر احسان اتارنے کے قابل بھی نہ ہو سکوں گی۔ اگر اپنے والدین کے پاس لوٹ جانا مناسب سمجھتی تو ضرور چلی جاتی۔ لیکن اس راہ کو جس حال میں چھوڑا اب وہاں تک جانا ناممکن سا ہو گیا ہے۔ میں آج کالج کی طرف سے دیے گئے گھر میں چلی جاؤں گی۔ زندگی گزارنے کو حسن کا سہارا ہی بہت ہے۔ خدا کرے آپ ہمیشہ سکھی رہیں۔ گھر والوں سے معذرت خواہ ہوں کہ ان کے لیے آزار کا سبب میری ذات تھی۔ مجھے خبر ہوتی تو یہ فیصلہ میں کچھ عرصہ پہلے کر لیتی کہ بھرم تو رہ جاتا۔''

محسن رضا کے ہاتھ میں کاغذ کا یہ پرزہ لرز رہا تھا۔ انہوں نے اسے سونیا کی طرف بڑھا دیا۔

''عورت اس معاشرے میں کسی مضبوط سہارے کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس جذباتی لڑکی نے پھر اپنا آپ حالات کے حوالے کر دیا۔'' محسن بڑبڑاتے رہے۔ پھر وہ کھانے کے کمرے میں چلے آئے۔ جہاں شبنم کی عدم موجودگی کو کئی رنگ دے کر اس پر بحث کی جا رہی تھی۔ محسن کو دیکھ کر اسما خاموش ہو گئی۔ عابدہ خانم نے کڑوے تیوروں سے محسن رضا کو دیکھا اور احسن سے پوچھا۔

''شیر دل کہاں ہے؟ کیا ابھی تک واپس نہیں آیا؟''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔''

''اور صبح دم ہی وہ تم لوگوں کی لاڈلی دُلاری بھی غائب ہو گئی۔''

''امی جان! آپ شیر دل کے متعلق جو کچھ کہتی ہیں بے شک کہتی رہیں لیکن شبنم کے متعلق آپ کچھ بھی نہیں کہیں گی۔ وہ یہاں سے چلی گئی ہے اور آج سرکاری رہائش گاہ میں شفٹ ہو جائے گی۔ آپ اپنی بہو صاحبہ کو شوق سے اس گھر میں لے آئیے۔ اور یہ بھی سن لیجیے کہ شبنم بھول کر بھی شیر دل سے شادی کرنے کا نہیں سوچ سکتی۔ آپ سب لوگ مطمئن رہیے۔'' محسن رضا پھٹ پڑے۔

❁❁❁❁

شیر دل نے گاڑی ایک جھٹکے سے کالج کے گیٹ پر روکی اور اندر بڑھ گئے۔ ملاقاتی کارڈ چپراسی کے ہاتھ میں دیا تو کچھ دیر بعد پرنسپل نے انہیں اندر بلا لیا۔ اور تھوڑی سی تاخیر کے بعد وہ شبنم کے روبرو تھے۔ گہری نظریں اس پر جمائے۔ خفا خفا، برہم برہم، روٹھے روٹھے۔ بارعب انداز میں اس سے مخاطب ہوئے۔

''گھر کیوں چھوڑ آئیں؟''

''ناگزیر ہو گیا تھا گھر چھوڑنا۔ اب بھی تو ایک گھر میں ہی ہوں۔''

''میں نے تم سے کیا کہا تھا؟''

''میں نے سب سنا تھا۔''
''پھر۔۔۔؟''
''پھر کیا۔ بعض باتیں صرف سننے کے لیے ہوتی ہیں۔''
''کیا مطلب؟ کیا میری اور میری باتوں کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں؟''
''ہے۔ بہت زیادہ اہمیت ہے۔ لیکن وہ باتیں بے مقصد تھیں۔''
''What do you want to say (تمہارا مطلب کیا ہے) میں سمجھا نہیں شبنم۔''
''آہستہ بولیے شیر دل۔ یہ میرا آفس ہے۔ لوگ کیا سوچیں گے۔''
''سوچتے رہیں۔ بے شک جو کچھ چاہیں۔ کیا تم نے انہیں میرے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا؟ میں انہیں بتا دوں؟''
''اوہ شیر دل۔ پلیز خدا کے لیے۔''
''شبنم! مجھے کچھ اور نہیں کہنا سوائے اس کے گھر واپس چلو۔''
''نہیں۔ وہ گھر میرا گھر نہیں تھا۔''
''میرا تو ہے اور جب تک مجھ میں اور تم میں ایک تعلق خاطر ہے وہ گھر تمہارا ضرور ہے اور ہر حال میں ہے۔''
''وہ گھر میرا نہیں ہے کسی بھی حوالے اور تعلق سے بھی نہیں بس یہ میرا فیصلہ ہے۔''
''شبنم تم جانتی ہو نا؟''
''جانتی ہوں سب کچھ۔ لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ جو کچھ آپ چاہیں وہ ہو بھی جائے۔''
''شیر دل نے زندگی میں جو چاہا ہے سب کچھ پایا ہے۔''
''ضروری نہیں کہ آدمی ہر معاملے میں خوش نصیب ہو۔ لوگ بہت کچھ پا کر کھو بھی دیتے ہیں۔ شیر دل اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ پا لینا محض نظر کا فریب اور دل کا دھوکا ہوتا ہے۔''
''خیر کچھ بھی ہو۔ میں دوپہر کے وقت تمہیں لینے آؤں گا۔ تیار رہنا۔'' وہ اللہ حافظ کہے بغیر ریٹائرنگ روم سے نکل گئے۔ اور شبنم کتنی دیر وہیں کھڑی رہی۔
اس نے پرنسپل سے اجازت لے کر اس گھر کا رخ کیا جہاں اسے آباد ہوئے صرف دو دن ہوئے تھے۔ مشکلات کا ایک طوفان اسے چاروں طرف سے گھیر چکا تھا اور اب یہ ایک نئی الجھن شیر دل نے پیدا کر دی تھی۔ حالات کی اس الجھی ڈور کو وہ کیسے سلجھاتی، اس کی سمجھ سے باہر تھا۔
اچانک گھنٹی بج اٹھی۔ وہ چونک کر کرسی سے اٹھی۔ ٹائم دیکھا، حسن کے اسکول میں چھٹی ہو گئی ہو گی۔ اور وہ اب تک اسے لینے نہیں گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ بستہ گلے میں ڈالے حسن آگے کھڑا تھا اور پیچھے شیر دل۔
''کیا سمجھتی ہو؟ کالج میں تمہیں نہ پا کر میں اس جگہ تک نہیں آ سکتا تھا جسے تم اپنی پناہ گاہ سمجھے بیٹھی ہو؟''
وہ آگے بڑھ آئے۔ خالی گھر کے ویران در و دیوار کو دیکھتے بڑھتے آئے۔

''تم خوشیوں سے منہ موڑ کر تنہائیوں میں امان کیوں ڈھونڈ رہی ہو شبنم؟''

''مجھے انسانوں سے خوف آنے لگا ہے شیر دل!''

''کسی کے ساتھ تمہارا واضح اور مضبوط رشتہ جو نہیں ہے۔''

شبنم کو آفاق یاد آ گئے جن کے ساتھ اپنے مضبوط رشتے کا احساس کل سے زیادہ آج تھا۔ لیکن وہ کہاں تھے اس سے وہ بے خبر تھی۔

''نصیب کی بات ہے۔''

''کیا۔۔۔؟''

''ہاں۔ تنہا رہنا مقدر ہے۔''

''اسے مقدر نہیں بزدلی کہو۔ دیکھو شبنم میں تم سے وہی واضح اور مضبوط رشتہ جوڑ کر تمہارے نام کا، تمہاری خاطر اور تمہارے وجود سے ایک گھر آباد کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تم بلا کسی خوف و خطر کے عمر بھر آباد رہو۔''

''مجھے ہمدردی اور ترس نہیں چاہیے شیر دل۔ ڈاکٹر صاحب کی مہربانی نے مجھے اس قابل کر دیا ہے کہ میں بقیہ سفر آرام سے طے کر سکوں۔''

''زندگی کا سفر بہت طویل ہے شبنم۔ زادِ راہ نہ ہو تو آدمی کب تک چل سکتا ہے؟''

''کیا نہیں ہے میرے پاس۔ سر چھپانے کو ٹھکانہ۔ اخراجات کے لیے معقول رقم، تعلیم، قابلیت، عہدہ۔'' شبنم کے لہجے میں طنز حقیقت سے زیادہ تھا۔

''بہت مادّہ پرست ہو، یہ چیزیں تو عارضی رفیق ہیں۔ تمہارا زادِ راہ صرف اور صرف میری محبت ہو سکتی ہے۔ تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے اور حسن کو ایک سرپرست کی۔ ایک سائبان کی، جس کے سائے میں وہ دنیا کے سرد و گرم سے نا آشنا رہے۔''

''مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے شیر دل۔ پلیز، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

''لیکن مجھے سب کچھ چاہیے۔ اور وہ تمہاری ذات سے۔''

''میری ذات خود اپنے لیے ناکافی ہے۔ آپ کیا لے سکیں گے شیر دل۔ اس دنیا میں اچھی لڑکیوں کی کمی نہیں۔ خدارا آپ کسی نہ کسی کا ہاتھ تھام لیجیے۔''

''میں نے سات سال گھر سے دور رہ کر بہت کچھ دیکھا ہے شبنم، تو لڑکیاں بھی دیکھیں ہیں۔ حسین بھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی، اونچے خاندان کی بھی لیکن تمہیں کہیں نہ پا سکا۔ جہاں کہیں قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی تمہارے تصور نے میرے قدم روک دیے۔ میں حُسن تو پا لوں گا لیکن یہ معصومیت نہیں پا سکوں گا۔ محبت تو پا لوں گا لیکن ایک دوسرے کی خاطر مٹ جانے کا، جان قربان کر دینے کا جذبہ نہ پا سکوں گا۔ کردار کی یہ پختگی کہیں نہ ملے گی مجھے۔ یہ معصوم مسکراہٹ جو مردہ دلوں میں بھی روح پھونک دے۔ جو جینے کا عزم بخش دے۔ اسی مسکراہٹ کو میں اپنا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری بے لوث وفائیں اپنے نام کرانا چاہتا ہوں۔''

''آپ نے مجھ میں وفا کب دیکھ لی؟''

''کہانا کچھ چہرے اپنے باطن کی تفسیر ہوتے ہیں۔تمہارے چہرے پر لکھی ہے اور وفا شناسی کا علم میرے پاس ہے۔''

شبنم کے لبوں پر غمزدہ سی مسکراہٹ آ گئی۔

''شیر دل! اگر میرے پاس آپ کو دینے کے لیے ان میں سے کچھ بھی نہ ہو تب۔''

''میں نے کسی آس کے بغیر اپنا سب کچھ تمہیں دے دیا ہے تم کیسے نہ دو گی کچھ۔''

''نہیں شیر دل! یہ تا قیامت ممکن نہیں۔میں آپ سے عہدِ وفا تو کیا کروں۔وفا کا ذکر بھی نہیں کر سکتی۔میرے قدموں میں بڑی بھاری زنجیریں ہیں۔''

''کیسی زنجیریں شبنم! اس گریز اور پہلو تہی کی وجہ بھی تو ہو کوئی۔''

''کہانا بہت سی وجوہات ہیں۔''

''پھر بھی۔''

''شیر دل! دو فریق باہمی رضامندی سے زندگی کا سفر مشترکہ طور پر گزارنے کا عہد کرتے ہیں۔بتایئے بھلا میری مرضی کے بغیر آپ مجھے اپنی زندگی میں شامل کر سکتے ہیں؟ میں اب بھی جواب انکار میں دے رہی ہوں۔کل بھی یہی انکار ہوگا۔آپ مجھے کچھ بھی سمجھتے رہیں۔''

''گویا تمہیں اپنی زندگی کے اندھیروں سے پیار ہے۔''

''ہاں۔اجالوں کی آس میں۔''

''کون لائے گا وہ اُجالے؟'' شیر دل نے خالص مردانہ قسم کے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''کیا خبر کون؟'' شبنم کی نگاہیں خالی خالی سی تھیں۔

''مجھے اس خوش نصیب کا نام تو بتاؤ۔'' شیر دل کے ان الفاظ پر شبنم چونکی۔

''شیر دل۔آپ کو مجھ سے ایسے انداز میں بات کرنے کا حق نہیں۔'' شبنم کا لہجہ سخت ہو گیا۔شیر دل نے شکوے بھری نگاہ سے اسے دیکھا۔

''ہاں مجھے تو صرف تمہاری بے اعتنائی اور اجتناب سمیٹنے کا حق ہے۔جانے کس نے کہہ دیا تھا بغیر جانے بوجھے کہ محبت کا جواب محبت ہوتی ہے۔ہم نے تو اتنے سالوں کے خاموش جذبوں کے بدلے کچھ بھی نہ پایا۔کچھ بھی نہیں۔''

''آپ نے یہ جذبے سوچ سمجھ کر کسی کے حوالے کیے ہوتے۔''

''یہی تو المیہ ہے کہ یہ جذبے سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی نہیں دیتے۔'' شیر دل کی بات نے شبنم کو بہت پیچھے لا کھڑا کیا۔

سچ ہے۔جذبے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لیتے ہیں۔شیر دل بھی تو دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔لیکن وہ کیا کرے۔وہ بھی تو سخت مجبور و لاچار ہے۔جذبوں نے اس سے تو اپنی زندگی کے سارے اختیار چھین لیے ہیں۔وہ خود اپنے آپ کی نہیں شیر دل کی کیسے ہو سکتی ہے۔قصے جو ہونے تھے سب ہو چکے تھے۔باقی کیا رہ گیا تھا۔کیا تھا اس کے پاس جو وہ شیر دل کی محبت قبول کر لیتی۔

''کچھ بھی ہو۔میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

''تم تو یوں مجبور و لاچار نظر آ رہی ہو گویا کسی ان دیکھی زنجیر میں بندھی ہو۔''

''جو بھی سمجھ لیں۔ میری زندگی کے سارے مقاصد، سارے عزائم پورے ہو چکے شیر دل۔ میں صرف حسن کی ماں ہوں۔ بس اسی کے ساتھ میرا واضح اور مضبوط رشتہ ہے اور اسی کی آس پر زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''سوچ لو شبنم۔ ایسا نہ ہو کہ لمحے دسترس سے دور ہو جائیں اور پچھتاوا عمر بھر کا ساتھی بن جائے۔''

''وہ تو کب کا شریکِ سفر ہے۔ اب کسی بھی پچھتاوے پر دل دھڑکنا نہیں بھولے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھکرائے جانے پر بھی شکر گزار ہوں شبنم۔ تم نے کچھ دیا تو سہی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میں نے تم سے محبت کی ہے کسی صلے کی تمنا کیے بغیر۔ تمہیں پانے کی خواہش دونوں کی زندگی کو قابلِ رشک بنانے کی طرف ایک قدم تھا۔ تم نے میرے ساتھ کو قبول نہیں کیا۔ لیکن جذبے تو لازوال ہیں۔ سدا میرے دل میں رہیں گے۔ جب بھی ضرورت ہو مجھے پکار لینا۔ مجھے ضرور صدا دینا۔ تم میری خاطر عمر بھر کچھ نہ کر سکو مجھے حسرت رہے گی، آرزو رہے گی تمہارے کام آنے کی۔ تم میرے سنگ کوئی رشتہ نہ جوڑو لیکن حسن تو میرا بیٹا ہے۔ اس پر تو میرا کچھ نہ کچھ حق رہے گا۔ اور تم یہ حق مجھ سے نہیں چھینو گی۔''

شبنم ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''آپ۔۔۔ آپ شادی کر لیں شیر دل! ورنہ رضا ہاؤس کے باسیوں کی انگلیاں مجھ پر اٹھتی رہیں گی۔'' اس نے وہ بات کہہ ڈالی جو اس ساری گفتگو میں نہ کہی تھی۔

''ڈونٹ وری (پریشان نہ ہو) میں ناکامی کے غم میں جوگ نہیں لوں گا۔ ایک عورت کو بیوی کی حیثیت سے پوری اہمیت کے ساتھ اپنے گھر میں آباد کروں گا اور اس تجربے سے ضرور گزروں گا کہ جب دل اور دماغ مختلف سمتوں میں سفر کر رہے ہوں تو زندگی کا سفر کیسا لگتا ہے۔'' شیر دل نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا اور اللہ حافظ کہہ کر گھر کے دروازے سے باہر چلے آئے۔

❁❁❁❁

گھر کی فضاؤں میں اداسی رچ بس گئی تھی۔ فرزانہ شبنم کے جانے کے دوسرے دن عابدہ خانم کے کہنے پر لوٹ آئی تھیں۔ لیکن محسن رضا کے دل و دماغ پر چھائی اداسی اور پریشانی اسی طرح قائم تھی۔ وہ شبنم تک جانے کی ہمت نہ کر سکے۔ بازار جا کر گھریلو اشیائے ضرورت خریدیں اور نوکر کے ہاتھ پروفیسرز کالونی کے اس بنگلے تک بھجوا دیں جس میں شبنم رہائش پذیر تھی۔

ہاسپٹل سے انہوں نے شبنم کے کالج فون کیا۔

''شبنم! میں حسن کے لیے اداس ہوں۔ لیکن تم تک آنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔''

''ڈاکٹر صاحب! اداس تو حسن بھی ہے لیکن بعض محرومیوں کو ناچار قبول کرنا پڑتا ہے۔ میں چاہتی ہوں مجھے اور حسن کو آپ کے بغیر جینے کا ڈھنگ آ جائے۔''

''کیا شیر دل تم سے ملنے آیا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''پھر؟''

''پھر کیا۔۔۔ میں نے انہیں ناراض لوٹا دیا۔''
''بیٹی! اس دنیا میں کیا ممکن نہیں۔ تمہارے لیے بے حد مخلص تھا وہ۔''
''مگر میں ان کے لیے کبھی مخلص نہ ہو سکتی ڈاکٹر صاحب۔''
''چلو اسی بہانے میرا تم سے کوئی رشتہ تو ہوتا۔ میں تمہیں بیٹی نہ بنا سکا بہو تو کہہ سکتا۔''
''ڈاکٹر صاحب! میرا تو یہ حال ہے کہ میں اپنی ذات کو اپنا نہیں کہہ سکتی۔ ایک جذباتی فیصلے نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ شان بھی آن بھی، ماں باپ بھی، خدا نے آپ کی صورت ان سب چیزوں کا نعم البدل دیا تھا۔ وہ شیر دل کے اقدام نے چھین لیا۔ ایسا فیصلہ کیسے کر لیتی۔ آئینِ وفا کے کچھ تقاضے ہیں ڈاکٹر صاحب! ایک قانون کا باغی ہو تو کیا لازم ہے کہ دوسرا بھی اس کی تقلید کرے۔ جو کچھ بچ گیا ہے اس کی حفاظت ضرور کروں گی۔ خدا کبھی تو نظرِ کرم کر ہی ڈالے گا۔''
''تو کیا تمہیں اس کے لوٹ آنے کی امید ہے؟''
''اوہ ڈاکٹر صاحب! کیا آپ نے میری خوشیوں کا سرچشمہ اسی کی ذات کو سمجھ رکھا ہے۔ جس نے لمحوں کا چین دے کر برسوں کی اذیت میرا نصیب بنا دی۔ نہیں ڈاکٹر صاحب وہ ظالم شخص میرے خواب و خیال میں بھی ایک دشمن کے روپ میں آتا ہے۔ خوشیوں کا کیا ہے کسی بھی صورت میں مل سکتی ہیں۔ ہاں اگر ہمت کر سکی تو اپنے ماں باپ تک پہنچنے کی کروں گی تا کہ ان کے قدموں میں سر رکھ کر اپنی اس غلطی کی معافی مانگ سکوں اور ان لوگوں کی حقیقت ان پر واضح کر سکوں جنہیں وہ خدا کے بعد خدا کی دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے تھے اور آج بھی چاہتے ہوں گے۔''
''تم نے تو کبھی اس بات کی اجازت ہی نہیں دی کہ میں اس شخص کا گریبان پکڑ کر اس برسوں کی اذیت کا احتساب کر سکوں۔''
''صبر بہت بڑی دولت ہے ڈاکٹر صاحب! خدا یقیناً میرے ساتھ ہے۔ حسن آپ کو بے حد یاد کرتا ہے۔ وہ بچہ ہے نا میری مجبوریاں نہیں سمجھ سکتا۔ جو ہو سکے تو آج اس سے اسکول میں مل لیجیے گا۔''
محسن رضا کے پاس اب کوئی موضوع باقی نہ تھا۔ انہوں نے اللہ حافظ کہہ دیا۔

❁❁❁❁

ایک مدت بعد محسن رضا شکار کے لیے چلے۔ صرف اس ویرانی کے احساس کو ختم کرنے کی خاطر جو شبنم کے جانے پر وہ محسوس کرنے لگے تھے۔ شہریاران کے ساتھ تھے اور ایک دو کولیگز بھی نور پور کے جنگلات تک پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ جیپ خراب ہو گئی۔
رات کی تاریکی میں شاہراہ سے کافی دور سردی کے موسم میں رات گزارنا پریشان کن مسئلہ بن گیا۔ نہ آگے بڑھنے کے وسائل نہ پیچھے جانے کی ہمت۔
اُن کے دوست کو ان کی آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ ایک سال کی مدت سے انہوں نے اس طرف قدم بھی نہ رکھا تھا اور اب اچانک جا کر انہیں سرپرائز دینا چاہتے تھے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اور جب وہ سولنگ کے کنارے پریشان سے کھڑے اس مسئلے کا حل سوچ رہے تھے ایک سائیکل سوار راہ گیر ان کے قریب آ کر رک گیا۔ ان سے سلام دعا کی۔ رکنے کا سبب پوچھا اور اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔

جسے سب نے رات کی تاریکی میں غنیمت سمجھا۔ جیپ کو لاک کیا۔ سامان اٹھایا اور چل دیے۔ اس شریف آدمی نے کافی سامان اپنی سائیکل پر لاد لیا۔ اور ان کے ساتھ پیدل ہی چل پڑا۔

سنگی حویلی کے مین گیٹ پر پہنچ کر اس نے دستک دی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔

''صادق۔۔۔! بڑی دیر میں واپس آیا تُو۔''

ایک آواز پر محسن رضا نے سامنے دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی سائیکل والے آدمی سے مخاطب تھا۔

''ہاں چاچا! کچھ لوگ راستے میں مل گئے انہیں ساتھ لایا ہوں۔'' وہ باہر نکل آیا اور اندھیرے میں نو واردوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ محسن رضا آگے بڑھ آئے۔

''سلام صاحب۔ مجھے امداد حسین کہتے ہیں۔ میں ریاض احمد بخاری کی جائیداد کا نگراں ہوں۔ یہ حویلی ان ہی کی ہے جس کے دروازے ہر مہمان کے لیے کھلے ہیں۔ تشریف لے آیئے۔''

محسن رضا کے قدم ٹھٹک کر رہ گئے۔ ''ریاض احمد بخاری۔'' الفاظ دماغ میں ہلچل مچا گئے۔ وہ سُن سے ہو گئے۔

''آیئے نا جناب۔ زبردست ٹھنڈ ہے۔ اندر تشریف لے آیئے۔'' محسن رضا نے قدم آگے بڑھایا تو شہریار اور دوسرے لوگ بھی اندر آئے۔

ایک اور نام بھی ذہن کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا ''امداد حسین۔'' شبنم نے کئی بار یہ نام ان کے سامنے لیا تھا۔

لیکن یہ تھی ان کا ذہن نہ سلجھا پا رہا تھا۔ بہر حال وہ آراستہ و پیراستہ دیوان خانے میں آ گئے۔ گرم کمرے میں آ کر سب نے سکون محسوس کیا۔ لیکن محسن رضا مسلسل بے قرار تھے۔ اُٹھ کر باہر آ گئے۔

وہ برآمدے میں کھڑے تھے اور امداد حسین ملازم سے چائے کے برتن اٹھوائے اندر جا رہا تھا۔

''صاحب آپ باہر آ گئے؟''

''ہاں امداد حسین۔ اگر بُرا نہ مانو تو کئی باتیں پوچھنے کے لائق ہیں میرے ذہن میں۔''

''جی۔۔۔'' امداد حسین کا انداز استفہامیہ تھا۔

''امداد حسین، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کہیں یہ جاگیر جو ہر آباد والے ریاض احمد بخاری کی تو نہیں؟''

''جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ مگر آپ۔۔۔؟''

''ہاں امداد حسین۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ بہت اچھی طرح، بے حد قریب سے۔''

''آپ کا نام۔۔۔؟ میں نے تو آپ کو کبھی وہاں نہیں دیکھا۔''

''میں ڈاکٹر محسن رضا ہوں۔''

''ڈاکٹر محسن رضا۔۔۔'' امداد حسین نے حیرت کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔ لالٹین کی زرد روشنی میں وہ انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں ہاں ڈاکٹر محسن رضا۔۔۔ لیکن تم حیران کیوں ہوئے؟''

''اگر آپ وہی ہیں جو میں سمجھ بیٹھا ہوں تو خدا کی قدرت کے مہربان ہونے کا یقین آ جائے گا

مجھے۔'' امداد حسین نے شدّت جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے ان کا ہاتھ تھام لیا۔
''آپ میرے گھر چلیے سرکار۔ اختر آپ کو پہچان لے گی۔ ضرور پہچان لے گی۔''
اختر۔۔۔ اختر۔۔۔ یادداشت میں اضطراب پیدا ہوا۔ وہ بھی تیزی سے اس کے ساتھ بڑھے اور لمحوں میں امداد حسین کے گھر کے صحن میں داخل ہوئے۔
''اختر۔۔۔ اختر۔۔۔ ارے بھلی مانس کہاں ہو۔ ادھر آؤ نا دیکھو کون میرے ساتھ ہے۔'' امداد حسین رہائشی کمرے میں داخل ہوا۔ آواز سنتے ہی اختر دوڑی چلی آئی اور داخلی دروازے میں ششدر سی کھڑی رہ گئی۔ کتنی دیر محسن رضا کو دیکھتی رہی۔
''ڈاکٹر صاحب آپ۔ امداد حسین! جن کا انتظار کرتے کرتے ہم مایوس ہو گئے تھے۔ وہ آئے بھی تو کب جب ہمارے پاس ان کو دینے کے لیے کچھ نہ رہا۔
میں اختر ہوں ڈاکٹر صاحب گو میں مریم بی بی کی انّا کی بیٹی تھی لیکن بی بی مجھے سگی بہنوں سے بڑھ کر عزیز تھیں۔''
''مریم کہاں ہے اختر بی۔ میں تو اسے بھری دنیا میں کہیں نہ پا سکا۔''
''بی بی اس دنیا میں ہوتیں تو آپ تک ضرور آ جاتیں۔ وہ آپ سے بچھڑ کر بہت دن نہ جی سکیں۔''
''کیا مطلب؟ تمھیں کیسے خبر ہے؟''
''سرکار سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اپنے اس مہمان کا جس کا مدتوں انتظار کرتا رہا کیسے استقبال کروں۔'' امداد حسین بے حد خوش تھا اور رنجیدہ بھی۔ ''اختر! فی الحال تم مہمانوں کے کھانے کا بندوبست کرو۔ باتوں کے لیے پوری رات پڑی ہے۔'' محسن رضا امداد حسین کے ساتھ واپس حویلی میں آ گئے۔
کھانا تیار ہو گیا جب امداد حسین اختر کے پاس بیٹھا کھانا برتنوں میں ڈلوا رہا تھا۔ اختر نے پوچھا۔
''کیا تم سب کچھ ڈاکٹر صاحب کو بتا دو گے۔''
''ہاں۔ حرج بھی کیا ہے۔'' امداد حسین کے انداز میں پژمردگی تھی۔
''نہیں امداد حسین۔ میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاؤں گی۔ کیا جواب دیں گے ہم لوگ۔ جب انہیں یہ خبر ہو گی کہ وہ ایک بیٹی کے باپ ہوتے ہوئے بھی نہ اسے پا سکیں گے۔ نہ دیکھ سکیں گے۔''
''مجھ میں جھوٹ بولنے کا حوصلہ نہیں اختر۔ فریب اور جھوٹ نے ہی تو ہم سے ہماری بٹیا رانی چھین لی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ میں ہر بات سچ سچ بتا دوں گا۔''

❁❁❁❁

رات کے اندھیروں میں امداد حسین کے گھر میں روشن چراغ کی مدھم روشنی میں محسن رضا برسوں کا احوال ان دونوں کی زبانی سن رہے تھے۔ مریم کی تنہائی کا ذکر، عابدہ خانم کی گھریلو سیاست، مریم کی بے چارگی، ریاض محل میں واپسی، اختر کی وفاداریاں اور آخری دنوں میں گزرے حالات۔ ریاض احمد بخاری مریم کے لیے پتھر کے بنے تو پھر موم نہ ہو سکے۔ ریاض محل سے اسے تحقیر و تذلیل کے بعد جس بے یاری و مددگاری کی حالت میں نکالا۔ ان کا دل اس ذکر پر زخمی سا ہو گیا۔ انہیں یاد تھا اپنی واپسی پر انہوں

نے مریم کو ہر جگہ تلاشا تھا تو ریاض محل سے بھی مختلف ذرائع سے پتا چلانے کی کوشش کی تھی۔ عابدہ خانم نے تو سب کو یہی بتایا تھا کہ ایک شب اچانک مریم روپوش ہوگئی تھی۔

تو۔۔۔۔ اصل ماجرا یہ تھا کہ عابدہ خانم نے ذہنی طور پر اسے قبول نہیں کیا تھا۔ موقع پاتے ہی اس پر ظلم وستم توڑ ڈالے۔

محسن رضا کی آنکھیں اشک بہاتی رہیں اور وہ ہمہ تن گوش رہے۔ امداد حسین اور اختر بھی ساتھ ساتھ گریہ میں مصروف رہے۔

''سارا دھوکا اعتماد نے دیا۔ کیا اس دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ ماں کی ہستی سے تو جفا کا تصور وابستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر ایسا کیوں؟'' وہ حیران تھے اتنے سال گزرنے پر بھی عابدہ خانم نے انہیں کچھ نہ بتایا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! مریم بی بی کا خیال تھا کسی دن تو آپ واپس پاکستان آئیں گے۔ وہ آپ تک پہنچ جائیں گی۔ لیکن بڑے سرکار کی بے اعتنائی کا دکھ روگ بن کر چمٹ گیا اور وہ بچی کو جنم دیتے ہی ہم سے روٹھ گئیں۔''

''بچی؟'' محسن رضا پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

''کہاں ہے میری بچی؟''

دونوں کے سر جھک گئے۔ دونوں خاموش ہوگئے۔

''تم لوگ خاموش کیوں ہوگئے؟ جواب دو۔ بولو نا۔''

''ڈاکٹر صاحب! ہم بدنصیب لوگ جن کا آنگن بٹیارانی کے دم سے آباد تھا اپنی بہار کی حفاظت نہ کر سکے۔''

''کیوں؟ اسے کیا ہوا۔ کیا وہ بھی۔۔۔؟''

''ہاں ڈاکٹر صاحب وہ بھی ہم سے روٹھ گئی۔'' امداد حسین سسک اٹھا۔ وہ اپنی تہی دامنی پر رنجیدہ تو ہمیشہ سے تھے آج ناامید ہوگئے۔

''تو مریم۔۔۔ میری زندگی میں تمہاری آمد کا مقصد صرف تمہاری بربادی اور موت تھا۔ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں تم یوں چپ چاپ مر گئیں۔ ناکام ونامراد۔ تم اپنے محسن کے جیتے جی بے سہارا ہوگئیں۔ اپنا یہ جرم میں کبھی معاف نہیں کروں گا مریم۔'' وہ تصور میں مریم سے مخاطب تھے۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا سچ سچ ہر بات بتا دینے پر آپ ہم لوگوں کو معاف کر دیں گے؟''

''کیا مطلب؟''

''ہاں ڈاکٹر صاحب! بات ہی ایسی ہے۔'' امداد حسین کا انداز محسن رضا میں بے چینی اور اضطراب بھر گیا۔

پھر امداد حسین نے سب کچھ شبنم کے بارے میں بتا دیا۔ ریاض احمد بخاری کی توجہ، محبت، لوگوں کا خوف، ان کا فیصلہ اور شبنم کا اقدام۔ پھر اس کے گھر سے غائب ہوجانے کی داستان۔

حالات وواقعات کی کڑیاں ملاتے ملاتے محسن رضا کے لیے شبنم کو شناخت کر لینا ذرہ برابر دشوار نہ

رہا۔

شبنم ان کی اپنی بیٹی تھی جو درحقیقت بھی مریم کی واضح تصویر تھی۔ اس احساس نے اچانک غم کے سارے احساس محسن رضا سے چھین لیے۔ ان کے لب ہلے۔ وہ امداد حسین اور اختر کو شبنم کے بارے میں بتانا چاہ رہے تھے۔ ایک دم چپ ہو گئے۔ ابھی جس بیٹی کو وہ بیٹی کہہ کر حقیقی باپ کی حیثیت سے سینے سے نہ لگا سکے تھے امداد حسین سے اس کا ذکر کر دینا ایک بار پھر جدائی اور کشمکش و کشاکشِ حالات میں مبتلا ہونے کے مترادف تھا اور امداد حسین بہر حال ریاض احمد بخاری کا وفادار ہے ان سے کیسے ذکر نہ کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ خاموش ہو گئے۔

''شبنم کے بارے میں ریاض احمد کو خبر ہے۔''

''اس صدمے نے انہیں بیمار کر ڈالا ڈاکٹر صاحب۔ وہ گوشہ نشین ہو کر رہ گئے۔ وہ کسی سے اپنے اوپر گزرنے والے حادثے کا ذکر بھی نہیں کر سکتے اور غم انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ وہ تنہائی پسند ہو گئے ہیں اور تنہائی کی سزا موت سے بدتر ہے۔''

''ان کے بیٹے کہاں ہیں؟''

''سب نے اپنی اپنی الگ دنیا بسالی ہے۔ آفاق میاں تو سات آٹھ سال قبل لندن گئے تھے ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے۔ سنا ہے ان کی شادی سجاد بخاری کی بیٹی شہر بانو سے ہو گئی ہے اور وہیں پر ہی وہ ایک بچی کے باپ بھی ہو گئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں میں سرکار کے پاس گیا تھا تو وہ بتا رہے تھے کہ انہوں نے آفاق میاں کو بلوا بھیجا ہے۔ وہ پاکستان آ کر وکالت کریں۔''

محسن رضا کو اب کسی بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں ریاض احمد یا ان کے بال بچوں کے ذکر سے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ تو اڑ کر گھر پہنچنا چاہتے تھے تاکہ اپنی شبنم کو اپنی عزیز بیٹی کو اپنا کہہ سکیں۔ مدتوں کے پیاسے دل کو سیراب کر سکیں۔

صبح دم انہوں نے واپسی کی راہ لی۔ ہم سفر اس فیصلے پر حیران تھے لیکن انہوں نے کسی سے ذکر تک نہ کیا۔

رضا ہاؤس پہنچے تو ایک اور پریشان کن خبر ان کی منتظر تھی۔ عابدہ خانم پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا اور وہ گنگا رام ہاسپٹل میں تھیں۔ محسن اسی وقت ہاسپٹل کی طرف چل پڑے۔

لیکن ان کے پہنچنے سے قبل ہی انہوں نے دم توڑ دیا۔

❁❁❁❁

شبنم کو اس کی اطلاع جانے کس نے دی تھی۔ عابدہ خانم کی میت کے قریب سوگوار سی بیٹھی وہ خاموشی سے ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔ عالیہ خانم بھی آ گئی تھیں اور شیر دل بھی جن کے ساتھ ان کی بیوی بھی تھی۔ خوب صورت اور باوقار سی لڑکی۔ طل ہما جو شیر دل کے ونگ کمانڈر کی بیٹی تھی۔ گھر بھر میں کہرام سا مچا تھا۔ سب رو رہے تھے بلک رہے تھے۔ یہ گھر جس کی مالکہ عابدہ خانم تھیں۔ ان کے بغیر سب کچھ ویران لگ رہا تھا۔

تجہیز و تکفین کے بعد محسن رضا ڈرائنگ روم میں تعزیت کے لیے آنے والوں کے درمیان بیٹھے

سوگواری سے سوچ رہے تھے۔

''امی حضور! اچھا ہوا کہ آپ مر گئیں۔ اور ماں بیٹے کی محبت کے درمیان مصلحتوں کا پردہ حائل رہا۔ ممتا کی سرفرازی کا بھرم قائم رہا۔ اچھا ہوا کہ میں آپ کے حضور کوئی گستاخی نہ کر سکا۔ آپ کو شبنم سے چڑ تھی نا۔ مریم آپ کے لیے ناقابلِ قبول تھی۔ آپ کی انا کا علم بلند ہی رہا۔''

سوئم تک شبنم وہیں رہی۔ گھر خاندان کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہیں بھی دو گھڑی کے لیے سکون میسر نہ تھا۔

شام کو نماز ادا کرنے کے بعد محسن رضا لان میں آئے تو شبنم تنہا ایک کرسی پر نیم دراز جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

''بیٹی! اتنی سردی میں یہاں کیوں بیٹھی ہو اندر چلو۔'' وہ گڑبڑا کا اٹھ کھڑی ہوئی۔

''حسن کہاں ہے؟ صبح سے نظر نہیں آیا۔''

''اسے شیر دل کہیں باہر لے گئے ہیں۔''

دونوں اندر کی طرف چلے۔

''بہت خفا ہو مجھ سے۔ تین دن سے یہاں ہو لیکن ایک بار بھی اپنے پاپا سے بات کرنا گوارا نہیں کیا۔''

''نہیں۔ ایسی بات تو نہیں۔ آپ بھی تو مصروف رہے۔''

''لیکن اب تو شاید سارا وقت صرف تمہاری خاطر ہو گی!'' انہوں نے سوچا۔

شبنم نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

رات کو تنہائی کے لمحات میں انہوں نے فرزانہ کو پکارا۔

''فرزانہ بیگم۔ سنا ہے عورت مرد کے لیے سکھ اور دکھ دونوں کی ساتھی بنائی گئی ہے۔ آپ بھی میری شریکِ سفر ہیں۔ میری خوشیاں اور غم ضرور شیئر کریں گی۔''

''آپ نے مجھے اس قابل سمجھا ہی کب؟''

''آپ نے میرا در دِل سنا ہی کب؟'' محسن رضا نے فوراً کہا۔ ان کے لہجے میں نرمی تھی۔ سوز تھا۔

''فرزانہ بیگم! انسان غلط فہمیوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو تو دوسروں تک کب پہنچ پاتا ہے۔ آپ نے مجھ تک پہنچنے کی سعی کی ہی نہیں۔''

''آپ نے مجھے یہ حق ان چار سالوں میں کبھی نہیں دیا کہ میں آپ کے دل میں جھانک کر دیکھ لوں۔''

''لیکن اب تو دے رہا ہوں۔ میں نے اتنی مدت بعد آج یہ جان لیا ہے کہ چاکِ تقدیر پر سوزن تدبیر سے ہرگز رفو نہیں ہو سکتا۔ مریم کے ساتھ طویل زندگی کے روز و شب گزارنا ایک ایسی آرزو تھی جو مالکِ کائنات کو منظور نہ تھی۔''

فرزانہ نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

''مریم کو میں نے جن مشکلات کے بعد پایا اس کے تحت اسے کھو کر میرا دیوانہ ہو جانا بھی ایسی اہم بات نہ تھی۔ لیکن میں زندہ رہا۔ عقل و شعور اور زندگی کی احتیاجوں سمیت۔ فرزانہ! وقت ہر زخم کا مرہم سہی لیکن مریم سے جدائی کا غم سدا بہار ہے۔ میں نے صحرا نشینی بے شک نہ کی ہو لیکن صحراؤں کی خاک تو ضرور چھانی ہے۔ بھٹکتے بھٹکتے ایک دن شبنم سے ٹکرا گیا جو ہو بہو مریم کی ذات کا عکس تھی۔ میں نے اسے بیٹی بنا لیا۔ زندگی کچھ نہ کچھ بہل گئی۔ جب مریم مجھ سے جدا ہوئی تھی تو میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ مریم کے ساتھ ساتھ میں اس بچے سے محرومی کا درد بھی جھیل رہا تھا۔ شبنم کو پا کر میں نے تصور کر لیا کہ یہ میری بیٹی ہے اور آج یہ تصور حقیقت میں بدل گیا۔''

''وہ کیسے؟'' فرزانہ نے ایک دم سوال کیا اور جواب میں محسن رضا نے پچھلے تین دن سے قبل کے حالات دُہرا دیے۔

''فرزانہ میں نے اس سے قبل یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔ میں نے تم پر اعتماد کیا۔ تم سے مشورہ طلب کیا۔ تمہیں ہی شریکِ راز بنایا۔ فرزانہ! زندگی کے جانے کتنے ایام ہم دونوں ایک دوسرے کی رفاقت میں گزاریں گے۔ میں تم سے کچھ طلب نہیں کرتا۔ بس ایک اپنی بیٹی کے لیے ممتا کے جذبے۔ وعدہ ہے میں تمہیں وہ سب کچھ دینے کی کوشش کروں گا جو میرے پاس ہے۔ تم ایک باشعور عورت ہو فرزانہ۔ ویل ایجوکیٹڈ، روشن خیال، تم میرے درد کو باخوبی سمجھ سکتی ہو۔ میری زندگی میں شبنم کی اہمیت سے واقف ہو۔ میں اسے بھی وہ کچھ دینا چاہتا ہوں جو وہ اپنی بدنصیبی کے تحت آج تک نہیں پا سکی۔ ایک عورت بن کر سوچو۔ صرف ایک عورت جس کا قلب وسیع ہوتا ہے۔'' محسن رضا نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''محسن آپ نے مجھے اس زاویے سے سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ میں سراسر حسد کا شکار ہو گئی۔ شبنم آپ کی ذات پر حاوی تھی۔ آپ کا نظریہ کچھ بھی تھا لیکن بدگمانی بھی تو عورت کا ایک نام ہے۔ پھر اس جذبے کو عاصمہ اور اسما نے بھی ہوا دی۔''

''غلطی تو میری بھی ہے۔ جب تمہیں اپنی زندگی میں شامل کر لیا تو وہ مقام ضرور دیتا جس کی ہر وہ عورت حق دار ہوتی ہے۔ جو بیوی بن کر کسی مرد کی دنیا میں داخل ہو۔'' محسن رضا کھلے دل سے اپنی کوتاہی کا اعتراف کر رہے تھے اور فرزانہ کے آنسو پلکوں سے تواتر کے ساتھ گر رہے تھے۔ محسن نے فرزانہ کو اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا اور ان کے آنسو اپنی ہتھیلیوں سے پونچھ ڈالے۔

❁❁❁❁

سوئم گزرتے ہی شبنم رضا ہاؤس سے چلی گئی۔ وہاں جا کر اسے بے حد اجنبیت کا احساس ہوا تھا۔ ہر شخص اپنی دنیا میں مگن نظر آ رہا تھا اور تو جو کچھ ان ہی محسن رضا کے سلوک میں بھی بے گانگی کی جھلک تھی۔ سونیا اور مونی تو مہمانوں کے سنبھالنے میں مصروف تھیں۔ احسن رضا باہر رہتے۔ شہریار اور اسما کی اپنی مصروفیات تھیں۔ عالیہ خانم اور ان کی بیٹیوں کو مہمان خواتین سے فرصت نہ تھی۔ وہ تنہا بیٹھی رہتی۔ اس لیے سوئم کے بعد اس نے وہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔ بس عابدہ خانم کی حیثیت اس کے لیے بزرگ جیسی تھی اور ان کی موت پر وہ خود کو وہاں جانے سے باز نہ رکھ سکی۔ لیکن گھر آ کر اپنے وہاں قیام پر پچھتاتی

رہی۔ شیر دل نے ایک بار بھی اسے مخاطب نہ کیا تھا۔ ہاں حسن کو کئی بار باہر لے گئے تھے۔ ضرورت کی کئی چیزیں بھی خرید کر دی تھیں۔ کئی باتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں اور تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ آدمی اپنے خاندان سے دور بھی نہ ہو۔ کہتے ہیں ''اکیلا نہ روتا بھلا نہ ہنستا بھلا۔'' اس کے ساتھ بھی یہی کچھ تھا۔ محبت نے اسے بڑی کڑی سزا دی تھی۔

اس سہ پہر وہ کالج سے واپس آ کر بے مقصد ہی بیڈ پر دراز تھی۔ حسن کھانا کھانے کے بعد حسب معمول اپنی دنیا بسائے بیٹھا تھا۔ وہ زیادہ تر کھلونوں سے تنہائی آباد کرتا تھا۔ شیر دل نے اُڑنے والے جہاز لے دیا تھا۔ بس وہ اسے اڑتا دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ تبھی کال بیل بج اٹھی۔ شبنم کسلمندی سے اٹھی اور کوریڈور میں آ کر بیرونی دروازہ کھول دیا۔

اس کے عین سامنے خلافِ معمول غیر یقینی انداز میں ایک ہستی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

''فرزانہ آنٹی آپ۔۔۔!'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں شبنم میں۔ کیا اندر آنے کو نہ کہو گی؟''

اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ فرزانہ آگے بڑھیں اور دونوں بازو کھول کر شبنم کو گلے لگا لیا۔ اس افتاد پر اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''شبنم! جب کوئی سارے گلے شکووں پر نادم ہو کر چل کر کسی کے پاس آ جائے تو دل پر چھائی کدورت آپ ہی آپ دھل جاتی ہے کیا؟''

''آنٹی آپ اندر تو آئیں۔'' شبنم نے ان کا بازو تھام لیا۔

''نہیں یہ بات میرے سکون کی خاطر یہیں بتا دو۔ میں ایک ماں کی حیثیت سے تمہارے پاس آئی ہوں شبنم بیٹے۔''

''ماں۔۔۔!'' شبنم کی نگاہوں میں حسرت تھی حیرت کے ساتھ ساتھ۔

''ہاں ماں۔ بے شک ماں وہی ہوتی ہے جو جنم دے لیکن باپ کی بیوی بھی تو ماں ہی ہوتی ہے۔ میں قانونی طور پر تو ماں خود بخود بن گئی۔ عملی طور پر خود کو ثابت کر دوں گی۔'' ان کا لہجہ شبنم کے لیے نامانوس تھا۔

''آنٹی۔ آپ کی یہ باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔''

''تم ہر معاملے سے انجان جو ہو سمجھ میں کیسے آئیں۔'' وہ مسکرائیں۔

''کیسا معاملہ؟''

''اپنے اور محسن کے مابین تعلق کا معاملہ۔''

''میرا ان سے تعلق۔۔۔'' وہ حیرت زدہ تھی۔ ساتھ ہراساں و پریشان۔

''ہاں۔ باپ بیٹی کا عظیم رشتہ۔''

''نہیں آنٹی۔ یہ دیوانے کا خواب ہے۔ باپ تو صرف وہی ہوتا ہے جس سے خون کا رشتہ ہو۔''

''ہاں۔ باپ صرف وہی ہوتا ہے جس سے خون کا رشتہ ہو اور وہ محسن رضا ہیں تمہارے بابا۔ تمہارے سگے والد۔''

شبنم کے قدم لڑکھڑائے۔
''کیا یہ کوئی نیا مذاق ہے آنٹی۔'' سخت مردم گزیدہ تھی شبنم۔
''بیٹی! ایک حقیقت کو تم مذاق کہہ رہی ہو۔ ان کی بیوی مریم ہی تمہاری والدہ تھیں۔''
''نہیں۔ میری ماں کا نام اختر اور والد کا نام امداد حسین ہے۔''
''وہ تمہاری والدہ کے خاندانی ملازم ہیں۔ تمہارے والدین نہیں۔''
''نہیں نہیں۔'' شبنم کا چہرہ فق ہو گیا۔
''شبنم مجھے اتنی خبر ہے کہ میں ماں بن کر تمہیں لینے آئی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ تم بھی مجھے ٹھکراؤ گی نہیں۔''
اسی اثنا میں محسن رضا بھی اندر آ گئے۔
شبنم یقین اور بے یقینی کی کیفیتوں کے درمیان ڈولتی انہیں دیکھتی رہی۔ یہ چہرہ بے حد عزیز رہا تھا اسے۔ اس وجود کی ہلکی سی تکلیف اسے تڑپا دیتی تھی۔ اس ہستی کا چھوٹا سا غم اسے رنجیدہ کر دیتا تھا۔
کیا یہ سارا معاملہ اسی خون کے رشتے کا محتاج نہ تھا جو دونوں کے مابین تھا۔
وہ تڑپ کے آگے بڑھی۔ اور پہلی بار پاپا کہہ کر ان کے سینے سے جا لگی۔ دونوں جی کھول کر روئے۔ دہاڑیں مار کے روئے۔ اسی چیخ و پکار پر حسن حیران و پریشان ان کے قریب آ کر ہونقوں کی طرح ان کے منہ دیکھنے لگا تو فرزانہ نے اسے گود میں بھر لیا بلکہ سینے سے لگا لیا۔ رومال سے آنکھیں صاف کرتے محسن رضا نے حسن کو فرزانہ کی گود سے اپنی گود میں لے لیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔
جانے کتنی گھڑیاں بیت گئیں۔ باپ بیٹی ماضی میں کھوئے رہے۔ ایک ایک لفظ محسن نے شبنم سے کہہ ڈالا۔
لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ شبنم زندگی کی اس اہم تبدیلی پر حیران تھی۔ ''رضا ہاؤس'' اس کا اپنا گھر تھا۔ اسے یقین ہی نہ آ رہا تھا۔ ماں کے ان دیکھے وجود کا تصور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گیا۔ محسن رضا اور فرزانہ اسی وقت اسے اپنے گھر لے گئے۔
گھر بھر میں اس حیرت انگیز خبر نے خوشی کی لہر دوڑا دی۔
رات گئے شبنم اپنے بستر پر لیٹی اس گھر کے بارے میں نہیں ''ریاض محل'' کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جہاں اس کے سنگ دل ماموں ''بڑے سرکار آباد تھے۔ جہاں سے اس کی والدہ کو بے سہارا نکال دیا گیا تھا۔ جہاں کے اک باسی اس کے ماموں کے بیٹے نے اس سے اچھی زندگی کے سارے خواب چھین کر حالات کی تلخیاں اس کا مقدر کر دی تھیں۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ ''گویا ظلم کرنا ''ریاض محل'' کی روایات میں شامل ہے۔''

❁❁❁❁

شیر دل کو اس خبر نے خوشی دی یا نہیں اس کا فیصلہ وہ خود بھی نہ کر سکے۔ سخت ناراض تھے وہ شبنم سے۔ عابدہ خانم کی وفات پر اس سے بات تک نہیں کی تھی۔ لیکن اب ان سے رہا نہیں گیا دل میں بسنے والوں سے بھلا کون زیادہ دیر ناراض رہ سکتا ہے۔ فون کر ہی ڈالا۔

''نیا رشتہ مبارک ہو میری عم زاد۔ میرے جذبوں کا بھرم رکھ لیتیں تو آج یہ خوشی کسی اور رنگ میں ہوتی۔'' شکوہ قائم و دائم تھا۔

''یہ خوشی میرے لیے تو بہت بڑی ہے شیر دل۔ آپ سب میرے ہیں۔ میرے اپنے۔ میرے عزیز۔''

''شبنم میری نگاہ میں وہی رشتہ سب سے مقدم، سب سے خوب صورت اور سب سے عظیم ہے جو تمہیں دیکھ کر میرے دل نے جوڑ لیا تھا۔ مجھے اس خبر نے کوئی ایسی خوشی نہیں دی جسے میں غیر معمولی کہہ سکوں۔ خونی رشتے تو محض ایک اتفاق ہوتے ہیں۔'' شیر دل جانے کیا جتانا چاہ رہے تھے۔

''لیکن شیر دل انسان کو صرف اس چیز کی قدر ہوتی ہے جو اس کے پاس نہ ہو۔ میرے لیے تو یہ زندگی کا اہم ترین حادثہ ہے جس کے خوش گوار احساس نے میرے اندر تک مجھ میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ کیا آپ یہ خوشی شیئر نہیں کریں گے؟''

''ٹھیک ہے۔ ہم بھی اس خوشی میں تمہاری خوشی سمجھ کر خوش ہیں۔ ہم آئیں گے شبنم۔ ضرور آئیں گے۔''

''رضا ہاؤس'' ایک بار پھر امن و سلامتی اور مسرت کا گہوارہ بن چکا تھا۔ پورے خاندان میں یہ خبر برق کی سی تیزی سے پھیل گئی تھی۔ دوست تو خوش ہوئے لیکن دشمنوں نے بھی خلوص کا ماسک چڑھا کر اس خبر کا خیر مقدم کیا۔ اسما کی بہت بڑی شکست تھی یہ خبر۔ وہ شبنم سے دور دور رہی تھی۔ لیکن شبنم نے خلوص کے ساتھ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عابدہ خانم کے بعد گھر کی بزرگ بھابھی تھیں جن کا احترام ان کے اعلیٰ کردار کے سبب ہر دل میں تھا اور اب تو فرزانہ میں بھی ایک دم بہت ساری تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے ساتھ کے تین کمرے شبنم کے لیے سنوار دیے جن میں سے ایک لائبریری کے طور پر تھا۔ ایک شبنم کا بیڈ روم اور ایک حسن کا بیڈ روم۔

زندگی نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ حالات نے نیا رخ اختیار کیا تھا۔ یہ تبدیلی شبنم کی زندگی میں تحفظ اور اعتماد کے خزانے لے کر آئی تھی۔ پھر بھی اسے اختر اور امداد حسین یاد تھے۔ ایک شب کھانے کے بعد محسن رضا نے اسے اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ فرزانہ حسن اور اپنے بیٹے عامر کے ساتھ مصروف تھیں۔ محسن رضا کی پیار بھری نظریں شبنم پر جمی تھیں۔ آسمانی رنگ کے سادہ سے سوٹ میں وہ مریم کا عکس نظر آ رہی تھی۔ محسن رضا نے بڑے پیار سے اسے قریب بٹھا لیا۔

''مجھے آج اپنی بیٹی سے بہت کچھ کہنا ہے، بہت کچھ پوچھنا ہے۔''

''میں بھی سوچ رہی تھی پاپا۔''

وہ کتنی دیر گفتگو کرتے رہے۔ امداد حسین اور اختر سے متعلق ریاض احمد بخاری سے متعلق بہت پہلے بتا چکے تھے۔ جو رہ گیا تھا بتا رہے تھے۔

''شبنم۔ اس سے قبل ایک غیر لڑکی سمجھتے ہوئے، مجھے تمہارے ماضی سے واسطہ نہ تھا۔ سو میں نے کچھ نہ پوچھا لیکن اب باپ کی حیثیت سے یہ میری ذمہ داری ہے۔ بیٹی! میں تمہاری زندگی کو موہوم امیدوں کے سہارے گزرتا نہ دیکھ سکوں گا۔ تم مجھے اس کا نام تو بتا دو۔ جس نے۔۔۔''

''میں بھی بتانے آئی تھی پاپا۔ وہ کوئی غیر نہ تھا۔ اسی ''ریاض محل'' کا ایک باسی تھا۔ ریاض احمد بخاری کا بیٹا۔ آفاق احمد بخاری۔'' محسن نے ایک دم شبنم کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں چار پانچ سالہ آفاق گھوم گیا۔ جس پر مریم جان نچھاور کرتی تھی۔

''اچھا۔۔۔ تو وہ آفاق تھا۔'' انہوں نے سر ہلایا۔ ترکش سے نکلا تیر واپس کس طرح آتا۔ تقدیر ان سے یہ کھیل کھیل چکی تھی۔

''شبنم بیٹی ہونی تو ہو کر ہی رہتی ہے بیٹی۔ یہ محبتوں اور رفاقتوں کے سلسلے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ مجھے اپنی مظلوم بیٹی کی خوشیاں ہر قیمت پر خریدنے کی حسرت ہے۔''

''پاپا! آپ نے مجھے مظلوم کہا۔ نہیں پاپا۔ میں مظلوم تو نہیں آپ جیسے والد کی قربتوں میں، میں تو خود کو خوش نصیب ترین انسان سمجھ رہی ہوں۔''

''بیٹی تم نے غلط سمجھا۔ میرا مطلب ان حالات سے تھا جو تم پر بیت گئے۔''

''میں تو شکر گزار ہوں اپنے رب کی۔ اگر یہ حالات نہ ہوتے تو آپ تک آنا بھی محال ہو جاتا۔''

محسن رضا اصل میں کچھ اور کہنا چاہ رہے تھے۔

''بیٹی! میں کہنا چاہ رہا تھا۔ اگر تم آفاق کے پاس جانا چاہو تو میں اسے مطلع کروں۔ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کروں۔''

''پاپا۔۔۔ میں جو پہلے ہی اپنی ذات سے شرمندہ ہوں آپ مجھے اور بھی نادم کرنے لگے ہیں۔ وہ تو نادانی تھی۔ ایک بھول تھی انجانے میں ہو گئی۔ ریاض محل والے سفاک قاتل ہیں، ظالم ہیں۔ انہوں نے میری ماں پر بدترین حالات میں بھی رحم نہیں کھایا۔ مجھ سے ان کے بیٹے نے کھیل رچایا اور میں ان کے پاس جاؤں گی۔ پاپا اب تو سمجھ میں نہ آنے والی باتیں بھی میری سمجھ میں آنے لگی ہیں۔ کیا بابا نے پوری داستان میں ایک بار بھی یہ ذکر کیا کہ ان سات آٹھ سالوں میں ایک بار آفاق میری خاطر وہاں آئے۔ اگر انہوں نے ایک بار بھی ایسا کیا ہو تو میں سارے گلے بھول کر ان کے پاس چلی جاؤں گی۔ مگر نہیں پاپا۔ بڑے آدمیوں کی خواہشات انہونی بھی ہوں تو پوری ہو جایا کرتی ہیں۔ آفاق نے خلوص کا دھوکا دے کر مجھے لوٹ لیا۔ مجھے خبر ہے ان کی نظر میں یہ نہ کوئی حادثہ ہوگا نہ سانحہ۔ بس معمول کی ایک چھوٹی سی رنگینی۔ اور یہاں میں برباد ہو گئی۔ میں تو ان کا نام لبوں تک لانا بھی گوارا نہیں کرتی۔ سچ پاپا! وہ ایک بار بھی بابا کے پاس آئے ہوتے، میرے مر جانے کی خبر پا کر مایوس ہو کر پھر میرا نام بھی نہ لیا ہوتا انہوں نے تو میں خود ان کے پاس چلی جاتی لیکن اب۔۔۔ اب نہیں۔ آٹھ سال بہت بڑی مدت ہے۔ انہوں نے مجھے خلوصِ دل سے اپنایا کب تھا جو اپنا سمجھ کر یاد رکھتے۔ بس پاپا۔۔۔ میں نے اپنی زندگی سے ان کے وجود کا احساس ہی نکال باہر کیا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے میری پیاری بچی تو پھر ہمیں قانونی چارہ جوئی کرنی چاہیے۔ چاہے کچھ ہو قانونی طور پر تم اسی کی ہو۔''

شبنم گھبرا گئی۔

''نہیں پاپا! میں آزاد ہوں تو کیا۔ پابند رہوں تو کیا۔ زندگی میں جو کچھ پانا تھا پا لیا۔ میری نادانی

سہی۔لیکن حسن کی صورت میں مجھے تو کائنات مل گئی ہے۔اب میں آپ کے لیے، حسن کے لیے اور اپنے چھوٹے سے بھیا عامر کے لیے جیوں گی اور عزم اور حوصلے کے ساتھ۔ مجھے بس آپ کا تعاون چاہیے۔آپ کا پیار چاہیے۔''

محسن رضا آبدیدہ ہوگئے۔انہوں نے شبنم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''پگلی بیٹی۔ مجھے تمہاری خوشی ہر حال میں عزیز ہے۔''

''پاپا! کل تک تو میں آپ کے التفات کو احسانِ عظیم سمجھ کر اپنی قسمت پر قانع اور صابر تھی۔خاموش تھی لیکن آج تو اسے احسان نہیں اپنا سمجھ رہی ہوں۔ایسا حق جو ایک عرصے سے آپ کے پاس تھا لیکن میں لے نہ سکی۔اب تو وہ سب کچھ لوں گی۔ذات کی اہمیت کا تعین ہو جائے تو زندگی کے سارے ڈھنگ بدل جاتے ہیں۔مجھ میں چند دنوں میں خود اعتمادی آ گئی ہے۔ میں اپنی ان تبدیلیوں پر حیران ہوں۔ جینے کے نئے ڈھنگ میں عزم و استقلال ہے۔کچھ کرنے کی آرزو ہے۔کچھ بننے کی امنگ ہے۔بس اپنے عظیم پاپا کا تعاون درکار ہے۔''

''شبنم ہماری دنیا تم پر نثار ہے۔تم حکم کرو۔''

''نہیں پاپا۔حکم نہیں درخواست۔'' وہ مسکرائی۔

''بولو تو سہی۔'' محسن رضا بھی متبسم ہوئے۔

''مجھے پی ایچ ڈی کرنے دیجیے۔''

''بس اتنی سی بات۔کل ہی چلی جاؤ۔ مجھے کیا اعتراض ہے۔علم کے سمندر میں ساری عمر غوطہ زن رہے تو بھی آدمی خود کو علم میں کامل نہیں کہہ سکتا۔ مجھے خوشی ہوگی۔حسن ویسے بھی تم سے زیادہ بھابھی سے مانوس ہے۔تمہاری عارضی جدائی سے نہیں گھبرائے گا۔ٹھیک ہے بیٹی۔کل سے ہی تمہاری روانگی کی تیاری شروع ہوگی۔''

❁❁❁❁

''رات میں تمہاری اسی خواہش کے متعلق سوچتا رہا شبنم۔'' ناشتے کے لیے ابھی سارے لوگ ہال میں نہیں آئے تھے اور محسن رضا بیٹی سے محوِ گفتگو تھے۔

''پھر پاپا۔۔۔؟''

''پھر یہ کہ میں نے سوچا کہ میری بیٹی اکیلی نہیں جائے گی دیارِ غیر میں۔''

''اوہ پاپا۔۔۔اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔دیکھیے نا اب کون اتنا فارغ ہے جو میرے ساتھ اتنی دور ایک طویل مدّت کے لیے جائے۔'' شبنم ان کے اس انداز پر کڑبڑا گئی۔شاید پاپا اسے بھیجنے پر راضی نہیں ہیں۔

''یہ بات شاید میرے ذہن میں نہ آتی۔رات شیر دل کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے بتایا۔وہ تمہارے تنہا جانے کا سن کر حیران ہوگیا۔ بلکہ اسی نے یہ راہ دکھائی کہ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں۔اور فرزانہ بھی الیف۔آر۔سی ایس کرنا چاہتی ہیں۔''

''تو کیا آپ۔۔۔؟'' شبنم نے جان بوجھ کر فقرہ نامکمل رہنے دیا۔

''ہاں بیٹی میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ البتہ حسن پہلے کی طرح یہیں بھابھی کے پاس رہے گا۔ پھر شیر دل ہے اس کا خیال کرنے والا۔ اور وہ شیر دل کہہ رہا تھا کہ اگر شبنم مناسب سمجھے تو میں حسن کو اپنے پاس لے آؤں۔''

''نہیں پاپا نہیں۔'' شبنم گھبرا اٹھی۔ شیر دل کی اس پیش کش پر شرمندہ سی ہوگئی۔

''حسن یہیں پر ٹھیک رہے گا۔ ورنہ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

سات آٹھ دنوں میں جانے کے انتظامات مکمل ہوگئے۔ ویزا لگوا کر شیر دل رضا ہاؤس آئے تو شبنم اپنے کمرے میں تھی ادھر ہی چلے آئے۔ عابدہ خانم کی وفات کے بعد وہ پہلی مرتبہ گھر آئے تھے۔

''شبنم۔۔۔ اندر آنے کی اجازت ہے؟''

کپڑوں کی الماری کا کھلا پٹ تھامے شبنم انہیں دیکھتی رہ گئی۔ ایک سال کے اس عرصے میں وہ اور بھی سنجیدہ اور بھی گریس فل لگنے لگے تھے۔

''آجایئے۔'' الماری جلدی سے بند کر کے وہ ان کی طرف بڑھی۔

''مبارک عم زاد۔''

''کس بات کی؟''

''مجھ سے فرار پالینے کی۔''

''کیسا فرار؟'' شبنم تجاہلِ عارفانہ سے پوچھ رہی تھی۔

''میں تو ویسے بھی تم سے دور تھا عم زاد۔ تم نے خوامخواہ مزید دور جانے کی تکلیف کی۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں شیر دل۔ میں نے تو باخدا ایسا سوچا بھی نہیں۔''

''تم نے پہلے ہی سب کچھ سوچ لیا تھا۔ سارے ستم ایک دم ہی توڑے تھے۔ اب مزید کیا سوچنا تھا۔ تم نے اپنا آپ محفوظ رکھا۔ ہم سے بچا کر رکھا۔ شبنم ویسے ہم اتنے بھی دشمن نہ تھے تمہارے۔ خیر ٹھیک ہے۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

یہ لو اپنے مکمل کاغذات۔ سیٹیں بھی او کے ہوگئی ہیں۔ تین دن بعد کی فلائٹ ہے۔''

''شکریہ آپ کا بے حد شکریہ شیر دل۔''

''کاش یہ سفر تم ہماری ہمراہی میں کرتیں۔ لیکن چھوڑو اب ساری خواہشیں اس لیے تو نہیں ہوتیں کہ پوری ہو جائیں۔''

شبنم سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔

''ظلِ ہما کیسی ہیں؟ آپ انہیں ساتھ نہیں لائے۔''

''بہت اچھی ہے وہ۔ بے حد اچھی۔ لیکن میں بہت برا ہوں عم زاد۔ تمہیں نہیں پاسکا۔ اپنا آپ اسے نہیں دے سکا۔ ناکامی کے غم بہت اذیت ناک ہوتے ہیں۔ زندگی کا سفر اس سے بھی اذیت ناک۔

جب دل اور دماغ مختلف سمتوں میں سفر کر رہے ہوں۔''
شبنم نظریں چرائے رہی۔
''پاپا سے ملے آپ؟'' اس نے پھر بات بدلنے کی کوشش کی۔
''نہیں۔۔۔۔ ہیں کہاں رضی انکل؟''
''اپنے کمرے میں ہوں گے۔''
''کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں ان سے۔ تم بھی وہیں چلو شبنم۔'' دونوں محسن رضا کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

❁❁❁❁

''زندگی کا سفر آسان ہوسکتا ہے شبنم اگر تم میرا ساتھ قبول کرلو۔''
''شیر دل آپ کسی اور کے ہیں۔''
''مجھے اچھی طرح خبر ہے کہ میں تمہارا ہوں۔''
''شیر دل!'' شبنم کے لب کپکپا کر رہ گئے۔
''ہاں۔ جھوٹ تو کبھی میں نے بولا ہی نہیں خدا قسم۔'' وہ معصوم انداز میں کہہ رہے تھے۔ طیارے میں برابر کی نشستوں پر بیٹھے وہ شبنم سے ہم کلام تھے۔
''شیر دل! وقت بہت آگے نکل آیا ہے۔ آپ ظلِ ہما کے شوہر ہیں۔''
''اور تم میری زندگی ہو۔''
''نہیں شیر دل۔'' شبنم خوف زدہ ہوگئی۔
''نہیں کیسے۔ یہ بات تو ظلِ ہما بھی جانتی ہے۔ میں نے اسے بے خبر نہیں رکھا۔''
''یہ ایک عورت پر ظلم ہے۔''
''دھوکا دیتا تو اس سے بھی بڑا ظلم ہوتا۔''
''اس دھوکے میں کسی کو زندگی مل رہی ہو۔ اعتماد مل رہا ہو تو ظلم کہاں ہوا۔''
''جس کے لب یہ کہنے سے قاصر ہوں وہ کیا کرے۔ بہر حال شبنم میری آرزوؤں کے سات رنگ آج بھی تمہارے وجود سے وابستہ ہیں۔ میں اب بھی تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ نہ محبت گناہ ہے۔ نہ دوسری شادی جرم ہے۔''
''نہیں شیر دل۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔'' وہ پھر کہہ اٹھی۔
''میں نے تو اپنا حق ادا کر دیا۔ اور اب بھی کہہ رہا ہوں۔ میں زندگی بھر انتظار کروں گا۔ جب دل میں کوئی خلش پاؤ جب زندگی میں میری ضرورت محسوس کرو۔ جب کبھی میری محبت پر رحم کھا سکو۔ مجھے آواز دے لینا۔'' شبنم نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے محسن رضا کی طرف دیکھا۔
''شیر دل! جب آپ آزاد تھے ذمہ داریوں کی قید سے تب بھی میرا جواب انکار میں تھا۔ آج جب آپ ایک عدد بیوی کے شوہر اور ایک عدد بچی کے باپ ہیں۔ میں آپ کی طرف کیسے دیکھوں گی۔ آپ کو آواز کیسے دوں گی۔ شیر دل! آپ میرے بہت پیارے بہت اچھے دوست تھے، ہمدرد تھے، اب تو

میرے عم زاد ہیں۔ مجھ میں اور آپ میں خونی تعلق ہے۔ جسے آپ ایک اتفاق اور میں اپنی خوش نصیبی تصور کرتی ہوں۔ لیکن میں نہ آپ سے پہلی ملاقات کے وقت آزاد تھی نہ اب ہوں۔ نہ پھر کبھی ہوں گی۔ یاد ہے آپ نے کہا تھا تم تو یوں لاچار و مجبور نظر آرہی ہو گویا کسی اَن دیکھی زنجیر میں بندھی ہو۔ میں واقعی کسی بندھن میں قید ہوں شیر دل۔ اپنا یہ راز اپنے ایک مخلص دوست سے اب نہیں چھپا سکتی۔ میری ذات ہمیشہ کسی سے وابستہ رہی۔ میں ہمیشہ سے کسی کی ہوں۔''

''کون ہے وہ؟''

''میرے حسن کا باپ۔''

''لیکن وہ تو مر چکا۔۔۔ پھر بھی۔۔۔؟''

''نہیں شیر دل وہ زندہ ہے۔ اسی دنیا کا باسی ہے۔'' جانے کیوں وہ تڑپ سی گئی۔

''وہ کہاں ہے؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتی۔ آپ کے لیے اتنا کافی ہے۔ آگے نہ آپ پوچھیں گے نہ میں بتاؤں گی۔''

جہاز لینڈ کرنے والا تھا۔ گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کراچی ایئر پورٹ پر انسانوں کے ہجوم میں چند نفوس گویا کھو کر رہ گئے۔

❁❁❁❁

شیر دل اپنی والدہ کو اپنے پاس لے آئے۔ حسن بھی ان کے ساتھ تھا۔ ایک اچھے اور گرامر اسکول میں اس کا داخلہ آسانی سے ہو گیا۔ شیر دل نے کوشش کی کہ حسن ماں یا محسن رضا کی کمی محسوس نہ کرے۔ دراصل حسن رشتوں کی نزاکت بلکہ حقیقت سے ناواقف تھا۔ شیر دل کی والدہ کو ممی کہتا تھا اور احسن رضا اور محسن رضا کو پاپا۔ شبنم کو اس نے آپی سمجھا اور آپی ہی کہا۔ اب (بھابھی) بیگم احسن رضا یعنی فرحانہ بیگم کے ساتھ وہ حسبِ معمول خوش ہی تھا۔ فرحانہ بیگم نے اسے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ بہت پیارا تھا انہیں اب تو یہ محبت اور وابستگی مستحکم ہو گئی تھی۔ محسن رضا کی نسبت سے مریم کا اور ان کا تھوڑا عرصہ ساتھ رہا تھا۔ لیکن اچھی چیزیں اچھے لوگ ہمیشہ کے لیے اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ شبنم اس کے وجود کا حصہ تھی اور حسن شبنم کا بیٹا تھا۔

حسن صرف شبنم سے ہی نا آشنا نہیں تھا۔ حسن سارے رشتوں کی نزاکت اور حقیقت سے ناواقف تھا۔ اسے تو یہ خبر بھی نہ تھی کہ اس کے ساتھ اسکول میں پڑھنے والی رابیل اس کی حقیقی بہن ہے اور لمبی سی شاندار شیورلٹ گاڑی میں باوردی شوفر کے ساتھ بیٹھے رابیل کے پاپا اس کے بھی پاپا ہیں۔

غیر اختیاری طور پر وہ رابیل سے اور رابیل اس سے مانوس ہو گئی۔ وہ ساڑھے چار سال کی معصوم سی گڑیا سی بچی تھی۔ جب کہ حسن آٹھ سال کا قدرے سمجھدار بچہ۔ اسکول میں وہ اس کا بے حد خیال رکھتا۔ تفریح کے وقت سب دوستوں کو چھوڑ کر رابیل کی کلاس میں چلا جاتا۔

وہ کینٹین جاتے ہوئے ہمیشہ اسے ساتھ لے جاتا۔ یہ دوستی دراصل بڑے عجیب انداز میں ہوئی تھی۔ رابیل نرسری میں داخل ہوئی تھی۔ دوسرے دن ہی نہ جانے کیسے اس کی گاڑی وقت پر نہ آئی۔

اسکول بہت جلد خالی ہوگیا۔ وہ گیٹ کے پاس کھڑی گھبرا کر رونے لگی۔ آنٹی زہرا نے اسے چمکارا۔ پیار کیا، تسلی دی۔ حسن بھی شیر دل کے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ چھٹی ہونے کے آدھا گھنٹے بعد آیا کرتے تھے اور حسن روزانہ ہی ان کے انتظار میں رکا رہتا تھا۔ آنٹی زہرا نے حسن سے کہا کہ وہ رابیل کا خیال رکھے۔ اس طرح ان دونوں میں دوستی کی ابتدا ہوگئی۔ اس کی شیورلیٹ گیٹ پر رکی تو حسن رابیل کا ہاتھ تھام کر اسے لے آیا۔ اس کی سوجی آنکھیں اور رخساروں پر جمے آنسوؤں کے نشان رونے کی گواہی دے رہے تھے۔ آفاق گاڑی سے باہر آئے۔

''اوہ میرا بیٹا۔۔۔۔ رویا ہے میرا بیٹا۔'' انہوں نے رابیل کو گود میں اٹھالیا اور اس کے گال چوم لیے۔

''آپ دیر سے کیوں آئے پاپا، میں باہر کھڑی تھی۔ کوئی پکڑ لے جاتا مجھے۔'' وہ روٹھی روٹھی تھی۔

''ارے نہیں مائی چائلڈ۔ کوئی نہیں پکڑتا۔ یہاں تو بہت سے لوگ موجود تھے۔ اور پھر یہ اسکول ہے۔ وہ تو سڑکوں پر تنہا پھرنے والے بچوں کو اٹھائی گیرے لے جاتے ہیں۔''

''ہاں انکل بوئے۔ آپ نے بیلا کا خیال رکھا۔ شکریہ۔''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو اپنے انکل کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ یہ رو رہی تھی۔ آنٹی زہرا نے کہا، میں اس کا خیال رکھوں۔''

''آپ کون سی کلاس میں پڑھتے ہیں۔''

''تھری میں۔''

''ویری گڈ۔۔۔ آپ کا نام؟''

''حسن رضا۔''

''اوہ۔ یہ تو پیارا سا بچہ حسن رضا ہے۔ بھئی حسن رضا! آج کے بعد آپ اپنی چھوٹی سی بہن رابیل کا ہمیشہ خیال رکھا کریں گے۔''

''آل رائٹ سر۔ میں تو روزانہ آدھ گھنٹے بعد جاتا ہوں۔''

''ارے ہاں آیئے نا ہم آپ کو چھوڑ دیں گے آپ کے گھر۔''

''تھینک یو سر۔ ابھی میرے انکل مجھے لینے آئیں گے۔''

''انکل لینے آئیں گے۔ پاپا کدھر ہیں آپ کے؟''

''پپا انگلینڈ گئے ہیں۔ پہلے ہم لاہور میں تھے۔ پپا میری آپی کو لے کر انگلینڈ چلے گئے تو انکل مجھے یہاں لے آئے۔ میری ممی بھی ساتھ ہیں۔''

تبھی حسن نے جو لمحوں میں آفاق سے گھل مل کر باتیں کرنے لگا تھا، شیر دل کی گاڑی کو آتے دیکھا۔

''اوہ انکل آگئے۔''

آفاق نے ابھی تک رابیل کو گود میں لیا ہوا تھا۔ شیر دل گاڑی روک کر اسی طرف آگئے۔ ڈیوٹی سے آف ہو کر ادھر آتے تھے۔ اس وقت بھی یونی فارم میں ہی تھے۔ حسن نے بھاگ کر ان کا ہاتھ تھام

لیا۔
''سر۔ یہ ہیں انکل شیر دل نقوی۔''
دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خیر مقدمی انداز میں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ آفاق نے رابیل کو نیچے اتار کر اپنا ہاتھ شیر دل کی طرف بڑھایا۔
''آفاق احمد بخاری۔ رابیل کے پاپا۔''
شیر دل نے ہاتھ ملایا۔
''لگتا ہے آپ کی بچی ابھی چند دن ہوئے داخل ہوئی ہے۔''
''جی ہاں۔ صرف تین دن ہوئے۔ ویسے بھی اسکول کیا اس شہر بلکہ ملک سے ہی نا آشنا ہے۔ چند ماہ ہوئے ہم یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔''
''آپ کا مطلب ہے باہر کے کسی ملک سے۔''
''جی ہاں۔ لندن سے۔''
''کسی کورس کے لیے وہاں گئے ہوں گے۔''
''پورے نو سال باہر ہی رہے ہم۔ بار ایٹ لا کرنے کے بعد ماموں جان نے آنے ہی نہیں دیا۔ رابیل کے گرینڈ فادر کی مستقل رہائش وہیں ہے۔ ہم نے بھی تین چار سال وہیں پریکٹس کی۔''
''اوہ ونڈر فل۔۔۔ لیکن آخر کار وطن کی محبت آپ کو کھینچ لائی۔'' دونوں دوستانہ انداز میں ہنس پڑے۔
''اب یہاں بھی یقیناً آپ نے پریکٹس ہی شروع کی ہوگی۔''
''ابھی کہاں صاحب۔ ابھی تو صرف رہائش کا اور آفس کا مسئلہ حل ہوا ہے۔ ماموں نے سارا بزنس ہمارے نام منتقل کر دیا ہے۔ اسے سنبھالنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ بس کچھ دنوں میں ہم اپنا کام شروع کر دیں گے۔''
''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو۔۔۔''
''اوہ نہیں نہیں شیر دل صاحب۔ تھینک یو ویری مچ۔ بس آپ کے حسن صاحب تک کام ہے ابھی تو ہمیں۔ بھئی حسن صاحب رابیل آپکی منی سی سسٹر ہیں۔ آپ ہمیشہ ان کا خیال رکھیے گا۔'' آفاق نے حسن کے گال تھپتھپائے۔ حسن نے دوستانہ مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا۔ سب نے ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہا اور اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔

❁❁❁❁

پھر تو رابیل اور حسن دوستی جیسے معصوم رشتے میں بندھ گئے۔ رابیل بہت جلد حسن سے مانوس ہوگئی۔ صبح آتے ہی حسن کو چاروں اور تلاش کرتی اور چھٹی کے وقت اس کے ساتھ ہی گیٹ پر آتی۔
ایک دن آفاق کے بجائے شیری رابیل کو لینے آئی۔ گاڑی کے ہارن پر رابیل تیزی سے گئی اور مما کو دیکھ کر واپس پلٹ آئی۔
''حسن بھائی مما سے نہیں ملیں گے؟'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر گاڑی کی طرف لے چلی۔

شہر بانو نے گاڑی کے شیشے سے اسے دیکھا اور ایک دم باہر نکلی۔
''ارے تو تم ہو ہماری بیلا کے حسن بھائی جس کا ذکر وہ ہر وقت کیا کرتی ہے۔''
''آداب آنٹی۔'' حسن نے خاصے سمجھ دار بچوں کی طرح اور خصوصاً بڑے بھائیوں جیسی سنجیدگی اختیار کر رکھی تھی۔ شہر بانو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
''گلیڈ ٹو سی یو بوائے۔''
حسن دھیمے سے مسکرا دیا۔
''بھئی آج سے رابیل کے پاپا کورٹ چلے گئے ہیں۔ اب میں ہی اسے لینے آیا کروں گی۔ اور ہاں حسن بیٹے آپ کی چھوٹی بہن نیلی کی برتھ ڈے پارٹی ہم اپنے نئے گھر میں کریں گے۔ تم تیار رہنا۔ میں اور رابیل تمہیں انوائیٹ کرنے آئیں گے۔ کل تم اپنے انکل سے وزیٹنگ کارڈ لیتے آنا۔ تاکہ تمہارا گھر ڈھونڈنے میں آسانی رہے۔ اچھا۔۔ بائے بائے۔''
وہ بہت عجلت میں تھی۔ اصل میں نیا گھر بنانا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ آج بھی اسے بازار جانا تھا۔ ڈیکوریشن کے لیے بہت کچھ خریدنے کے لیے۔

❁❁❁❁

حسب وعدہ شیری خود ہی آئی۔ رابیل بھی ساتھ تھی۔ فرحانہ بیگم اور ظلِ ہما نے اسے اچھی طرح انٹرٹین کیا۔ شیر دل بھی گھر پر تھے۔ وہ بھی شریکِ محفل رہے۔ اب شیری نے صرف حسن کو نہیں پورے اہلِ خانہ کو مدعو کیا اور سالگرہ کے دن شیر دل، ظلِ ہما اور حسن شرکت کے لیے پہنچ گئے۔
حسن تو جاتے ہی رابیل اور نیلی کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اور شیر دل اور ظلِ ہما آفاق اور شیری کی ہمراہی میں اندر آ گئے۔ شاندار گھر آفاق بخاری کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ تقریب میں بہت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ لیکن سب ہی معزز لوگ تھے۔ شیر دل سب سے متعارف ہوئے اور اس دن کے بعد ان میں اور آفاق میں دوستی کی ابتدا ہو گئی۔
تین سال کا طویل عرصہ جہاں رابیل اور حسن ایک ساتھ اسکول میں زیرِ تعلیم رہے۔ وہاں شیر دل اور آفاق کی اکثر ملاقاتیں انہیں ایک دوسرے کے قریب لاتی رہیں۔ آفاق کی زندگی بے حد مصروف تھی۔ اور شیر دل کی ڈیوٹی کے اوقات اکثر بدل جایا کرتے تھے۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے سے غافل نہ رہتے۔ فون پر روزانہ بات کرتے اور ویک اینڈ پر ایک دوسرے کی ملاقات کو ضرور آ جایا کرتے۔ اس کے باوجود دوستی محدود تھی۔ اصولوں کی حدود میں قید دونوں ایک دوسرے کے اندرونی حالات سے یکسر نابلد تھے۔

ان تین سالوں میں حسن گیارہ سالہ ذہین اور سمجھ دار بچہ بن چکا تھا۔ ابھی شبنم اور محسن رضا کی واپسی میں کچھ عرصہ باقی تھا کہ شیر دل کا ٹرانسفر لاہور میں ہو گیا۔ ٹرانسفر کے آرڈر اچانک ملے تھے۔ بڑی جلدی میں سفر کی تیاری مکمل کی گئی۔ اس خبر نے رابیل کو اداس کر دیا۔ اب وہ بھی آٹھ سال کے قریب قریب تھی۔ بلکہ نیلی نے بھی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ رابیل اور حسن وعدے وعید کے ساتھ جدا ہوئے۔ آفاق ان سب کو ایئر پورٹ پر چھوڑنے آئے۔

❁❁❁❁

قربتیں تھیں تو پیار بھی تھا۔ دوری آئی تو چھوٹے چھوٹے ذہن بہت جلد نئی مصروفیات میں بہل گئے۔ البتہ شیر دل کا آفاق سے ربط باہم جاری رہا۔ وہ آفس سے ہی آفاق سے بات کر لیتے۔ رابیل اور حسن کچھ عرصہ خط و کتابت بھی کرتے رہے لیکن بہت جلد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ کراچی اور لاہور کے درمیان شاید بہت فاصلہ تھا۔

فرزانہ، شبنم اور محسن رضا لوٹ آئے اور ان کے آتے ہی شیر دل تربیتی کورس کے لیے ملک سے باہر چلے گئے۔ ان کی اس آمد اور شیر دل کی روانگی میں صرف ایک دن کا وقفہ تھا۔ ظلِ ہما اور دونوں بچے بھی ان کے ساتھ ہی گئے۔

شبنم کو آتے ہی یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی میں جاب مل گئی۔ اور زندگی کا سفر ایک نئی لگن کے ساتھ جاری و ساری ہو گیا۔ اس بار لندن سے واپسی پر محسن رضا کی ڈگریوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے آتے ہی اپنا بہت بڑا کلینک ''مریم ہاسپٹل'' کے نام سے کھول دیا۔ جہاں فرزانہ کے علاوہ کئی ڈاکٹرز کام کرنے لگے۔ محسن رضا کے خاندان میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور وہ تھے ان کے چھوٹے صاحبزادے طاہر رضا۔ فرحانہ بیگم اب خاصی عمر رسیدہ ہو گئی تھیں۔ شہریار اور اسما ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد چلے گئے تھے۔ سونیا کیپٹن رازی کے سنگ پشاور میں تھی جب کہ مونی ایران میں۔ اس کی شادی طارق سے ہوئی تھی۔ گھر میں لے دے کے ایک شبنم کا وجود تھا جو یونیورسٹی سے لوٹ کر آنے کے بعد گھر کا نظام سنبھالنے میں ان کی مدد کرتی۔ عامر اور طاہر کا خیال رکھتی۔ اور حسن کو اسٹڈی میں مدد دیتی۔ طاہر زیادہ تر اپنی آیا کے پاس رہتا۔ لیکن شام کی سیر میں وہ ضرور شبنم کے ساتھ ہوتا۔ دونوں بچوں نے حسن کی تقلید میں اسے آپی کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ننھے منے پیارے پیارے بھائی اسے بے حد عزیز تھے۔ محسن رضا رات گئے لوٹا کرتے جب کہ فرزانہ شام کو واپس آتیں۔ دوپہر کے کھانے پر شبنم کی ملاقات دونوں سے بہت کم ہوا کرتی تھی۔ وہ اکثر یونیورسٹی سے لیٹ آیا کرتی تھی۔ البتہ رات کو دیر تک وہ پاپا کی منتظر رہتی۔ ان سے گفتگو کرتی اور چائے وغیرہ ان کے ساتھ پی کر ہی سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں جاتی۔

اب وہ بارہ تیرہ سال پہلے کی شبنم نہ تھی۔ ایک گریس فل بھرپور خاتون تھی جس کے شعبے کے اکثر طلبا اور طالبات اس کے شیدائی تھے جو محسن رضا کے دل کا چین تھی جو حسن، عامر اور طاہر کے لیے محبت کا سرچشمہ تھی اور جسے شیر دل نے آج تک بڑے احترام سے دل میں بسا رکھا تھا۔

اور وہ خود۔۔۔ وہ نہ جانے کیا تھی۔ اتنی مضبوط کیسے ہو گئی تھی۔ اتنا حوصلہ اس میں جانے کہاں سے آ گیا تھا کہ وہ تنہا زندگی کے دن کاٹے جا رہی تھی۔ نہ کوئی راز دار تھا نہ دوست۔ حالِ دل دل میں ہی پنہاں تھا۔ دل کا معاملہ کسی پر آج تک آشکار نہ کیا تھا۔ تعلیم کے دوران، سروس کے دوران، لندن میں، ہر جگہ ہی کئی لوگ زندگی کی راہوں میں آئے تھے۔ پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنے والے بہت تھے۔ کئی نے ہاتھ بڑھا کر سہارا دینے کی پیش کش کی تھی۔ کئی دل میں جھانک کر دیکھنے کے مشتاق تھے۔ لیکن شبنم تو بس ڈھلواں چٹان تھی۔ بڑی سخت، اپنی جگہ پر مضبوطی سے جمی۔

ایک حادثے نے اسے ہراساں و پریشاں کر دیا تھا۔ ایک شخص اسیرِ وعدہ کر کے گیا اور پھر دنیا کے میلے میں کہیں نظر نہ آیا۔ شبنم اس شبیہ کو چاروں اور ڈھونڈتی رہ گئی۔ وہ بے وفا تھا۔ دھوکے باز تھا۔ یا مجبوریوں کا قیدی تھا اس کی طرف آ ہی نہ سکا۔ اس نے اسے ہمیشہ یاد رکھا۔ وہ وجود، اس کا لمس، وہ آنکھیں، وہ لب، وہ خوب صورت باتیں، ہر چیز اس کے ذہن میں رہی۔

وہ بادفا تھی۔ اس بے ایمان کی خاطر نہیں صرف لفظ وفا کی خاطر، جذبۂ محبت کی خاطر۔ اب تو وہ بڑے عجیب دور سے گزر رہی تھی جہاں نہ انتظار تھا نہ آس تھی۔ نہ امنگ نہ ترنگ لیکن پھر بھی دنیا کے میلے میں ہزار بار اس نے خوش وضع، ہنستے کھیلتے جوڑے دیکھے۔ ان کے سنگ پیارے پیارے بچوں کو دیکھا تو جانے کیوں وہ ستم گر شدت سے یاد آیا۔ اب تو زندگی میں نہ محبت رہی تھی نہ نفرت، نہ تقدیر پر بھروسہ کہ وہ زندگی میں ایک بار آفاق کو دیکھ لے گی۔ بس کبھی رات کی تنہائیوں میں دل مچل اٹھتا۔ رونے لگتا، تڑپتا رہتا، روح پکار اٹھتی، من میں کوئی محرومی زور شور سے بین کرتی، تنہا زندگی کا پہاڑ اس کے کندھوں پر تھا۔ پاپا کی شفقتیں نہ ہوتیں تو وہ زندہ درگور ہو جاتی۔ پاپا نے اس پر بہت محنت کی تھی۔ ایک ٹھوس انسان بنانے پر۔ دنیا کے سرد و گرم بہت کم اثر انداز ہوتے تھے اس پر۔ زندگی کو ایک مقصد مل گیا تھا۔ بڑی محنت کرتی تھی وہ اپنے شاگردوں پر بہت شفقت دیتی تھی وہ سب کو۔ لڑکے لڑکیاں اس کے نام کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اساتذہ اس کی قابلیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور شبنم اس کو کافی سے زیادہ سمجھتی تھی۔

ابھی امنگوں کو دل میں بسانے کا عہد آیا بھی نہیں تھا کہ دل اجڑ کر رہ گیا۔ دل اُجڑا تو پھر آباد ہو ہی نہ سکا۔ عورت تو ایک مرد کے لیے سنورتی ہے، بنتی ہے، اپنے آپ کو تر و تازہ رکھنے میں کوشاں رہتی ہے۔ وہ کس کے لیے کرتی سب کچھ؟

ایک مرد تھا جو اس سے دور تھا۔ اس سے بے نیاز تھا۔ بے خبر تھا جس کے لیے اس نے ہزاروں بے خواب راتیں کسی سے شکوہ کیے بغیر گزار دی تھیں۔

ایک مرد تھا۔ جو سب کچھ نثار کرنے کو تیار تھا۔ خود کو اس کا تصور کرتا تھا۔ جسے ایک عورت کی قربت میں بھی شبنم کے خواب عزیز رہے تھے۔ لیکن وہ اس کے لیے کچھ بھی نہ تھی۔

اس لیے کہ کچھ لوگ محبت صرف ایک بار کرتے ہیں۔ وفا اور جفا کے ڈر سے بالاتر ہو کر۔ اپنا آپ کسی کے نام کر دیں تو پھر کسی تبدیلی کا سوچ ہی نہیں سکتے۔

وہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ اس نے خود کو مصروف کر لیا تھا کہ ''اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔''

اور کچھ لوگ دوسروں کو محبت کا فریب دینا معمولات کا ایک حصہ سمجھ کر محبت کے نام پر کھیل رچاتے ہیں۔ بے وفائی کو اپنا حق جان کر، جرم کے احساس سے بالاتر ہو کر۔

شاید آفاق ان ہی میں سے ایک تھے۔ شاید وہ اپنی زندگی میں مطمئن تھے کہ انہوں نے ایک خوددار اور مغرور لڑکی کے پندار کو شکست دی تھی اور بس۔

جہاں میں شبنم کے سوا بھی بہت کچھ تھا اور وہ اس بہت کچھ میں عرصۂ دراز سے مگن تھے۔

دن رات آتے رہے اور جاتے رہے۔ ماہ و سال کا سفر کہیں تھما نہیں۔ شبنم کے استقلال میں کہیں

لغزش نہیں آئی۔ اس کی ثابت قدمی لڑکھڑائی نہیں۔ محسن رضا اپنی بیٹی کی جرأتوں پر حیران تھے۔ وہ بیک وقت انہیں فرزانہ بھی لگتی اور دیوانہ بھی۔ معاشرے میں ایک واضح معاشرتی حیثیت اس کی فرزانگی کی گواہ تھی اور ایک بے نام تعلق پر زندگی گزار دینا دیوانگی کی دلیل۔

محبت بھی نہیں نفرت بھی نہیں۔ عداوت بھی نہیں، لگاوٹ بھی نہیں، تو زندگی ایک بے خبر کے نام کیوں؟ وہ کبھی نہ پوچھ سکے اور نہ خود سمجھ سکے۔ یہاں تک کہ جوانی ایک سہانے خواب کی طرح ایک سحر کی نذر ہوگئی۔

وہ سحر حسن کے نئے روپ میں طلوع ہوئی جس میں وہ پچیس سالہ نوجوان تھا۔ اونچا، لمبا، صحت مند، خوبرو نوجوان ''حسن رضا'' جو گل کی طرح شبنم کو آپی نہیں بلکہ ماں سمجھتا تھا۔ جو شبنم کو دیویوں کی طرح مقدس سمجھتا تھا۔ جس کا تصور شبنم کے پاکیزہ آنچلوں پر سجدے کیا کرتا تھا۔ جسے یہ خبر ہوگئی تھی کہ محسن رضا اس کے پاپا نہیں بلکہ نانا ہیں جو اپنے اور شیر دل کے درمیان خونی رشتے سے زیادہ ذہنی و روحانی تعلق کو اہمیت دیتا تھا اور جسے اپنی عظیم ماں اور عظیم نانا پر بے حد فخر اور ناز تھا۔ احسن رضا اور فرحانہ بیگم گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ شہریار رضا ہاؤس سے باہر تھے۔ شیر دل سرگودھا میں تھے اور گھر بس محسن رضا کی فیملی سے ہی آباد تھا جس کی سب سے بڑی رونق حسن رضا تھا۔ جو بیک وقت سب کو ہی بے حد عزیز تھا اور صرف رضا ہاؤس میں ہی نہیں ایک اور گھر میں بھی کچھ لوگوں کو حسن کا وجود بہت محبوب تھا اور وہ گھر تھا گارڈن ٹاؤن میں رہنے والے خان اکبر خان کا چھوٹا سا گھر جہاں برجیس خانم تھیں۔ جہاں اکبر خان تھے اور ان کی بیٹی عائشہ خان تھی۔

عائشہ خانم دراصل شبنم کی شاگرد تھی۔ شعبۂ انگریزی میں پریویس کی طالبہ تھی جب کہ حسن ایم اے کے بعد لاء کر رہا تھا۔ لاء کرنے میں اس کے شوق سے زیادہ شبنم کی خواہش کا دخل تھا۔ یونیورسٹی میں اکثر حسن اور عائشہ کی ملاقات ہو جاتی، اکثر ہی شبنم کے کمرے میں۔ شبنم کو اس لائق فائق طالبہ سے خصوصی انسیت ہوگئی تھی۔ وہ اس پر بے حد توجہ دیا کرتی تھی اور اکبر خان یونیورسٹی لاء کالج کے استاد تھے جنہیں جینیئس سے حسن سے، حسن کی ذہانت اور قابلیت کے سبب اس سے بے حد پیار تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسے اپنے گھر لے آئے۔ جہاں موجود عائشہ خان سے وہ پہلے ہی آشنا تھا۔ یوں یہ آشنائی قربتوں میں اور قربتیں محبتوں میں بدل گئی تھیں۔ حسن کا آئیڈیل خود شبنم کی ذات تھی اور عائشہ میں اس جیسی خصوصیات ہی پائی جاتی تھیں۔

ابھی پچھلے دنوں جب شیر دل آٹھ دن کی چھٹیوں میں رضا ہاؤس آئے تو حسن کا یہ معاملہ ان سے چھپا نہ رہ سکا۔ انہوں نے حسن کے انتخاب کی داد دی بلکہ اس کے فیصلے کی توثیق کر کے استحکام دے دیا۔

وہ چاہتے تھے کہ سب کو بتا کر منگنی کر دی جائے۔ لیکن حسن لاء کے بعد ہی کسی عملی قدم کے لیے تیار ہو سکتا تھا۔ سو یہ بات اس نے شیر دل کو بھی بتا دی۔

ایک شام وہ کافی وقت خان فیملی کے ساتھ رہا۔ واپسی میں اندھیرا ہو گیا۔ سست رفتاری سے گاڑی چلاتا حسن ارد گرد بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ لیکن ہاتھ ہلاتی لڑکی کا بہت آگے جا کر احساس ہوا جو موٹر سائیکل کے قریب کھڑی تھی تو اس نے گاڑی ریورس کی اور اس کے قریب جا کر روک دی۔

''فرمایئے مس کیا پرابلم ہے؟''

''پرابلم ہی پرابلم ہے جناب۔'' بوائے کٹ بالوں میں سیاہ جینز اور سرخ شرٹ میں سرخ و سفید چہرے والی یہ لڑکی بے تکلفی سے اس سے مخاطب تھی۔ اس بے تکلفی پر وہ تھوڑا سا گھبرایا۔

''موٹر سائیکل پنکچر ہوگئی ہے اور گھر پہنچنا از حد ضروری ہے۔ پلیز اگر آپ چھوڑ سکیں تو۔۔۔''

''آپ تنہا ہیں یا کوئی ساتھ ہے؟''

''تنہا ہوں۔ اس کم بخت کے لیے تحفہ خریدنا تھا۔ لبرٹی گئی تھی۔''

''کس کے لیے؟'' حسن نے زور دے کر کہا۔ لفظ کم بخت بڑا عجیب تھا۔

''ارے وہ میری فرینڈ ماہی اور کون۔'' وہ جلی بھنی تھی۔ حسن کو ہنسی آنے لگی۔

''پھر یہ موٹر سائیکل۔۔۔''

''گولی ماریے جی اس کو۔ یہیں فٹ پاتھ پر ہینڈل لاک کر کے کھڑا کر دیتی ہوں۔ لے جائے گا کوئی۔ اصل میں غلطی میری اپنی ہے۔ اچھی بھلی گاڑی کو چھوڑ کر اس کھٹارا کو لے آئی۔''

''کھٹارا۔۔۔ مگر کس کی؟''

''اسی اشرف کی۔ جیسا خود ہے ویسی ہی یہ کھٹارا ہے۔''

''اشرف کون ہے؟'' حسن کو اس سوال جواب میں لطف آ رہا تھا۔

''ہمارا ملازم۔''

''اچھا، اچھا۔ خیر چلیے میں اسے سائیڈ پر کھڑا کر دیتا ہوں۔ آپ گاڑی میں بیٹھیے۔''

وہ آگے بڑھ گیا۔ موٹر سائیکل کھڑی کی اور لوٹ آیا۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''ہوں تو اب بتایئے جناب کہ آپ کو جانا کہاں ہے؟''

''اپنے گھر ہی اور کہاں۔ برتھ ڈے میں تو گھر سے جاؤں گی۔'' وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ شاید بہت دیر پریشان رہی تھی۔

''اُسی گھر کا اتا پتا چاہیے مس۔''

اب وہ ہنس پڑی اور جلدی سے ایڈریس بتایا۔

''آپ کا نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟'' وہ مؤدبانہ انداز میں بھی شرارت کا عنصر لیے کہہ رہا تھا۔

''بیلا۔۔۔ رابیل آفاق۔''

''رابیل۔۔۔ بیلا۔۔۔ آفاق۔'' یہ سارے نام سماعت کے لیے مانوس تھے۔ حسن ذہن پر زور دینے لگا۔ کب سنے تھے یہ نام کب۔۔۔؟

''آپ کا اسمِ گرامی؟'' وہ بھی شرارتی سی لگ رہی تھی۔

''حسن رضا۔۔۔''

''نام بھی آپ کی طرح بہت اچھا ہے۔'' حسن جو اس کے چہرے پر شناسائی کی کوئی کرن ڈھونڈ

رہا تھا مسکرا پڑا۔

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں اچھا ہوں۔''

''واہ جناب۔ آپ نے میری خاطر اتنی تکلیف گوارا کی۔ ماتھے پر بل لائے بغیر میرے ساتھ جا رہے ہیں۔ اچھے نہیں تو کیا ہیں۔''

حسن اس سادگی پر ہنس دیا۔

''رابیل۔۔۔ مجھ یوں لگتا ہے کہ میں آپ سے واقف ہوں۔ میں نے ایک عرصہ آپ کے ساتھ گزارا ہے۔ کیا آپ شروع سے ہی لاہور میں ہیں یا اب آئی ہیں۔''

''تین سال سے یہیں ہیں۔ اس سے پہلے کراچی میں تھے۔'' کراچی کے نام پر یادوں کے کئی در کھل گئے۔ یادداشت میں کئی باتیں محفوظ تھیں۔ وہ معصوم سی رابیل تھی جو حسن سے بے انتہا مانوس تھی۔ اس سے محبت اور تحفظ دونوں ہی طلب کرتی تھی جو اسے بھی بہنوں کی طرح عزیز تھی۔

''آپ کے پاپا آفاق احمد بخاری ہیں نا۔ اور اگر آپ کی چھوٹی سسٹر نیلی۔۔۔ انیل آفاق ہیں تب تو آپ میری پیاری سی بہنا رابیل ہی ہیں۔''

''اوہ مائی گاڈ۔۔۔ آپ کیسے جانتے ہیں ہم سب کو؟''

''رئیلی آپ وہی ہیں وہیں۔۔۔ منی سی، چھوٹی سی رابیل جو عرصہ پہلے مجھے روتی ہوئی تنہا کھڑی ملی تھی۔'' حسن بے حد خوش تھا اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

''اللہ بھئی حسن رضا صاحب۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔'' وہ اب سچ مچ پریشان تھی۔

''آپ کو یاد بھی کیسے ہو۔ تب تو آپ بہت چھوٹی تھیں۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بھی واضح کیا۔

''اور آپ۔۔۔؟''

''میں آپ سے بہر حال اتنا بڑا تو ضرور تھا کہ مجھے اب تک وہ سب کچھ یاد ہے۔''

حسن نے گاڑی گیٹ پر روک دی۔ سامنے نیم پلیٹ تھی۔ بلکہ بڑا سا سفید بورڈ دیوار کے ساتھ لگا تھا جس پر نیلے حروف میں نام اور عہدہ درج تھا۔

❁❁❁❁

آفاق احمد نے پُر جوش انداز میں اس کا ہاتھ تھامے شہر بانو کو بلایا۔

''شیری۔۔۔ باہر آیئے شیری۔ دیکھیے تو کون ہے ہمارے ساتھ۔'' ان کا لہجہ پر مسرت تھا۔

گو بہت سارے سال درمیان میں حائل تھے لیکن حسن نے آفاق کو با خوبی پہچان لیا تھا اور آفاق کی یادداشت میں حسن ابھی تک موجود ہی تھا وہ اسے بار بار اوپر سے نیچے تک دیکھ رہے تھے۔ بڑے پیار سے گلے لگایا تھا اسے، شہر بانو سب کچھ چھوڑ چھاڑ چلی آئی۔ ان کے سرسبز مخملیں فرش پر مرکری بلبوں کی جگمگاہٹ میں کھڑے نوجوان کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

''پہچان سکیں تو بات ہے۔ کون ہے یہ؟'' آفاق نے کہا اور شہر بانو غور کرتی رہ گئی۔

''ارے وہ چھوٹا سا لڑکا اتنا بڑا اینگ مین بن گیا۔ آپ کیا پہچان سکیں گی۔'' شہر بانو اب تک حیران

تھی۔

''ممی! یہ حسن ہیں۔ حسن بھائی جو کراچی میں تین سال میرے ساتھ ایک اسکول میں پڑھتے رہے تھے۔''

''اوہ گڈ گاڈ۔۔۔ یہ حسن ہے حسن رضا۔''

وہ دو قسم کا فاصلہ طے کر کے اس کے قریب آئی تو حسن بھی قدرے جھکا۔ شہر بانو نے اسے گلے لگا لیا۔

''یہاں کیسے آئے بیٹا۔ ہمارا ایڈریس کس سے ملا؟ کیا ہمیں اتنی مدت یاد رکھا تم نے؟''

''نہیں آنٹی وہی پرانی بات۔ یہ رابیل سڑک پر اکیلی کھڑی بسور رہی تھی۔ مجھے ترس آ گیا۔ چھوڑنے چلا آیا۔''

آفاق ہنس پڑے۔ تب رابیل نے جلدی جلدی ملاقات کی تفصیل بتا دی۔

''چلو اچھا ہوا۔ بھائی کو بہن آخر گھر لے آئی۔''

تب ہی انیل بھی آ گئی۔ اس سے تعارف ہوا۔

''ڈیڈی۔ کیا بازار میں ریڈی میڈ بھائی بھی ملتے ہیں۔ بیلا تو گفٹ لینے گئی تھی۔''

''دیکھ لو جی نصیب کی بات ہے۔ ضرورت سے زیادہ مل گیا۔ بہت لکی ہوں میں۔ ڈیڈی کہا کرتے ہیں۔'' رابیل اِترائی۔

اس نے برتھ ڈے میں جانے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ پورا گھر حسن کے گرد جمع رہا۔ آفاق کچھ دیر بعد اپنے آفس میں چلے گئے اور رابیل اور نیلی اس سے باتیں کرتی رہیں۔

❁❁❁❁

حسن کی فراغت کے لمحے اب تین پر تقسیم ہو گئے۔ اکثر وہ آفاق احمد کے گھر چلا جاتا۔ آفاق کی شفقت، شہر بانو کی الفت اور دونوں لڑکیوں کی وابستگی۔ ان سب میں حسن کے لیے بڑی کشش تھی۔ پھر ایل ایل بی کے امتحان دینے کے بعد تو فراغت ہی فراغت تھی۔ انیل اور رابیل سے اس کی دوستی خاصی چل رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں اسے ساتھ لے کر بڑے مان سے تفریحی مقامات پر پھرا کرتیں۔ اپنی سب باتیں وہ اسے بتا دیا کرتی تھیں۔ حسن نے جسے خود ایک پیاری سی بہن کی آرزو تھی ان دونوں کو اسی مقدس رشتے میں باندھ کر اپنے دل کے قریب کر لیا تھا۔ دونوں نے کرید کرید کر اس سے یہ بھی اگلوا لیا تھا کہ عائشہ خان اس کی زندگی ہے۔ زبردستی اس کے ساتھ چلی آئی تھیں اور عائشہ کو بھی اپنی معصومیت اور خلوص کے جال میں جکڑ لیا تھا۔ اور تو اور رابیل نے تو دستِ طلب برجیس خانم اور اکبر خان کے سامنے دراز کر دیا تھا۔ حسن کو یہ دونوں رازدار بہت عزیز ہو گئی تھیں۔ اب تفریحی مقامات پر عائشہ بھی ان تینوں کے ہمراہ ہوتی۔ اسی طرح ایک دن ضد کر کے شبنم سے ملنے یونیورسٹی چل دیں تا کہ اس سے حسن اور عائشہ کی بات کر سکیں۔ حسن نے ہاہزار منت انہیں خاموش رہنے کو کہا۔

ایک شام وہ شبنم کو خاموشی سے سیر کرنے کے بہانے ادھر لے آیا۔ ابھی وہ گھر کے گیٹ سے دور تھا کہ اشرف مل گیا۔ اس نے بتایا کہ جج صاحب کے والد کی وفات ہو گئی اور سب اُدھر گئے ہیں۔ تب وہ واپس آ گئے۔

❁❁❁❁

حسن بے چینی سے اُن سب کی واپسی کا منتظر تھا کہ شیر دل اپنی فیملی سمیت عید کی چھٹیوں میں گھر آ گئے۔ حسن کے پاس ان کے لیے ایک زبردست خبر تھی۔ جو ملتے ہی اس نے ان کے گوش گزار کر دی۔

عید کے تیسرے دن آفاق فیملی واپس آ گئی۔ شیر دل حسن کے ساتھ ان کی طرف چلے۔ سب ہی شیر دل سے ملے لیکن ان میں آفاق نہ تھے۔ شہر بانو نے بتایا۔ وہ کسی ضروری کام سے اپنی جاگیر باقر پور گئے تھے۔ شیر دل اور آفاق کی دوستی تکلف کی حد سے بہت آگے بڑھ آئی تھی۔ ٹیلی فون پر اکثر دونوں ایک دوسرے کو حالات سے باخبر رکھتے۔ آفاق ان سے ملنے ایک دو بار سرگودھا بھی گئے تھے۔ لیکن شیر دل کا ان کے گھر آنے کا پہلا اتفاق تھا جب کہ وہ گھر پر موجود ہی نہ تھے۔

شیر دل نے صرف ان سے تعزیت کرنے کی خاطر ہی اپنی چھٹی بڑھوالی۔ تیسرے دن آفاق آئے تو شیر دل کے ساتھ موجود حسن ان کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ والد کی موت کا اتنا غم۔ وہ حیران تھا۔ شیر دل بھی حیرت زدہ تھے۔ حسن شہر بانو کے پاس چلا گیا تو وہ دونوں تنہا رہ گئے۔ کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے شیر دل انہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔

''آفاق۔ اس دنیا میں لوگ آتے ہیں۔ انہیں جانا بھی ہوتا ہے۔ لیکن آپ نے تو یہ غم جان کا روگ بنالیا۔''

''ہاں شیر دل۔ بے شک لوگ آتے ہیں۔ انہیں جانا ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی ناکام و نامراد دنیا سے اٹھ جائے تو پس ماندگان کے جی کا روگ بن جاتا ہے۔''

''وہ کیسے آفاق۔ آپ کے والد صاحب نے خیر سے سب کچھ دیکھا۔ موت تو برحق تھی۔ آنا ہی تھی۔ بس آپ تو دعائے مغفرت کریں۔ یہ غم ہم میں سے ہر ایک کے لیے ہے۔''

''نہیں شیر دل جو غم ہمیں ملا ہے وہ ہماری زندگی کی ساری خوشیوں پر چھا گیا ہے۔ ہم جیتے جی مر گئے ہیں۔ ہمارے پاس احساسِ جرم کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' انہوں نے ہاتھ کی انگلیاں اضطرابی عالم میں ایک دوسرے میں پھنسا کر پیشانی ان سے ٹیک دی۔

بات کچھ اور تھی۔ مگر کیا؟ شیر دل بھی اب پریشان تھے۔ انہوں نے سر اٹھایا اور خالی نظریں شیر دل پر جما دیں۔

''نہ کوئی دوست ہے نہ غم گسار۔ نہ رازداں ہے نہ ہمدرد۔ کسے بتائیں، کسے سنائیں۔ شیر دل! اچھے دوست کسے بتائیں کہ ہمیں کیا ہوا۔ کون سا روگ ہماری جان کو لگ گیا۔''

''مجھ پر اعتماد کریں آفاق۔ میں بھی تو آپ کا دوست ہوں پلیز بلیومی۔ اپنے دکھ میری جھولی میں ڈال دیں۔ اور کچھ نہیں ہوگا تو غم کا بوجھ ضرور ہلکا ہو جائے گا۔''

آفاق احمد دروازہ بند کر کے ان کے قریب آ بیٹھے۔ اور وہ داستان جو کہ خود انہیں بھول چکی تھی من و عن شیر دل کے سامنے دُہرا دی۔ بعد میں اپنی پھپھو کے متعلق بتایا اور آخر میں اپنے پاپا کے بتائے ہوئے انکشافات۔ شیر دل سب کچھ بڑے سکون سے سُن رہے تھے۔

''شیر دل! ہم لندن گئے تو پھر لوٹ کر ریاض محل نہ جا سکے۔ شبنم ایک خواب بن کر رہ گئی تھی۔ ہم

واقعی اسے بھول چکے تھے۔ ہمارے حوصلے تو امی حضور کے غصے نے پست کر دیے تھے۔ ہم جان گئے تھے کہ جو کچھ ہم نے کیا ہے اسے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ پھر امی حضور کے حکم سے ہی شہر بانو ہماری زندگی میں آ گئیں۔ ہم جو ریاض محل تک نہ جا سکے تھے شبنم تک کس طرح جاتے۔ ہم نے اپنا ماضی فراموش کر دیا۔ حال میں گم رہے کاش مرنے سے قبل بابا جان نے ہم پر یہ ظلم نہ کیا ہوتا۔"

"کیسا ظلم؟"

"ہم جس وقت پہنچے بابا جان انتہائی تکلیف کے عالم میں تھے۔ انہوں نے ہمیں یعنی اپنے بڑے بیٹے کو تنہا اپنے قریب بٹھا کر وہ راز بتا دیا جسے انہوں نے سب سے چھپا رکھا تھا۔ وہ شبنم جسے ہم امداد حسین کی بیٹی سمجھتے تھے۔ درحقیقت ہماری پھوپھی زاد تھی۔ اور بابا جان نے اسے اپنی مصلحتوں کی بنا پر امداد حسین کے پاس اس کی بیٹی کی حیثیت سے رکھا ہوا تھا کہ ان میں زمانے کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔

عرصہ پہلے انہوں نے کاروبار کے بہانے ہمیں باقر پور اسی لیے بھیجا تھا کہ ہم شبنم کو دیکھیں۔ شاید اسے پسند کریں۔ اور اس کی رفاقت کی خواہش کریں۔ اور بابا جان اسی بہانے اسے اپنے گھر میں لے آئیں۔

شیر دل! وہ سب کچھ ہوا ضرور جو بابا جان نے چاہا۔ لیکن ہم بزدل نکلے۔ اپنے بابا جان پر اظہار نہ کر سکے۔ چپ چاپ ملک سے باہر چلے گئے۔ اور۔۔۔ اور شیر دل! حقیقتوں سے نظریں چرائے وہاں بیٹھے رہے۔ اب جب بابا جان نے بتایا تو کہ وہ ہماری تھی، ہمارا حق تھی، بابا جان کا جگر گوشہ تھی تو ہم صبر نہ کر سکے۔ جی چاہا اڑ کر اس تک پہنچ جائیں۔ بات ابھی ادھوری تھی۔ شبنم کا نام ایک پچھتاوا بنا ابھی بابا جان کے لبوں پر تھا کہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے ہم سے ناتا توڑ لیا۔ اس کے بارے میں کچھ اور بتائے بغیر۔

ہم سوئم کے بعد باقر پور گئے۔ روٹھی ہوئی شبنم کو منانے۔ اس کا احوال پوچھنے۔ اس سے معافی مانگنے لیکن وہ وہاں نہیں تھی شیر دل۔ وہ ہماری دنیا سے بہت دور چلی گئی تھی۔ وہ ہمارا انتظار نہ کر سکی تھی۔ ہماری امانت اپنے ساتھ لیے وہ افق کے پار چلی گئی۔"

آفاق کے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر ان کے دامن میں جذب ہو رہے تھے۔

"اب بولیں شیر دل! اب مجھے بتائیں کہ یہ غم جان کا روگ بنے گا یا نہیں۔ نہیں شیر دل۔ اب ہم نہ جی سکیں گے۔ ہمیں اس روشن صبح کا فسانہ اب تک یاد ہے جب ہماری پھپھو کو بابا جان نے ریاض محل سے نکال باہر کیا تھا۔ پھر ہم ان کے بارے میں کبھی نہ جان سکے کہ وہ کہاں ہیں۔ شبنم بھی ان ہی کی طرح بدنصیب تھی۔ آہ شبنم! ہم عمر بھر کی تلاش کے بعد اتنی دیر کے لیے بھی تمہیں کہیں نہ پا سکیں گے کہ تم سے معافی طلب کر لیں۔" انہوں نے سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ بند آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔

شیر دل کسی اور دنیا میں تھے۔ دفعتاً وہ بڑے غور سے آفاق کو دیکھنے لگے۔

"اوہ شبنم۔۔۔ تو یہ تھی وہ زنجیر۔۔۔ جس میں سرتاپا لپٹی تم میرے لیے شجر ممنوعہ بنی رہیں۔ یہی وہ خواب تھا جس نے تمہیں حقیقتوں سے دور رکھا اور تم نے سدا آنکھیں بند رکھیں۔"

وہ بھی آبدیدہ تھے۔ اس دوست کی خاطر نہیں جس کی ہمدردی میں وہ ابھی سخت پریشان تھے۔ اس دل کی خاطر جس نے آرزو کی بھی تو ایک لاحاصل وجود کی۔ اپنی محرومی پر روئے پھر انہیں اپنے آپ پر

حیرت ہوئی۔

''شیر دل۔تم تو آفاق کا غم بانٹ رہے تھے۔اپنے دکھ پر رونے کا کون سا موقع تھا بھلا؟''

انہوں نے آنکھیں رومال سے صاف کرلیں۔کئی گھڑیاں خاموشی سے گزر گئیں۔

''بڑے دل والے اپنے لیے کوئی چیز چھپا کر نہیں رکھتے۔سب کچھ ضرورت مندوں میں بانٹ دیتے ہیں شیر دل۔آفاق کو خوشیوں کی ضرورت ہے۔تم خوشیاں ان کی جھولی میں ڈال دو۔تھوڑی سی تاخیر بدی کے خانے میں لکھی جائے گی شیر دل۔انہیں بتادو کہ جس شبنم کے مرجانے کی خبر نے ان کے جی کو روگی بنا دیا ہے۔وہ زندہ ہے۔ان کی آس میں ہے۔ان کی منتظر ہے۔وہ حسن جسے رابیل اور انیل بھائیوں کی طرح چاہتی ہیں،درحقیقت ان کا بھائی ہی ہے۔''

انہوں نے آفاق کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

''آفاق احمد بخاری۔۔۔''اس اندازِ تخاطب پر آفاق نے آنکھیں کھول کر شیر دل کی طرف دیکھا۔

''اگر آپ محسن رضا نقوی کے نام سے آگاہ ہیں تو یہ بھی سن لیں کہ میں ان کا بھتیجا ہوں۔''وہ ٹھٹک سے گئے۔شیر دل نے پے در پے کئی وار ایک دم کیے۔

''اور شبنم کا تایازاد۔''

''شیر دل۔۔۔یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''وہ ابھی تک حیران سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''میں تو اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔اگر آپ میں سننے کا حوصلہ ہو تو۔''

''کیا کہیں گے آپ شیر دل۔۔۔اور کیا۔۔۔ہم میں اور آپ میں جو ناتے تھے وہ میری پھپھو اور شبنم کے مرنے سے ختم ہوگئے۔کہانی شروع بھی کب ہوئی جب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔''

''کہاں ختم ہوا ہے آفاق بخاری۔یہ تو درمیانی وقفہ ہے۔بہت بدنصیب ہے ایک بدنصیب ماں کی بیٹی اور بہت خوش نصیب ہیں آپ ایک ظالم باپ کے بیٹے۔''

''کیا مطلب؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟

''اسی کی۔اپنی عم زاد شبنم کی۔ایک عظیم عورت کی۔ایک پتی ورتا عورت کی۔جس نے اپنی زندگی آپ کی غفلت کے نام لگادی۔آپ کے دیے فریب کو زادِ راہ بنا کر زندگی کا طویل سفر تنہا طے کرتی رہی۔''

''زندگی کا سفر طے کرتی رہی۔۔۔شبنم۔۔۔شبنم۔۔۔وہ۔۔۔آپ کو کیسے خبر ہے شیر دل۔۔۔وہ تو امداد حسین کے پاس تھی وہیں اس نے خودکشی کرلی۔''

''نہیں آفاق۔۔۔بے شک وہ خودکشی کرنے ہی آئی تھی۔اس ویران راستے سے گزرنے والی ریلوے لائن پر۔لیکن ہم نے اسے بچالیا اور اپنے ساتھ لے آئے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ شیر دل۔''

''ایک حقیقت جو تلخ بھی ہے اور شیریں بھی۔آپ کی بے حسی اور شبنم کے ایثار و محبت سے بھری حقیقت۔''

''شبنم زندہ ہے۔شبنم آپ کے پاس ہے شیر دل۔ہمیں سچ بتایئے۔پے در پے یہ حادثے ہمیں مار نہ ڈالیں۔ہمیں شبنم کے پاس لے چلیے۔خدارا ایک بار ہمیں اس سے ملوا دیجیے۔ہم بے سکون ہو رہے ہیں۔ہم بے چین ہو رہے ہیں۔ہمیں سکون دے دیجیے شیر دل۔ہم ساری زیادتیوں کا ازالہ کردیں گے۔ہم

سارے دکھ اپنے سینے میں اتار لیں گے۔ ہم زمانے بھر کی خوشیوں سے شبنم کا دامن بھر دیں گے۔''

''آپ تو جب دیں گے خوشیاں دیں گے ہی لیکن میں آپ کو ایک مجسم خوشی ابھی دینا چاہتا ہوں۔ آفاق احمد کیا اسے دیکھ کر آپ کے دل میں کبھی محبت کی کوئی کلی نہیں کھلی؟ جس کے خون میں آپ کی مہک شامل ہے۔ کیا اسے دیکھ کر کسی درد نے دل میں کروٹ نہیں لی۔ جو آپ کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ آپ کا بیٹا حسن۔۔۔!''

''ہمارا بیٹا۔۔۔ یعنی کہ ہماری شبنم کے وجود میں پرورش پانے والا ہمارا اپنا بیٹا۔ شیر دل کہیں آپ مجھ سے کوئی مذاق تو نہیں کر رہے۔''

''آفاق۔۔۔ کسی کو دکھ دینا میرا تو شیوہ نہیں رہا کبھی۔''

فرطِ مسرت اور حیرت سے آفاق گنگ سے ہو گئے۔ زمانے ان کی نظروں میں گھوم رہے تھے شاید۔ پھر وہ اٹھے۔ اور شیر دل کا ہاتھ تھامے ان آوازوں کی سمت چلے جو ڈرائنگ روم سے آ رہی تھیں۔ ان کے بچوں کی آوازیں۔ حسن شہر بانو کے ساتھ بیٹھا تھا اور رابیل اور انیل ساتھ والے صوفے پر بیٹھی اس سے باتوں میں مگن تھیں۔ ان کی نظریں حسن پر جمی تھیں۔ انہیں دیکھ کر رابیل لپک کر قریب آئی۔

''اوہ ڈیڈی۔۔۔ انکل۔۔۔ شکر ہے آپ بھی آ گئے۔ ہم اپنے بھیا کو قائل کر رہے تھے کہ اب ہماری بھابھی آ جانی چاہیے۔ اور بھیا صاحب بضد ہیں کہ پہلے وہ سرکار کے نوکر ہوں گے بعد میں جورو کے غلام۔''

چاروں کے مسکراتے چہرے آفاق اور شیر دل کے سامنے تھے۔ آفاق کتنی دیر حسن کو تکتے رہے کہ اس افتاد پر خود حسن گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ آفاق میں مزید صبر کا یارا نہ تھا۔ بڑھ کر اس سے لپٹ گئے۔ دیوانہ وار اس کا منہ چومتے ہوئے بے اختیار رونے لگے۔

''کیا ہوا ڈیڈی؟ کیا ہوا؟'' دونوں بیٹیاں گھبرا گئیں۔

''کیا بات ہے آفاق؟'' شہر بانو کو تشویش ہوئی۔

''شیری۔۔۔! ہم نے بہت بڑی دولت پا لی۔ ہم نے خزانہ پا لیا جو سوچا بھی نہ تھا وہ ہمیں مل گیا۔ یہ ہمارا بیٹا ہے شیری۔ ہمارا اپنا بیٹا۔ ہمارے جگر کا ٹکڑا۔ ہماری آنکھوں کا نور۔ ہمارا اپنا حسن۔''

سب کے لیے یہ انتہائی حیران کن بات تھی۔ ناقابلِ یقین ایسی خبر جس کا پچیس چھبیس سالوں میں ایک بار بھی ذکر نہیں ہوا تھا۔ حسن تو دم بخود کھڑا تھا۔ پریشان اور الجھا الجھا سا۔ شیر دل کی طرف بڑھ آیا۔

''انکل!'' اس نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''یہ تمہارے ڈیڈی ہیں بیٹے۔'' شیر دل نے جواباً کہا۔

یہ جواب سب کے لیے غیر متوقع تھا۔

''ہاں بیٹے۔ حالات کے ستم ہمیں تم سے دور لے گئے۔ زندگی کی رنگینیوں میں ہم تمہارے بارے میں سوچ بھی نہ سکے۔''

حسن اب تک آفاق احمد کے سینے سے لگا ہوا تھا اور اس کا ذہن کچھ سوچنے سے قاصر تھا۔

رابیل اور انیل نے سازش بہت گہری کی تھی اور اس میں نہ صرف شبنم کو بلکہ محسن رضا اور فرزانہ کو بھی شریک کیا تھا۔ ابھی ابھی جب شیر دل حسن کے ساتھ رضا ہاؤس آئے تو انہیں پتا چلا۔ محسن رضا فرزانہ اور شبنم کے ساتھ اکبر خان کے گھر گئے تھے۔ جہاں شبنم نے صرف بہو ہی نہیں مدتوں کی بچھڑی سہیلی برجیس کو بھی پالیا تھا جو اب مشہور قانون دان اکبر خان کی اہلیہ تھی اور عائشہ خان کی والدہ۔ بہت خوش تھی شبنم برجیس سے مل کر اور برجیس تو شبنم کو پہچان کر انگشت بدنداں رہ گئی تھی۔ گھڑیوں اسے اس حقیقت پر یقین نہیں آیا تھا۔ اور یقین آیا تو دونوں سہیلیاں گلے مل کر پہلے تو خوب روئیں اور پھر سر جوڑ کر ایک دوسرے سے محو گفتگو رہیں۔ محسن رضا اور فرزانہ عائشہ اور اکبر خان کے ساتھ بیٹھے رہے۔ برجیس سے مل کر شبنم بہت خوش تھی۔ وہ وہیں عائشہ کو انگوٹھی پہنا کر بات پکی کر آئے تھے۔ اور اب واپس آ کر وہ سب سے پہلے یہ خبر اپنے بیٹے کو دینا چاہتی تھی۔ بیٹا اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ وہ باہر نکلی تو دیکھا شیر دل اور حسن دونوں اسی طرف آ رہے تھے۔

''حسن! تم پاپا کے پاس جاؤ۔ میں شبنم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''آؤ شبنم۔'' شیر دل اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

''آپ سہ پہر کہاں چلے گئے تھے شیر دل۔ آپ کا ساتھ جانا بھی تو ضروری تھا۔''

''بات پکی ہو گئی نا؟''

''ہاں۔ اللہ کے فضل و کرم سے۔''

''چلو اچھا ہے۔ شادی میں ایک میں ہی نہیں اور بھی بہت سے اہم لوگ ہوں گے۔'' شیر دل نے خوش دلی سے کہا۔ شبنم نے انہیں سامنے پڑی آرام کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور خود بھی بیٹھنے لگی۔

''یہ دن بڑے دنوں بعد آیا ہے شیر دل۔۔۔ ایک ماں کی خوشی۔۔۔'' یہ الفاظ ابھی لبوں پر تھے کہ اچانک سینے پر ہاتھ رکھ کے وہ جھکی اور جھکتی چلی گئی۔ شیر دل کچھ نہ سمجھے۔ شبنم بمشکل کرسی پر بیٹھی۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ لمحے بھر میں زرد پڑتا چہرہ اور بھنچے لب شیر دل کے سامنے تھے۔ وہ بوکھلا کر اس کی طرف آئے۔

''کیا ہوا شبنم؟ کیا ہوا؟''

وہ نارمل ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ ہاتھ سینے سے ہٹا دیا۔

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی چکر سا آ گیا تھا۔''

ابھی اس نے بات مکمل کی تھی کہ درد کی لہر نے اسے بے حال کر دیا۔ ضبط کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ زرد ہوتی چلی گئی۔ اس کی اکھڑی اکھڑی سانسوں نے شیر دل کو پریشان کر دیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما جو ٹھنڈ یخ ہو چلا تھا۔

''رضی انکل۔۔۔ حسن۔۔ عامر۔۔ طاہر۔۔۔'' وہ پریشان ہو کر سب کو آوازیں دینے لگے۔ زور دار آواز سے۔

اور جب ان کی آواز پر سب لپک کر اس کمرے میں آئے تو شبنم کا نڈھال وجود ان کی بانہوں میں تھا۔

''اسے دیکھیے انکل! شبنم کو کچھ ہو گیا ہے۔ شبنم کو سنبھالیے انکل۔''

محسن رضا اپنے مسیحائی کے پیشے کے تقاضے کے مطابق بغیر کسی گھبراہٹ کے اس پر جھک گئے۔

شیر دل نے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔

❁❁❁❁

وہ خود ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ جان چکے تھے کہ دل کا درد تھا۔ لیکن پہلا دورہ اتنا خطرناک۔ گھر سے ہاسپٹل میں رکھنا زیادہ بہتر لگا انہیں۔ پورا گھر پریشان تھا۔ پورا دن مختلف لوگ شبنم کے پاس آتے رہے۔ یہ خبر آفاق احمد تک بھی پہنچی۔ وہ بے چین و بے قرار تھے۔ لیکن انہیں شبنم تک آنے اور اسے دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ محسن رضا کو سب حالات کی خبر ہو گئی تھی۔ آفاق احمد، شہر بانو، رابیل اور انیل کے ساتھ رضا ہاؤس آئے۔ ان سے معافی طلب کرنے۔۔۔ ان کی خندہ پیشانی نے آفاق کو مجرم ہونے کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔

شہر بانو تمام حالات سے آگاہ ہو گئی تھی۔ وہ آفاق جو ایک حرف کبھی زبان پر نہ لا سکے تھے انہوں نے دل کھول کر شیری کے سامنے رکھ دیا۔ شبنم اور مریم کی مظلومیت پر اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

اب وہ خود آفاق کی وکالت کرنے یہاں آئی تھی۔ عورت پُرخلوص ہو جائے تو بڑی سے بڑی قربانی دینا معمولی سی بات بن جاتی ہے اس کے لیے۔ رابیل اور انیل تو شبنم کو کئی بار دیکھ آئی تھیں۔ بلکہ کافی وقت اس کے پاس موجود رہتی تھیں۔ عائشہ سارا وقت اس کے پاس رہتی۔ سوائے رات کے لمحوں کے۔ آج شبنم کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ شبنم کو حالات سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری شیر دل نے اپنے سر لی تھی۔ جب وہ ہاسپٹل پہنچے عائشہ، فرزانہ، محسن رضا اور حسن وہیں موجود تھے۔ شبنم ہنستی مسکراتی ان سب سے باتوں میں مگن تھی۔

پھر محسن رضا اور فرزانہ راؤنڈ پر چلے گئے تو انہوں نے حسن اور عائشہ کو باہر جانے کا حکم دیا۔ شیر دل کھڑکی کے سامنے کھڑے موسم کی رنگینیوں کو بغور دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل کا گلشن ایسی بہار کو ترستا رہا۔ لیکن بہار نہ آئی۔ وہ پلٹے اور شبنم کی طرف آئے۔

''اب کیسی طبیعت ہے شبنم؟''

''اللہ کا شکر ہے بہت بہتر ہوں۔''

شیر دل بیڈ کے ساتھ پڑی ایزی چیئر پر بیٹھ گئے۔ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ابتدا کہاں سے کریں۔

''شبنم! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''ضرور کہیے۔''

''بات تمہاری ذات سے متعلق ہے شبنم! حوصلے مجتمع رکھ کے سننا ہو گی۔''

''حالات نے مجھے بہت حوصلہ مند بنا دیا ہے شیر دل! خبر جو بھی ہے سن لوں گی۔''

انہیں مطلب کی بات کہنے کا ڈھنگ نہ آ رہا تھا۔

''شبنم! حسن نے رابیل اور انیل کو بہنوں کا درجہ دے رکھا ہے۔''

''یہ فطرت کا تقاضا تھا شیر دل۔ جو چیز نہ ہو آدمی کسی حیلے بہانے اسے پانے کی سعی کرتا ہے۔''

''جانتی ہو کس کی بیٹیاں ہیں؟''

''ہاں ایک بہت بڑے آدمی سید آفاق احمد بخاری کی۔'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ شیر دل

ہڑبڑا کر بولے۔
''جانتی ہو وہ کون ہے؟''
''ہاں۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ کون ہے۔''
''یہ بھی کہ تمہارا اس کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟'' شیر دل کو اس کے اطمینان پر سخت حیرانی تھی۔
''جو تھے تو سارے رشتے اسی کے ساتھ جو نہیں تو ذرّہ برابر تعلق بھی نہیں۔ گھور سیاہ راتوں میں نقاب ڈال کر آنے والے ڈاکوؤں اور لٹیروں سے لٹنے والوں کا کیا رشتہ ہوتا ہے شیر دل؟ کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟''
''شبنم۔۔۔! شبنم۔۔۔!''
''ہاں شیر دل میرے ہمدرد، میرے غم گسار، میں جانتی تھی ایک نہ ایک دن آپ اپنے تئیں یہ خوش خبری لے کر میرے پاس آئیں گے۔ میں یہ نام پچھلے دو ماہ سے حسن کی زبانی سن رہی تھی۔ میں نے اس کی بچیوں کے لبوں سے سنا تھا۔ اور ایک بار حسن مجھے ان کے گھر لے کر گیا تھا تو میں نے یہ نام اس کے گھر کے باہر بھی لکھا دیکھا تھا۔ میں سب جانتی ہوں۔ مجھے سب خبر ہے۔ ایک ماں اپنے بچوں کے اندر تک جھانک کر دیکھنے اور ان کے غم اور خوشی کو پہچاننے کا سلیقہ اور ادراک رکھتی ہے شیر دل۔ حسن کا چہرہ کئی دنوں سے مجھے بتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک نئی روشنی جو بکھری ہے تو شاید اس نے اپنے باپ کا سراغ پالیا ہے۔''
شیر دل حیرانی سے اسے تک رہے تھے۔
''اور اب آپ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں آفاق سے ملوں؟''
اس کے تیور شیر دل کی سمجھ سے باہر تھے۔
''ہاں شبنم۔۔۔! مجھے رضی انکل نے کہا ہے۔''
''ٹھیک ہے۔ آفاق جب چاہے ملنے آ سکتا ہے۔ میں آج گھر چلی جاؤں گی۔''
انہیں شبنم کی اس آمادگی پر خوشی بھی ہوئی۔ لیکن وہ دل جو اپنی محرومی پر روا تھا۔ وہ دل بڑا بے چین سا ہوا۔ ایک عورت کی نفسیات سمجھنے سے قاصر نظر آ رہے تھے وہ۔ عورت کا دل اپنے محبوب کی خاطر اتنا وسیع ہوتا ہے کہ سارے گناہ، ساری زیادتیاں اس میں سما کر چھپ جاتی ہیں۔ ''کاش یہ وسیع دل میری خاطر ہوتا۔'' وہ دل پھر روا تھا۔

❁❁❁❁

شام سے کچھ پہلے شبنم کو گھر جانا تھا۔ محسن رضا کمرے میں آئے تو وہ موجود نہ تھی۔ بے حد حیران ہوئے۔ اسی وقت گھر فون کیا۔ لیکن وہ گھر پر بھی نہ تھی۔ اب تو پریشان بھی ہو گئے۔ کہاں جا سکتی تھی۔ کہاں ہو گی وہ؟ ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور جس وقت محسن رضا شیر دل سے یہ ذکر کر رہے تھے۔
شبنم، شہر بانو کے سامنے کھڑی آفاق تک جانے کا راستہ پوچھ رہی تھی۔ شہر بانو نے اسے بغیر کسی دقت کے پہچان لیا تھا۔ اور آفاق تک لے آئی تھی۔ وہ شبنم کو دروازے تک لا کر خود واپس پلٹ گئی۔ شبنم دروازے کا پردہ تھامے لمحہ بھر وہاں رکی رہی۔ قدموں کی آہٹ پر آفاق کی توجہ کتاب سے ہٹ کر دروازے کی طرف ہوئی تو وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک اجنبی خاتون دروازے پر کھڑی تھی۔

جب کہ آج تک کوئی بھی بغیر اطلاع کے یوں ان کے کمرے تک نہ آیا تھا۔

''مجھے پہچاننے میں خاصی دقت ہوگی آپ کو۔ ہوسکتا ہے پہچان ہی نہ پائیں کیونکہ میں شبنم رضا ہوں۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کی پروفیسر ''شبنم محسن رضا۔'' اس کے لہجے میں پختگی تھی۔ سختی تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر نہ گھبرائی تھی نہ نروس ہوئی تھی اور نہ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آئی تھی۔ آفاق تصویرِ حیرت بنے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

سرمئی ساڑھی میں لپٹی یہ عورت جس کے چہرے کا ایک ایک نقش اپنے حسن سمیت اپنی جگہ پوری شان سے ایستادہ تھا۔ اپنی ستارہ آنکھوں میں وہی چمک لیے جس نے آفاق کا دل لوٹ لیا تھا ان کے سامنے تھی۔

اور شبنم۔۔۔ شبنم لمحہ بھر انہیں دیکھنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ یہ چھوٹے سرکار تھے۔ چھوٹے سرکار۔ جن کی محبت میں ایک چھوٹے آدمی کی بیٹی نے اپنا سب کچھ خوشی سے لٹا دیا تھا اور لٹانے کے بعد بھری دنیا میں خالی اور تنہا ہو کر دنیا کے خوف سے دنیا چھوڑ دینے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ یہ آفاق احمد تھا جو وفا کے سنہری جال میں روح کو وعدوں کے غذا دے کر قید کرنے کے بعد چھبیس سال عیش و عشرت کی زندگی گزارتا رہا تھا۔ آج بھی پہلے کی طرح شاندار تھا پہلے کی طرح دلربائی کے سارے ہتھیاروں سے لیس تھا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت اور باوقار تھا۔ خوشیوں کے میلے انسان کو تھکنے نہیں دیتے نا اور تھکن نہ ہو کمزوری بھی غالب نہیں آتی۔

''شبنم۔۔۔!'' آفاق احمد کے لب ہلے۔ وہی پرانا انداز تھا۔

''اتنے بڑے آدمی کو غیر عورتوں کو مخاطب کرنے کا سلیقہ بھی نہیں۔'' وہ بہت سارے قدم آگے بڑھ آئے۔

''شبنم۔۔۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری آنکھوں نے تمہیں دوبارہ دیکھ لیا۔ شبنم تم غیر نہیں ہو۔ ہماری اپنی ہو۔''

''مت لائیں یہ جھوٹے الفاظ اپنے لبوں پر۔ مجھے جھوٹ سے شدید نفرت ہے۔''

''یہ جھوٹ نہیں ہے شبنم۔ تم ہماری پھوپھی زاد بھی تو ہو۔ ہمارا خون بھی تو ہو۔ بابا جان نے ہمیں سب کچھ بتا دیا۔''

''اچھا تو آپ اسی رشتہ داری کے احترام اور پاسداری میں مجھ تک واپسی کی راہ پر گامزن ہوئے۔ بڑا احترام کرتے ہیں آپ رشتوں ناتوں کا۔'' اس کی آنکھوں میں قہر اور جلال تھا۔

''کچھ بھی ہو شبنم۔ ہم تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تمہیں خوشیاں دینا چاہتے ہیں۔''

''صرف اس لیے نا کہ میں آپ کی پھوپھی زاد ہوں۔ صرف اس لیے نا کہ میں ڈاکٹر محسن رضا نقوی کی بیٹی ہوں۔ اگر میں امداد حسین کی بیٹی ہوتی تو آپ بڑے سکون سے اپنے محل میں بیٹھے اتنی خبر لینے کی کوشش بھی نہ کرتے کہ وہ جسے آپ نے فریب دے کر لوٹا۔ آپ کے ستم کے بعد زندہ بھی رہی یا مر گئی۔ آپ خوشیاں دینا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ پہلے مجھے اتنا بتا دیں کہ آپ چھبیس سال کہاں تھے۔ پورے چھبیس برس۔ جب میرے پاس خوشی کے نام کا چھوٹا سا خواب بھی نہ تھا۔ کیا تب مجھے خوشیوں کی ضرورت نہ تھی؟'' آفاق احمد کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پھر بھی ایک فقرہ لبوں پر آ گیا۔

''میں سخت مجبور تھا شبنم۔''

''مجبور اور آپ ۔۔۔؟ نہیں نہیں۔ بڑے آدمیوں کو کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ یہ تو پہلو تہی کا ایک بہانہ ہوتا ہے۔ کسی سے سب کچھ چھین لینے کے بعد، کسی کا استحصال کرنے کے بعد جب وہ نئی منزلوں کی طرف گامزن ہوتے ہیں تو مجبور نہیں مطمئن ہوتے ہیں کہ وہ جب چاہیں جس سے چاہیں سب کچھ چھین سکتے ہیں۔ اور جواب دہی کے عمل سے بھی آزاد رہ سکتے ہیں۔''

''شبنم ۔۔۔ تم غلط فہمی کا شکار ہو۔۔۔ محبت میں نے تم سے کی۔۔۔''

''آفاق ۔۔۔! اتنا بڑا جھوٹ مت بولو آفاق ۔۔۔'' شبنم جو سدا خاموش رہنے کی خوگر تھی۔ چیخ ہی تو اٹھی۔

''تم نے محبت کی ۔۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔ محبت میں نے کی ۔۔۔۔ میں نے محبت کی ۔۔۔ دل کی دنیا تمہارے وجود سے آباد کی ۔۔۔ تمہیں بہت اعلیٰ وارفع مقام دیا ۔۔۔ دل کی بستی ایک بار آباد ہوتی ہے پھر نہیں اُجڑتی۔ عورت کے ہاتھوں میں اس بستی کو تاخت وتاراج کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس دنیا کو وہ سنبھال کر رکھتی ہے لیکن تم ۔۔۔ تم نے آفاق احمد تم نے میرے دل کا گلشن بڑی بے دردی سے اجاڑا۔ بڑی تباہی پھیلائی کہ میں مدتوں ہنسنے کی تو کیا مسکرانے کی ہمت بھی نہ کر سکی۔ کیا صرف اس لیے میں تمہارے ایک معمولی ملازم امداد حسین کی بیٹی تھی۔ کیا تم ایسا کھیل کسی بڑے آدمی کی بیٹی سے رچاتے؟ تم جانتے تھے کہ ان کمزور لوگوں میں کبھی تمہارے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہوگا۔''

''شبنم ۔۔۔'' وہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے۔

''مجھے تمہاری ایک بات سننے کا بھی شوق نہیں۔ ہاں اتنی آرزو تھی کہ زندگی کے سفر میں ایک بار مل جاؤ تو اپنے دل کی ساری باتیں تم تک پہنچا دوں۔''

''تم بیٹھو تو سہی شبنم ۔۔۔ کیا یونہی کھڑے کھڑے باتیں کیے جاؤ گی ابھی تم مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئیں۔''

''بہت احساس ہے میری صحت یابی کا۔ اندھیری راتوں میں غم کے خاردار صحرا میں تنہا چھوڑ جاتے وقت یہ احساس کہاں تھا۔ تمہیں تسلیم کرنا ہوگا آفاق احمد کہ تم ایک لمحے کے لیے بھی میرے خیر خواہ نہ تھے۔ تم مجھے چھوڑ کر چھبیس سال چین سے دنیا میں آباد رہے۔ غم وآلام کے بادل میری زندگی کے آسمان پر یوں چھائے کہ میں نے فرار کے لیے موت کا راستہ ڈھونڈا۔ وہاں مجھے محسن رضا مل گئے۔ جنہوں نے نہ صرف مجھے بچایا بلکہ مجھے پناہ بھی دی۔ مجھے نئی زندگی دی تو جینے کا حوصلہ بھی دیا۔ تب میں ان کے لیے قطعاً اجنبی اور نا آشنا تھی۔ انہوں نے میرے وجود میں پلنے والے وجود کو بھی عزیز جانا۔ میری حفاظت کی۔ مجھے گھر میں ایک مقام دیا۔ مجھ پر جان نچھاور کی۔ میری خاطر زمانے سے ٹکرائے۔ مجھے علم کی روشنی دے کر مکمل انسان بنانے کی سعی کی۔ وہ سب کچھ جو ایک عزیز بیٹی کے لیے باپ کرتا ہے۔ وہ سب کچھ میرے عظیم باپ نے اس انکشاف سے پہلے کر دیا کہ میں ان کی بیٹی ہوں۔ میرے پاپا اچانک امداد حسین میرے بابا سے جا ملے تھے۔ اُس نے سب کچھ بتایا۔ سب کچھ۔۔۔

امداد حسین کے لیے تم تک پہنچنا محال ہوتا لیکن پاپا کے لیے مشکل نہ تھا۔ مگر میں نے اُسی دن تم سے سارے رشتے منقطع کر دیے۔ جب میں نے یہ سنا کہ آٹھ سالوں میں تم ایک بار بھی میرا پوچھنے باقر

پورا نہیں آئے۔

سارے رشتے تو روح کے ہوتے ہیں آفاق احمد۔ خون کا ہو یا کاغذی رشتہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ احساس کے بغیر۔''

''لیکن بہر حال تم میری بیوی ہو۔ اس رشتے کی مذہبی، سماجی اور قانونی حیثیت ہے۔''

''اچھا تمہیں یہ ساری حیثیتیں یاد ہیں۔''

''اس لیے کہ تم میرے بیٹے کی ماں ہو میرے وارث کو جنم دینے والی۔''

''کس کا بیٹا۔۔۔؟ کیسا بیٹا۔۔۔؟ بیٹا تو وہ محسن رضا کا ہے جنہوں نے اسے دنیا کے سرد و گرم سے محفوظ رکھتے ہوئے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ کون ہے؟ کس کا ہے؟ کس رنگ اور نسل کا ہے؟ بیٹا تو وہ شیر دل کا ہے۔ جنہوں نے اسے عمر بھر اپنے دل میں جگہ دی۔ اس کے لیے تکلیفیں برداشت کیں اور بیٹا تو صرف وہ میرا ہے میرا۔ میں، جس نے اسے جنم دیا، میں، جو ہر دم اس کے ساتھ رہی۔ میں، جس نے اپنا آپ اس کی خاطر وقف رکھا۔ میں اس کی ماں ہوں۔ تم کچھ بھی نہیں۔ تم۔۔۔ تم نے تو اپنے چند وقتی جذبوں کی تکمیل میں انجانے میں اس کی بنیاد ڈال دی تھی اور بھول گئے تھے۔ تم اس کے کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔''

''میرے بغیر حسن کی زندگی میں ایک خلا رہے گا۔ وہ اپنے خاندان سے جدا رہے، کٹا رہے، میں اسے کچھ نہ دے سکوں یہ کب ممکن ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ایک ایسے باپ کا بیٹا جسے ساری دنیا اس کی اعلیٰ معاشرتی حیثیت سے پہچانتی ہو گمنام رہے۔ ایک بڑے آدمی کا بیٹا عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا رہے۔''

''اچھا۔۔۔ صرف لوگ ہی نہیں تم بھی خود کو ''بڑا آدمی'' تصور کرتے ہو۔ تم بڑے آدمی ہو۔۔۔؟''

شبنم نے سر تا پا بغور انہیں دیکھا۔

''واقعی یہ بڑائی تمہیں ورثے میں ملی ہے۔ بڑے آدمی تمہارے والد بھی تھے۔ جن کی بڑائی نے میری ماں کو کسمپرسی کے عالم میں جان دینے پر مجبور کیا کہ اس کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے امداد حسین اور اختر کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ کہ کہیں اس بڑے آدمی کے وقار اور عظمت کو اس کے غرور اور تکبر کے بت کو کوئی ٹھیس نہ لگ جائے۔

مگر مجھے تو وہ ریاض احمد بخاری بڑے آدمی لگے نہ تم۔

آخر تم کس زاویے سے بڑے آدمی ہو۔ قد بت میں بڑے ہوتے تو مجھے تمہارے سائے میں امن ضرور ملتا۔ مالی لحاظ سے بڑے ہوتے تو تمہارا بیٹا غیروں کے در پر دوسروں کے رحم و کرم پر نہ رہتا۔ اخلاقی لحاظ سے بڑے ہوتے تو اپنے نہ سہی میرے جرم محبت کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے مجھے بہر حال اپنے دامن سے وابستہ رکھتے ہوئے تحفظ مہیا کرتے۔

نہیں نہیں، آفاق احمد تم بہت چھوٹے آدمی ہو۔ چھوٹے آدمی بے چارے ظرف بھی چھوٹا رکھتے ہیں۔ جس میں صرف اُن کی اپنی آرزوئیں اور امنگیں سما سکتی ہیں۔ بے چارے دوسروں کی خاطر کیا جئیں اپنی خاطر بمشکل جی پاتے ہیں۔ ان بے چاروں کا دل بھی بہت چھوٹا ہوتا ہے دوسروں کا درد جہاں جگہ نہیں لے سکتا ایسے ہی درد سے پُر ہوتا ہے اُن کا دل۔۔۔ دل چھوٹا ہوتا ہے نا۔۔۔ اُن کی رگوں کے لیے

خون بھی اتنا ہی مہیا کر سکتا ہے جو بمشکل اُن کے لیے کافی ہو۔ اس خون سے وہ دوسروں کا گلشن آب یار نہیں کر سکتے اور یہ ستم کشتگان اپنے آپ میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ کسی اور کو پہچان ہی نہیں سکتے۔

شاید تم نے ابھی تک کسی بڑے آدمی کو نہ دیکھا ہو۔ میرے تصور میں آجاؤ آفاق اور دیکھو کہ کتنے بڑے آدمی ہیں میرے گرد۔ ایک چھوٹے آدمی کی غفلت کی نذر ہوئی تو کتنے بڑے آدمیوں نے مل کر مجھے سنبھالا۔

آفاق احمد! بڑے آدمی تو میرے پاپا ہیں۔ جنہوں نے جذبۂ محبت کی بقا کی خاطر پوری دنیا چھوڑ دی۔ وفا کے نام پر بغیر کسی آس کے عمر عزیز کا قیمتی حصہ تنہا گزار دیا۔ رات کے اندھیرے میں موت کی دہلیز پر کھڑی بے سہارا لڑکی کو زندگی کی طرف واپس لائے تو انسانیت کو پورا حق ادا کر دیا۔ ایک بچے کو اپنے نام کا تحفظ دیتے وقت دنیا والوں کی اُٹھتی انگلیوں کی پروا نہ کی۔ بڑے آدمی تو شیر دل ہیں۔ ایک ایسے وجود کی خاطر جسے انہوں نے اسے دیکھا تک نہ تھا جان کی بازی لگا دی۔ پھر اُس سے آشنا ہوئے تو اُسے بے سہارا بے نام ونشان، بے یار ومددگار پایا۔ پھر بھی اپنا دامنِ محبت اُس کے لیے وا کر دیا۔ اُسے خوشیاں دینے کی سعی میں زمانے بھر سے ٹکرا گئے۔ ستم تو دیکھو آفاق احمد! میرے دل میں تو اس وقت تم آباد تھے۔ میں نے اُن ساری خوشیوں کو نظر بھر کر دیکھنا گوارا نہ کیا۔ پھر بھی نہ وہ جھنجھلائے نہ انہوں نے مجھ سے انتقام لیا۔ نہ مجھے برباد کیا۔ نہ میری مرضی کے خلاف مجھ سے کچھ چھیننے کا سوچا۔

بڑے آدمی تھے ناظرف بھی بڑا تھا۔ اور اس ظرف میں زیادہ کچھ دنیا کو دینے کے لیے تھا۔ اُس میں سے جو مجھے دیا۔ اُسے لوٹانے کا سوچا بھی نہ۔ عمر بھر میرے پاسبان بنے رہے۔ کسی صلے کی، آس کے بغیر۔

پھر وہ لمحہ بھی آیا۔ جب تمہاری بے گانگی پر مجھے تم سے نفرت ہوگئی شدید نفرت۔ میں نے تب بھی اپنے جذبوں کا رخ نہیں موڑا۔ تمہاری خاطر نہیں، وفا کے اُس احساس کی خاطر جو مجھے ہی نہیں میرے معبود کو بھی پسند ہے۔ بے شک تم نے کھیل رچایا پر میں نے تو تم سنگ بندھن ایمانداری سے باندھا تھا۔ میں اس بندھن کو کیسے توڑ دیتی۔

پھر میں خاموش رہی۔ میں نے دل زار کے معاملے اُن پر بڑے ظرف والوں کے سامنے بھی نہ کھولے۔ میں نے کسی کو اپنا شریکِ غم بھی نہیں بنایا۔ میرے خدا نے میرے غم مٹا دیے۔ پاپا نے مجھے وہ خوشیاں دیں جن کا میں تصور بھی نہ کر سکتی۔ میں چاہتی تو وہ تمہیں بھی میرے دامن میں لا ڈالتے۔ لیکن مجھے ایک مکار اور دھوکے باز سے کیا لینا دینا تھا۔ میں نے زندگی کی راہیں خود استوار کیں۔ نارسائی کا غم اپنی روح سے نوچ کر دور پھینک دیا۔ میں نے انسانیت سے محبت کر لی۔ علم کو مقصدِ حیات سمجھ لیا۔ دوسروں کے کام آنا اپنے پاپا سے سیکھا۔ اور تب میری زندگی کو قرار آ گیا۔ میں بہت خوش ہوں، بہت مطمئن ہوں۔ میرا بیٹا میری دولت ہے۔ مجھے اس کے کردار اور اس کی شخصیت پر فخر بھی ہے اور بہت ساری امیدیں بھی ہیں۔ کیا تمہیں اس کی ضرورت ہے؟ کیا تم اسے مجھ سے لینا چاہتے ہو۔ میرا بیٹا ایک ہیرا ہے اور تم اس ہیرے کی آب وتاب دیکھ کر دیوانے ہو گئے ہو۔۔۔ یہ خواب خواب ہی رہے گا۔"

آفاق بڑی دیر سے خاموش تھے۔ کہنے کو اگر کچھ تھا بھی تو کہنے کی جرأت نہ تھی۔ پھر بھی بولے۔

"میں تمہاری عظمت کے آگے سرنگوں ہوں شبنم۔ ہیرا تو تم تھیں جسے کانچ کا ٹوٹا ٹکڑا سمجھ کر میں آگے نکل گیا۔ وہ تمہاری ذات کا ایک حصہ ہے۔ میں تم دونوں کو اپنے دامن میں چھپانا چاہتا ہوں۔"

''ہونہہ، تمہارا سر سرنگوں رہے یا بلند۔ میرے زخم مجھے ہمیشہ کسک دیتے رہیں گے۔ ان زخموں کا مداوا تمہارے پاس نہیں آفاق احمد۔ میں تو تم سے چار باتیں کہنے کے بعد تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ میرے چھوٹے سے گلشن میں تمہارے بغیر بھی بڑی رونق ہے اور تم۔۔۔ میرا بیٹا مجھ سے نہیں چھین سکو گے۔'' جا جا کر یہ الفاظ کہتے ہی اس نے ایک بھرپور نظر آفاق احمد پر ڈالی اور پلٹ آئی۔

''شبنم۔۔۔ شبنم۔۔۔ رکو شبنم۔۔۔ بات سنو شبنم۔۔۔!'' وہ باہر تک اس کے پیچھے آئے۔ لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھی۔ اس سے بھی زیادہ تیزی سے گاڑی باہر نکالی اور ''رضا ہاؤس'' کی طرف چلی گئی۔

اُس نے گاڑی کا انجن بھی بند نہیں کیا۔ سیدھی محسن رضا کی طرف گئی۔ اور ان کے بوڑھے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی، دریا بہا دیے۔

محسن رضا کو اس گرویہ وزاری پر صرف ایک پریشانی تھی کہ ایسی نازک صورت حال میں یہ رونا دھونا اس کے لیے مضر تھا۔

''پاپا۔۔۔! آپ نے زندگی بھر میری خوشیوں کا خیال رکھا۔ میرے اچھے پاپا۔۔۔! آپ اب بھی ایسا کوئی فیصلہ مجھ پر لاگو نہ کیجیے گا جو مجھے شکستہ کر دے۔ میں اپنے مقام پر بہت مطمئن بہت خوش ہوں۔ میں نہ خود کہیں جاؤں گی نہ حسن مجھ سے جدا ہوگا۔''

محسن رضا نے اس کی جلتی آنکھوں پر پیار کی مرہم رکھی۔ اس کی پیشانی چومی۔

''تم یادگارِ محبت ہو شبنم۔ بس اتنا یاد رکھو۔''

❁❁❁❁

''حسن بھائی۔۔۔!'' رابیل اداس سی بھائی کے پاس بیٹھی تھی۔ انیل اس مسئلے کا حل سوچنے میں ناکام تھی۔

''حسن بھائی۔۔۔'' اس نے دوبارہ پکارا۔ وہ اس کے شانے پر سر رکھے آنسو بہانے لگی۔

''آپی کو منالیں نا حسن بھائی۔ اس گھر سے خوشیاں روٹھ گئی ہیں۔ ڈیڈی تو اُس وقت سے اب تک کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے۔''

''میری بہنا۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ یہ معاملہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

''دیکھیے نا حسن بھائی۔ یہ اقدام ہم سب کو خوشیاں ہی دے گا۔ کوئی عورت سہاگ میں تقسیم برداشت نہیں کرتی۔ ممی نے تو زندگی بھر کسی پریشانی کا منہ نہیں دیکھا۔ ان کے لیے یہ انکشاف موت سے بھی بھیانک تھا کہ ڈیڈی اس دنیا میں ان کے علاوہ بھی کسی کے تھے۔ لیکن وہ بہ خوشی سب کچھ آپی کو دینے کے لیے تیار ہیں۔ اس گھر میں ان کا اونچا مقام ہوگا۔ اس گھر کی ملکہ ہوں گی وہ۔ ہم سب زندگی بھر ان سے پوجا کی حد تک پیار کریں گے۔ ان کی عظمت کے اعتراف میں سرنگوں رہیں گے۔ بس ہمیں ایک پیارا سا بھائی چاہیے۔ جسے ہم علی الاعلان بھائی کہہ سکیں۔ آپ نہیں جانتے حسن بھائی۔۔۔ یہ کتنی بڑی محرومی ہے۔ بھائی بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں میں اور انیل اُن سے ہاتھ پھیلا کر یہ بھیک مانگ لیں گے۔ کیا وہ ہمیں خالی ہاتھ لوٹا دیں گی۔ دیکھیے نا حسن بھائی۔ قصور تو ڈیڈی کا ہے ہمارا کیا جرم ہے؟''

حسن نے اس کے آنسو پونچھے وہ اس سے لپٹ گئی۔
''ارے پگلی۔۔۔ میں تمہارا بھیا ہی ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے آؤ ہم مل کر ساری دنیا کو بتا دیتے ہیں۔''
وہ چیخ کر رونے لگی۔ انیل خاموش بیٹھی تھی۔
''کیوں نیلی ٹھیک ہے نا۔'' حسن نے ایک ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے سے قریب کر لیا۔
''نہیں بھیا۔۔۔! جب تک آپ اس گھر میں آباد نہ ہوں جب تک آپ کی دلہن اس گھر میں نہ اُترے۔ تب تک ہمیں یقین نہیں آسکتا۔ لڑکیاں خوشی خوشی اپنے بھائیوں کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں۔ اُن سے لاڈ کرتی تھیں تو مجھے رشک آتا تھا۔ جب خدا نے ہمیں یہ خوشی بخشی ہے تو آپی ہمیں یہ خوشی کیوں نہیں دیتیں۔ کیوں نہیں دیتیں۔''
وہ بھی چھوٹے بچوں کی طرح رو پڑی۔ حسن اس محبت پر فدا ہوا جا رہا تھا۔
''ممی۔۔۔ ممی۔۔۔!''
اس نے شہر بانو کو پکارا۔ وہ خاموشی سی وہاں آگئی۔
''ممی ان چڑیلوں کو چپ کرائیے۔ یہ رو رو کر مجھے رُلانے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' اس نے ماحول میں تبدیلی لانے کو کہا۔
''حسن بیٹے! میں تمہارے ساتھ چل کر شبنم سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔''
''آپ فکر نہ کریں ممی۔ ہم سب مل کر آپی کو اٹھا کر یہاں لے آئیں گے۔ ٹھیک ہے نا رابیل۔ تم ابھی عائشہ کو فون کرو۔ پارٹی ذرا مضبوط ہونی چاہیے۔ تاکہ اغوا کے اس کیس میں کوئی ایف آئی آر درج کرنے سے قبل ہم سب کی معصومیت آڑے آجائے۔''
وہ یہ باتیں بہنوں کو بہلانے کی خاطر کر رہا تھا لیکن جانتا تھا۔ یہ سب بے حد مشکل تھا۔ اس کا ذہن کوئی حل تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ اچانک اس کے ذہن میں شیر دل کا خیال آیا۔ شبنم محسن رضا کے بعد شیر دل سے زیادہ کسی کا احترام نہیں کرتی تھی۔
اس نے چونک کر اپنے اردگرد دیکھا۔
''اوہ مائی سینگر سسٹر زاے ون آئیڈیا آگیا میرے ذہن میں۔ بھئی اب اپنا مسئلہ حل ہی سمجھو۔ ابھی عائشہ کو فون نہ کرنا۔ میں جا رہا ہوں۔ فون پر تم سے بات کروں گا۔''
اس نے اسی وقت شیر دل کو فون کرنے کی ٹھانی۔
رات کے کھانے پر شبنم کے سوا سب موجود تھے۔ سب کے ذہن میں یہ حالات تھے۔ اس کی الجھنیں تھیں اور ہر ذہن حل سوچنے میں لگا تھا۔
شیر دل نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ میز پر بیٹھے لوگوں کا تبصرہ بھی نہیں سنا۔ اُن میں عائشہ بھی تھی۔ برجیس خانم اور اکبر خان بھی۔
جو شبنم کو سمجھانے آئے تھے۔ لیکن محسن رضا نے سب کو شبنم سے بات کرنے سے منع کر دیا تھا۔ یہ ذہنی بحران جذباتی کشمکش پہلے ہی اس کے لیے نقصان دہ تھی۔
کھانے کے بعد سب لوگ ڈرائنگ روم میں تھے۔ تب شیر دل، شبنم کے کمرے میں آگئے۔

چہرے پر ایک خود پیدا کردہ شگفتگی کا تاثر لیے۔
شبنم تکیے کا سہارا لیے بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔
شیر دل بلا کسی اجازت اندر داخل ہوئے اور اس کے قریب جا کر رک گئے۔ شبنم انہیں دیکھ کر بیڈ سے اتری اور سامنے کھڑی ہو گئی۔
''کیا حال ہے شبنم؟'' ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔
''یہ حال نیا تو نہیں۔ کافی پرانا ہے۔ کہتے ہیں بات دل میں رہے تو اپنی، دوسرے تک جائے تو پرائی۔ شیر دل! یہ درد میرا تھا آپ پر آشکارا ہوا تو آپ نے اسے پورے جہان میں عام کر دیا۔''
''تمہاری جان ہم سب کو عزیز ہے شبنم۔''
''یہی تو میری زندگی کی سب سے خوب صورت بات رہی ہے۔''
''اچھا۔'' وہ دھیرے سے ہنسے۔
''بیٹھ جاؤ شبنم۔۔۔! گو میں جانتا ہوں کہ تم دینے کی قائل نہیں لیکن میں تم سے مانگنے آیا ہوں۔ بیٹھو اور تسلی سے سوچ کر مجھے جواب دو۔'' اس کے بیٹھنے پر انہوں نے بھی کرسی سنبھال لی۔
''شیر دل۔۔۔! مجھے مضبوط عمارتیں پسند ہیں گہری بنیادوں والی۔ کہ ایک بار بنا دو تو صدیوں اُن کی فکر سے محفوظ رہو پر جانے کیوں مجھے ہی ہر لحہ تخریب اور تعمیر کے عمل سے دوچار ہونا پڑا۔ اب مجھ میں نہ تخریب برداشت کرنے کا حوصلہ ہے نہ تعمیر کی جرات۔۔ میں اپنے آشیانے میں بڑی محفوظ و مامون ہوں۔ آپ مجھے کہاں بھیجنا چاہتے ہیں۔''
''تم اسی دن کی طرح آج بھی ضدی ہی ہو۔ اپنی منوانا جانتی ہو۔ کسی کی سنتی نہیں ہو ماننا تو دور کی بات۔'' شیر دل نے شکوہ کیا۔
''شیر دل۔۔۔! شیر دل۔۔۔! پلیز۔۔۔ میری بات تو سنیں۔''
''میں نے جب عمر بھر تمہاری مانی ہے، سننے سے انکار کی جرأت کر سکتا ہوں۔''
''شیر دل طنز نہیں کریں۔ خدا کی قسم اگر آپ ہی مجھے اس دنیا میں نہیں سمجھ سکے تو۔۔۔'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔
''یہ سچ ہے کہ میں تمہیں سمجھ نہ سکا۔ جس کی محبت میں تم نے چھبیس برس سہولت سے کاٹ دیے۔ وہ ملا تو تم اس کے وجود سے، اس کی محبت سے انکاری ہو گئیں۔ آخر کیا ہو تم۔ کیا چاہتی ہو۔ کیا تمہیں لوگوں کو صرف امتحان میں ڈالنا آتا ہے۔''
''سچ تو یہ بھی ہے شیر دل۔ اپنے آپ کو میں خود بھی نہ سمجھ سکی۔ جب سوچتی ہوں کہ میرے سنگ صرف آفاق کی دھوکا بازی اور لٹ جانے کا خیال تھا۔ میں ثابت و سالم کس طرح رہ گئی۔ آخر انسان ہی تھی نا اتنی مضبوط کیسے ہو گئی۔ شیر دل آپ کو یاد ہے ایک بار آپ نے کہا تھا زندگی کا زاد راہ محبت ہوتی ہے۔ ابھی میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ میں نے زندگی کا سفر کس شے کے سہارے یوں سہولت سے کاٹ لیا۔ ابھی ابھی میرے ذہن نے مجھے سمجھایا کہ وہ آپ کی محبت ہی تھی۔ جس نے پہاڑوں جیسے حوصلے مجھے بخش دیے۔

محبت کے بغیر دل کی بستیاں ویران گزرگاہیں بن جاتی ہیں۔ میری بستی آفاق نے تاخت وتاراج کردی تھی۔ لیکن آپ کی محبت نے اسے گل وگلزار بنا دیا۔ محبت مل جائے تو انسان خود کو بڑا محفوظ ومعتبر جاننے لگتا ہے۔ میں بھی زندگی بھر اپنے آپ کو معتبر لگتی رہی۔

اپنی ہستی پر مجھے ناز رہا۔ یہ سارا اعجاز اسی محبت کا ہے۔ جو آپ نے میرے دامن میں بلا حساب ڈال دی۔ میں بہت خوش نصیب بھی ہوں اور بدنصیب بھی۔ کاش حالات یوں ہوتے کہ وفا کا پہلا رشتہ میں آپ کے سنگ ہی جوڑتی۔ پر آپ میرا نصیب نہ تھے۔ آپ بہت اونچے مقام پر تھے۔ میری بدنصیبی آپ تک کیسے پہنچتی۔

شیر دل۔۔۔! آپ کی کرم کی نظر ستم ہائے گوناگوں پر بھاری رہی۔ شکست وریخت کے عمل پر میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ لیکن اب کسی نئی تبدیلی کی جرأت مجھ میں نہیں۔ میں بھولی ہوئی داستان کس کس کو سناؤں گی۔ کسے بتاؤں گی۔ دنیا نے بہت مشکل سے مجھے محسن رضا کی بیٹی مانا ہے۔ اب اتنی دیر آفاق احمد کی بیوی کہلانے میں لگ جائے۔

میری زندگی شاید مجھے اتنی مہلت نہ دے۔ یہ سارے درد میرے لیے ریاض کا محل کے جس بڑے آدمی کی ایک ضد اور ہٹ دھرمی نے چنے۔ میں مدت ہوئی اس کے بیٹے سے اپنے روحانی ناتے توڑ چکی ہوں۔'' وہ رکی اور پھر بولی۔

''مجھے اپنے اقرار کا پھول آپ کے حوالے کرنے کا ارمان تھا۔۔۔ چند آنسو آپ کے کندھے پر سر رکھ کر بہانے کا شوق تھا۔ شیر دل۔۔۔! اُس محبت اور احترام کی قسم جو میرے دل میں ہے۔''

''تمہیں بھی اس محبت کی قسم شبنم! جو تمہارا زادِ راہ رہی۔۔۔ تم نے زندگی میں مجھے کچھ نہیں دیا۔ میری محبت کو اطمینان دے دو۔

مجھے اپنی ذات کے آگے سرخرو کردو۔ آفاق کا ہاتھ تھام لو۔ یہ میری خوشی ہے۔ یہ میری تمنا ہے۔ یہ میری آرزو ہے۔''

''آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ شیر دل آپ کہہ رہے ہیں۔''

''ہاں شبنم۔۔۔ یہ میں کہہ رہا ہوں۔ میں۔۔ شیر دل۔'' وہ اٹھ کر آگے بڑھے تو شبنم بھی کھڑی ہوگئی۔

اس نے بے تابی کے عالم میں شیر دل کے دونوں ہاتھ تھامے اپنا سر جھکا دیا۔ اپنے لب ان ہاتھوں پر رکھ دیے۔ گرم گرم آنسو شیر دل کے ہاتھوں میں جذب ہوگئے۔

''شیر دل۔۔۔ میرے عم زاد۔۔۔ میرے دوست۔۔۔ شبنم آپ کا یہ حکم ضرور مانے گی۔ آپ آفاق سے کہہ دیجیے۔ وہ جب چاہیں مجھے اور حسن کو لے جائیں۔''

ان کے ہاتھ تھامے کتنی دیر وہ ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ شیر دل کے چہرے پر کیا تھا وہ نہ جان سکی۔ اور شیر دل باہر نکل گئے۔

❁❁❁❁

یہ خوش خبری پورے گھر میں پھیلی۔ آفاق تک گئی۔ اکبر خان کے گھر تک پہنچی۔ بلکہ باقر پور تک بھی گئی۔ محسن رضا کے لیے امداد حسین اور اختر کو خوشیوں سے محروم رکھنا ایک ظلم تھا۔

عامر اور طاہر جو دو دن پہلے باقر پور گئے تھے۔ صبح دم اُن دونوں کو لے کر آ گئے۔ صبح محسن رضا، شبنم کے کمرے میں گئے۔ تو وہ ابھی بستر پر دراز تھی۔ سکون اس کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے وہ چپ چاپ پلٹ آئے۔

آفاق احمد نے رضا ہاؤس کی دہلیز عبور کی۔ سب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ اوروں کے ساتھ امداد حسین اور اختر سے بھی ملے۔ خوشیوں کا ایک ہجوم رضا ہاؤس میں اُتر آیا تھا۔ رابیل اور انیل، حسن کے ساتھ بیٹھی بلبلوں کی طرح چہک رہی تھیں۔ ہال میں سب جمع تھے۔ احسن رضا نے حسن کو مخاطب کیا۔

"بیٹے جاؤ اپنی آپی کو بلا لاؤ۔"

وہ اٹھا تو شیر دل نے اسے روک دیا۔

"بیٹے میں جاتا ہوں۔ رضی انکل آپ بھی آئیں۔"

شیر دل آگے بڑھے اور محسن رضا سے پہلے ہی اس کے کمرے تک پہنچے۔ دروازے پر کھڑے وہ اندر کی صورت حال کا جائزہ تصور کی نگاہ سے لیتے رہے۔

شبنم تیار ہو چکی ہوگی۔ اپنے وقار سمیت وہ ہال میں موجود تمام خواتین میں ممتاز نظر آئے گی۔ شیر دل کو اپنی محبت پر پیار آ گیا۔ انہوں نے آواز دی۔

"شبنم۔۔۔! شبنم۔۔۔!"

جواب نہ پا کر اندر آئے۔ وہ ہنوز بستر پر دراز تھی۔

وہ آگے بڑھے۔ یہ وقت انتظار کا نہ تھا۔ شبنم اتنی غیر ذمہ دار نہیں۔ اب تک محوِ خواب ہے۔

انہوں نے آہستگی سے کمبل ہٹایا۔ بند آنکھیں، بھنچے لب ان میں ایک سوگوار تبسم قید تھا۔ وہ گڑبڑا گئے۔

انہوں نے پھر آواز دی۔

"شبنم۔۔۔ شبنم۔۔۔"

شاید یہ پکار سن کر شبنم کی روح تڑپی ہو، لیکن یہ جسم جو شیر دل کے سامنے تھا حرکت سے قاصر تھا۔ جسم کے پنجرے میں قید، روح اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔

شیر دل نے ڈرتے ڈرتے اسے چھو کر دیکھا۔ شکست و ریخت کے نئے عمل کی پہلی ضرب ہی اُس کے لیے کافی رہی تھی۔

"شبنم۔۔۔ شبنم۔۔۔ شبنم۔۔۔"

دوری کا اندازہ کر کے اب جو انہوں نے پوری قوتوں سے اسے پکارا تو رضا ہاؤس کے در و دیوار گونج اٹھے۔

پل کی پل میں سب اُسی کے کمرے میں جمع تھے۔ شیر دل خالی نگاہیں وا کیے اس لمحے تک جا پہنچے جب انہوں نے اسے گاڑی کی زد میں آنے سے بچا لیا تھا۔ انہیں لگا وہ ابھی عمر کی اسی گھڑی سے ہی نبرد آزما تھے۔ درمیان کے لمحے تو آئے ہی نہیں تھے۔ اور شبنم موت سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ وہ اسے نہ بچا سکے تھے۔

''رضا ہاؤس'' کے سوگوار ماحول میں آفاق احمد سر جھکائے بیٹھے تعزیت کرنے والوں پر یہ بھی واضح نہ کر سکے کہ وہ کون تھی؟''

جو مرتے مرتے انہیں زبردست شکست دے گئی تھی۔ ساری زیادتیاں اُن کے کھاتے میں ڈال گئی تھی۔ عمر بھر کی محرومیوں کا بدلہ ایک جھٹکے میں چکا گئی تھی۔

وہ یوں خالی ہو گئے تھے کہ دل میں کوئی ارمان باقی نہ رہا تھا۔

شب کو جب سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ محسن رضا کے کمرے میں ان کے ساتھ آفاق اور شیر دل تھے۔ حسن اور عامر، طاہر تھے۔

''بیٹے تم جب چاہو حسن کو اپنے گھر لے جانا۔ یہ تمہاری امانت ہے۔'' آفاق فوراً بولے۔

''نہیں رضی انکل! حسن آپ کا بیٹا ہے۔ حسن صرف شبنم کا بیٹا ہے۔ یہ سدا آپ کے پاس رہے گا۔ میرے لیے کیا اتنا کافی نہیں کہ وہ میرا خون ہے۔ میری جائیداد کا وارث ہے۔ ایک مکمل انسان ہے۔ اور آپ کی سرپرستی میں ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جا کر شبنم پر کوئی ظلم نہیں کروں گا کہیں روزِ حساب ایک اور زیادتی میرے حساب میں نہ لکھی جائے۔''

''اگر یہ زیادتی ہوئی تو اس کا جواب یوم حساب میں دوں گا آفاق۔ آپ حسن کو لے جائیں۔ گو یہاں بھی حسن کے لیے بہت کچھ ہے۔ لیکن وہاں بہت سی معصوم محبتیں اسے اپنے دامن میں چھپانے کو بے قرار ہیں۔ میں شبنم کو سمجھتا ہوں آفاق۔ میری یہ زیادتی اس کی خوب صورت روح کے لیے تسکین کا سبب ہوگی۔''

شیر دل نے ٹھوس الفاظ میں کہہ دیا۔

آفاق کا چہرہ دمک اٹھا۔ محسن رضا نے تائید میں سر ہلایا۔

❁❁❁❁

اور کچھ دنوں بعد جب حسن اپنے خاندان کے ساتھ یہاں سے جانے کے لیے تیار تھا۔

شیر دل ورانڈے میں تنہا کھڑے سوچ رہے تھے۔

''محبت زادِ راہ ہو تو زندگی کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔ اور تم نے جو احساس مجھے بخشا شبنم، اس نے مجھے اپنی نظروں میں بے حد معتبر کر دیا۔ اسی اعتبار پر تو ایک فیصلہ میں نے تم پر لاگو کر دیا، دیکھنا، خفا نہ ہو جانا۔''

❁❁❁❁

اور رضا ہاؤس کے گیٹ سے باہر جاتے ہوئے آفاق سوچ رہے تھے۔ ''یہ سب بڑے آدمی ہیں۔''

تم نے سچ کہا تھا شبنم۔ یہ بڑے آدمی مجھے تہی داماں بھیج دیتے تو سچ مچ ان کی بڑائی میں فرق آجاتا۔ واقعی ان کے ظرف میں دنیا کو دینے کے لیے بہت کچھ اور اپنے پاس رکھنے کے لیے صرف خوب صورت احساس کی دولت ہے۔''

❁❁❁❁

صبح روشن

بیدار بخت! اگر کبھی تمہیں ان موٹی موٹی کتابوں سے فرصت ملے تو اپنے اطراف بھی دیکھ لینا۔''

''کیا دیکھوں؟ ایسی کون سی نئی بات ہے۔ ہر دم چاروں اطراف دیکھا ہی کرتا ہوں۔''

''یار وہ مائرہ سید۔''

''کون ہے یہ؟''

''اپنی نئی کلاس فیلو۔ خدا کی قسم ایک دم حسین۔ یونیورسٹی کی سب لڑکیوں کو مات دے ڈالی ہے اس نے۔''

''تو ٹھیک ہے میری طرف سے مکمل اجازت ہے۔ روز وشب جلوہ دیکھتے رہو۔ موج اڑاؤ۔''

''اوہو یار! میں نے تو ایک بات کہی تھی اور تم نے ڈائریکٹ میری ذات کو ملوث کر دیا۔''

''تم بھی تو ذکر اسی انداز میں کر رہے تھے گویا۔'' بیدار بخت نے کتاب بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیے۔

دونوں لاؤنج میں چلے آئے۔ جہاں ذیشان کی اطلاع کے مطابق کافی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ مائرہ سید بھی موجود تھی۔

دونوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر لڑکیاں چونکی ہو کر خاموش ہو گئیں۔

ان سب میں بیشتر لڑکیاں بیدار بخت سے خاصی بے تکلف تھیں۔ ہیلو ہائے کے بعد بیدار بخت نے اروناسے پوچھا۔

''گڈ گرل! سنا ہے آپ لوگوں کی تعداد کچھ بڑھ گئی ہے۔ ایک اچھی چیز کا اضافہ ان دنوں ہوا ہے۔''

''تو آپ کہاں تھے بیدار بخت؟'' لڑکیاں ان کی ذہانت اور قابلیت کے سبب ان کا بے حد احترام کرتی تھیں۔

''میں کوہاٹ گیا تھا۔ پاپا نے بھیجا تھا کسی ضروری کام سے آج آتے ہی یہ خبر ملی۔'' بیدار بخت نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی آخر ایک نیا چہرہ نظروں کی زد میں آ ہی گیا۔

سیاہ شلوار قمیص میں، سیاہ دوپٹے کے ہالے میں چمکتا وہ چہرہ واقعی بے حد پرکشش تھا۔

''آپ نے ٹھیک سنا یہ مائرہ سید ہیں۔ ملتان سے مائیگریٹ ہو کے آئی ہیں۔ اور مائرہ سید یہ ہمارے ڈپارٹمنٹ کے ذہین ترین بندے بیدار بخت ہوتے ہیں۔ کل یہ نہیں تھے تو مانو ڈپارٹمنٹ میں علم و ادب کی روشنی ذرا کم ہی تھی۔'' سب نے کورس میں قہقہہ لگایا۔

''دو چار کلمات ہمارے یار کی شان میں بھی مس طل ہما؟'' بیدار بخت نے ذیشان بخاری کی طرف اشارہ کیا۔

''ان کی تعریف میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ آج صرف آپ کے بارے میں۔'' فاخرہ درانی نے اظہار خیال مناسب سمجھا۔

''نہیں مس فاخرہ! میں چاہتا ہوں کہ مائرہ صاحبہ میرے حصے کے ہمدردیاں اور کلاس فیلو ہونے کی حیثیت سے کچھ اچھے جذبے جو میرے لیے محسوس کریں وہ بھی ان ذیشان بخاری صاحب کو ہی دے دیں۔''

''آپ ان کی وکالت کرنے آئے ہیں یا مائرہ سید سے متعارف ہونے؟''

''محترمہ! اطلاعاً عرض ہے۔ میں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ یہ صاحب کل شام مجھے ملے تھے اس وقت سے اب تک میں انہیں اتنا ہی پریشان پا رہا ہوں۔ میں تو بس یہی دیکھنے آیا تھا کہ آخر وہ چیز کیا ہے جس نے میرے اتنے صابر دوست کو بے صبر بنا ڈالا۔ اور وہ مجھے یہاں کھینچ لایا۔''

ذیشان بخاری نے حیران ہو کر بیدار بخت کی طرف دیکھا۔ ہمیشہ کے خاموش طبع اور سنجیدہ مزاج بیدار بخت کو کیا ہو گیا تھا جو وہ اتنی بلاؤں کی موجودگی میں اس کی بے عزتی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

مائرہ سید کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ وہ بھی پریشان کھڑی تھی۔ بلکہ ذیشان تو ڈر رہا تھا کہ مائرہ اتنے صاف الفاظ میں یہ سب باتیں سن کر ابھی اُن کی توہین ہی نہ کر دے۔

''مس مائرہ! ان کی صاف گوئی آپ کو پریشان کر دے گی لیکن میں معذرت بھی نہیں کروں گا ایک کلاس فیلو ہونے کے ناتے مجھے یہ اشتیاق ضرور تھا کہ بیدار بخت آپ کو دیکھیں، آپ سے ملیں اور یہ اپنی دانست میں آپ پر جانے کیا واضح کرنا چاہ رہے ہیں۔''

اب وہ بڑے دھیمے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ یوں جیسے اس نے کوئی بات سنی ہی نہ ہو۔ کوئی نوٹس لیا ہی نہ ہو۔

''یہ تو آپ سب کی خوش اخلاقی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ میں دو تین دن میں آپ کے ماحول میں ایڈجسٹ ہو گئی ہوں۔ آپ کو یا ان کو مجھ سے ملنے کا شوق تھا تو بے جا نہیں، آخر ہم سب کو اچھے دوستوں کی حیثیت سے ڈیڑھ دو سال اکٹھے گزارنے میں زیادہ ہی لطف آئے گا۔''

بیدار بخت لاجواب ہو گئے۔ ذیشان نے معنی خیز انداز میں مائرہ کی طرف دیکھا تو بیدار بخت اور بھی جل گئے۔ اور سب نے کورس میں قہقہہ لگایا۔ یہاں تک کہ وہ مائرہ سید بھی بے اختیار ہنسے جا رہی تھی۔ بیدار بخت ایک ایک کا منہ دیکھتے ہوئے خاصے ہونق لگ رہے تھے۔

''بیدار جی! فرسٹ ایئر فول ہوا کرتے ہیں۔ آپ کو ذیشان نے لاسٹ ایئر فول بنا ڈالا۔ یہ مائرہ سیدان ذیشان بخاری صاحب کی فرسٹ کزن ہیں۔''

بیدار بخت نے فوراً ذیشان کی طرف دیکھا۔ نگاہوں میں غصہ خشونت اور شکوہ ہی شکوہ بھرا تھا۔

''اچھا بچو! اپنی توہین کا بدلہ سرِ بازار تم سے نہ لیا تو تم کیا یاد کرو گے۔ مائرہ صاحبہ اگر میں نے لاعلمی میں کچھ غلط الفاظ کہہ ڈالے ہوں تو معذرت خواہ ہوں۔ ذیشان جیسے نالائق دوست کی کزن میرے لیے بہن سے کم نہیں۔''

''نیور مائنڈ۔ آپ نے کہا ہی کیا ہے۔ اگر یہ میرے بارے میں کل سے پریشان و ہراساں تھے تو کچھ غلط نہیں۔ ایک منگیتر ہونے کے ناتے یہ ان کا فرض بنتا تھا۔''

مائرہ مسکراتے ہوئے بڑی معصومیت اور پیار کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ چہرے پر کسی قسم کی جھجک اور تکلف کا شائبہ تک نہ تھا۔

اب تو بیدار بخت نے کسی رعایت کے بغیر ایک زوردار ہاتھ ذیشان کو رسید کر دیا۔

''اوہ یونان سینس۔ اگر میں۔۔۔''

''کیا؟'' ذیشان نے ہنستے ہوئے بات کاٹ دی۔

''یہاں نہیں، اُدھر میرے ساتھ چلو پوچھتا ہوں؟'' وہ اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لے گئے۔

''کیا تک تھی مجھے بے وقوف بنانے کی؟''

''سر! میں آپ کی آزمائش کر رہا تھا کہ جناب کتنے پانی میں ہیں۔ آپ کو بھی دعوا ہے نا پارسا ہونے کا۔ اور یہ کہ اپنی مستقبل کی شریکِ سفر سے آپ کی ملاقات اس انداز میں کرانا ہی مجھے اچھا لگا۔''

❁❁❁❁

سیلوس ہوٹل کے ہال میں داخل ہوتے ہی بیدار بخت کی نظر سامنے کی میز پر پڑی۔ جہاں ایک خوبرو جوڑا مصروفِ گفتگو تھا۔ مائرہ اور ذیشان ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ تینوں نے ان کے بالکل قریب ایک میز سنبھال لی۔

ذیشان نے مائرہ کی آمد کی خوشی میں لنچ پر بیدار بخت کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ مائرہ چند دنوں میں بیدار بخت سے یوں گھل مل گئی تھی گویا جنم جنم سے ہی وہ ان کے قریب تھی۔

آرسی کی ٹھنڈی یخ بوتل سے سپ لیتے ہوئے بیدار بخت نے بوتل میز پر رکھی اور پھر سامنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''منصور خان پلیز، تم کچھ کرو نا۔ پاپا کو آخر اعتراض کیا ہے کیا یونیورسٹی میں جا کر میرا ذہن میرا دل و دماغ ہی بدل جائے گا۔ منصور خدا کے لیے۔ میں گھر کی خاموشیوں کی نذر ہو گئی تو ایک دن چپ چاپ مر جاؤں گی۔ دیکھو میں تم سب لوگوں کا سوشل بائیکاٹ کر دوں گی۔ بھوک ہڑتال کروں گی اور مر جاؤں

گی۔'' لڑکی کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ جن سے ہیرے کی طرح چمکتی صاف شفاف آنکھوں میں اور بھی چمک آ گئی تھی۔

''خاک بھوک ہڑتال کرو گی صرف میری جیب کا صفایا کرنے کا بہانا ہے یہ۔ چوروں کی طرح میرے ساتھ آ کر مہنگے ہوٹلوں میں لنچ اور ڈنر اڑایا کرو گی۔''

''نہیں خدا کی قسم مکمل بھوک ہڑتال ہو گی۔ جب میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاؤں گی تو پاپا کو خود ہی ترس آئے گا۔''

''خیر۔ اتنا بڑا بول نہ بولو۔ کون کافر تمہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بننے دے گا۔ تم سے پہلے ہم مر جائیں گے آس۔ تم ہی تو ہماری زندگی کی واحد آس ہو۔''

بیدار بخت اس خوب صورت جوڑے کو دیکھ کر حیران تھے۔ لیکن اُن کے کانوں تک پہنچنے والی گفتگو اور بھی پریشان کن تھی۔

''منصور خان! کیا آپ پر ہوٹل کے ماحول کا اثر ہو رہا ہے۔ آپ کی گفتگو جس انداز کی ہے لوگ مغالطے میں پڑ سکتے ہیں۔'' وہ سنجیدہ ہو رہی تھی۔ بیدار بخت مزید تجسس کا شکار ہو رہے تھے۔

''سسٹر! ایسی ویسی جیسی کوئی بات بھی ہو بس آپ سے ہی کر سکتے ہیں۔ باقی تو ہر بات پر پاپا نے مارشل لاء آرٹیکل فور کے تحت پابندی لگا رکھی ہے۔ جانے کہاں ہو گی وہ مہ جبیں غنچہ دہن سیمیں بدن جو ہمارے لیے ہے۔ لگتا ہے مقدر میں کنوارے ہی مر جانا لکھا ہے۔''

''خیر گولی ماریے اس موضوع کو۔ فی الحال تو یہی پرابلم ہے یونیورسٹی میں داخلے کا۔ منصور خان! آپ انکل احسان سے بات کریں ناشاید وہ پاپا کو راضی کر لیں۔''

''گڈ گرل! تم یہ مسئلہ سنجیدگی سے لیے بیٹھی ہو۔ منٹوں میں سارا مسئلہ حل ہو جائے گا بس تم مسکراتی اچھی لگتی ہو۔ اس جہان میں تمہارے سوا میرے لیے تو کوئی خوشی ہے ہی نہیں۔''

اب بیدار بخت کے ساتھ ساتھ مائرہ اور ذیشان بخاری بھی متوجہ ہوئے۔ ایسا کون سا مسئلہ تھا جو ہوٹل میں آ کر حل کر رہے تھے وہ لوگ۔

ویٹر کھانے لے آیا تھا۔ اور وہ دونوں گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ کھانا بھی کھا رہے تھے۔ اب آوازیں کافی آہستہ تھیں۔ بیدار بخت بھی کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن ہوٹل سے نکلتے وقت اچانک ہی پھر وہ دونوں پارکنگ سے ہنڈا نکالتے ہوئے اُن کی نظروں کی زد میں آ گئے۔

خاصی طرح دار لڑکی تھی وہ۔ لائٹ پنک کلر کے شلوار سوٹ میں گلاب کی تازہ تازہ مہکی مہکی کلی لگ رہی تھی۔ ہیرے جیسی چمکتی آنکھوں میں اب اطمینان وسکون کی جھلک تھی۔ اور ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ منصور خان کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے ایک اچٹتی سی نگاہ اُس نے بیدار بخت پر ڈالی تو وہ گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ مائرہ اور ذیشان محوِ گفتگو اُن کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ اُن کی توجہ اس طرف جا نہیں سکی۔

❁❁❁❁

''آس بی بی! خان صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' کل ہوٹل سے واپسی کے بعد سے لے کر اب

تک وہ اپنے کمرے میں بند تھی، مکمل احتجاج سمیت اور منصور خان تگ و دو میں مصروف تھے۔

''اُن سے کہہ دو۔ جب تک وہ اپنی بات پر قائم ہیں میں بھی کمرے میں بند ہوں۔'' اس نے بند دروازے سے جواب دے ڈالا۔

حیدر رحمٰن خان اُس کے پاپا دنیا میں موجود چند بہترین والدین میں سے ایک تھے۔ پہاڑ جیسی زندگی انہوں نے بغیر کسی ہمسفر کے صرف اپنے بچوں کی خاطر تنہا گزار دی تھی۔ جس کی خاطر انہوں نے خاندان قبیلہ چھوڑا۔ وہ چار بچوں کو جنم دے کر خالقِ کل کے پاس لوٹ گئی۔ اور وہ بھری دنیا میں ان چار بچوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہا رہ گئے۔

نازیہ اور آسیہ دو بیٹیاں تھیں اور منصور اور مسرور دو بیٹے تھے۔ نازیہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ جونہی وہ باشعور ہوئی گھر کی ذمہ داری آپ ہی آپ اس نے اپنے نازک کندھوں پر اُٹھالی۔ مسرور نازیہ سے چھوٹے تھے۔ پاپا نے انہیں بزنس ایڈمنسٹریشن کرا کے کاروبار اُن کے حوالے کر دیا اور خود مکمل طور پر گھر کے ہو رہے۔ منصور نے شوق کے تحت آرمی جوائن کر لی۔ انہیں کیپٹن ہوئے چند دن گزرے تھے۔ مسرور حیدر کو تجارتی دھندوں میں پھنس کر گھر کی خبر بھی نہ رہی تھی۔ منصور حیدر صرف آسیہ کی خاطر چھٹی لے کر گھر آئے تھے تاکہ اُسے پاپا سے یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت دلوا سکیں۔ پاپا اُن کے لیے بے حد درجہ شفیق و مہربان تھے۔ لیکن ایک معاملے میں بے حد سخت مزاج تھے اور وہ تھا یہی معاملہ لوگوں سے گھل مل جانے کا۔ مس گیدرنگ میں شریک ہونے کا اور آج کل آسیہ کو یونیورسٹی جانے کی اجازت دینے کا۔

آسیہ کو دکھ تھا کہ پاپا کو اس پر اعتماد نہیں ہے۔ وہ اس پر یقین نہیں رکھتے۔ اسے کمزور کردار کی لڑکی سمجھتے ہیں اور اس کے تحت کو ایجوکیشن میں پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ پاپا کوئی وجہ بتائے بغیر اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے اور منصور حیدر خان پاپا کے دوستوں سے مل کر انہیں قائل کرانے کی سوچ رہے تھے۔

''بی بی۔ دیکھو بی بی خان صاحب آپ کو کتنا چاہتے ہیں وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔ آپ انکار نہ کریں انہیں دُکھ ہوگا۔'' خانم، آسیہ کی بوڑھی آیا باہر دروازے پر کھڑی اُسے سمجھا رہی تھیں۔ لیکن وہ دروازہ لاک کیے اپنے کمرے میں بند تھی۔

منصور خان ابھی ابھی آفندی صاحب کے گھر گئے تھے۔ انہیں ساتھ لے کر لوٹے اور آتے ہی آفندی صاحب کو پاپا کے کمرے کی طرف چھوڑتے ہوئے اس کے کمرے میں آئے۔

آیا دروازے پر ہی تھیں۔ منصور تیزی سے دروازے کی طرف آئے۔

''خیر ہے نا آیا ماں! آسیہ کہاں ہے؟'' وہ گھبرا گئے۔

''خیر ہے بیٹے! خان صاحب بی بی کو بلا رہے تھے میں اُسے لینے آئی ہوں لیکن وہ دروازہ ہی نہیں کھول رہی۔''

''دروازہ ابھی کھل جائے گا آیا ماں۔ انکل آفندی زبردست قسم کی سفارش ہیں۔'' منصور خان نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''آس دروازہ کھولو۔ مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔''

چہیتے بھائی کی آواز آس کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ منصور خان نے پیار سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔

''سسٹر! اب ایسی بھی کیا ناراضی ہے، آیا ماں ہماری ماں کے برابر ہیں۔ تم ان کی بات تو سُن لیتیں۔''

''اوہ سوری منصور خان۔'' آس انہیں بھیا کہنے کے بجائے نام سے پکارتی تھی اور وہ بھی بڑے مان کے ساتھ۔ آیا ماں بھی اندر آ گئیں۔

''منصور خان! اب اگر پاپا نے اجازت دے بھی دی تو میں نہیں جاؤں گی۔''

''یہ کیا ہو گیا۔ دیکھو آس! کل دوپہر سے اب تک میں ایک منٹ کے لیے چین سے بیٹھ نہیں سکا اور تم اب یونیورسٹی جانے سے بھی انکار کرتی ہو۔ آخر کیوں؟''

''وہ اس لیے منصور خان کہ اعتماد کے سہارے دنیا کے سب کام دھندے استحکام پاتے ہیں اور چلتے ہیں۔ دل میں یہ احساس لے کر کہ پاپا نے دل سے نہیں کسی اور کے کہنے پر مجھے اجازت دی ہے میں نہیں جا سکتی۔''

''سسٹر! تم ابھی تک اصل وجہ نہیں جان سکیں۔ آیا ماں! آپ کو تو خبر ہے ہمارے المیے کی۔ آپ اسے کیوں نہیں بتاتیں۔''

آیا ماں نے بیڈ پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا سر اپنی آغوش میں رکھ لیا۔

''بیٹی! اتنا تو تم جانتی ہو نا کہ تمہارے پیدا ہونے سے قبل بلکہ اس وقت جب تمہارے پاپا کی شادی بھی نہ ہوئی تھی اپنے تایا کی بہو بن چکی تھیں۔ جبکہ اس وقت تمہارے تایا کے ہاں بھی کوئی بچہ نہ تھا۔ آج میں تمہیں تمہاری ایسی خاندانی باتیں بتاؤں گی جو اس سے قبل تمہارے علم میں نہیں تھیں۔ میں برسوں سے تمہارے خاندان سے وابستہ ہوں، تمہارے بابا جان میرے دودھ شریک بھائی بھی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ میرا اس قدر احترام کرتے ہیں، تمہارے دادا حضور کی صرف تین اولادیں تھیں، ایک تمہارے تایا جان، دوسری تمہاری پھوپھو اور تیسرے تمہارے بابا جان۔ تمہارے تایا جان نے مقابلے کا امتحان پاس کر لیا تو وہ ضلع کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے اور شادی سے قبل ہی اُن کے گھر سے دوری والدین کا نصیب بن گئی۔ تمہاری پھوپھو کا بیاہ اُن کے چچازاد بھائی سے ہو گیا۔ جب کہ تمہارے بابا جان اسی چچا کی بیٹی سے منسوب تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر گئے تو وہیں پڑھنے والی ایک ترک لڑکی انہیں پسند آ گئی۔ اور وہ جانے کن حالات میں وطن واپسی سے پہلے ہی خان صاحب نے اس سے شادی کر لی۔ گھر لوٹے تو اس امید میں تھے کہ والدین ان کی یہ خطا معاف کر دیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ تمہارے تایا اور بابا میں بے انتہا محبت تھی، دونوں نے عہد کر رکھا تھا کہ اپنی اولادوں کا بیاہ آپس میں کریں گے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ لیکن تمہارے بابا کے اس اقدام پر نہ صرف والدین بلکہ بڑے بھائی بھی اُن کے خلاف ہو گئے۔ ترک بیوی کو کسی نے رہائش گاہ میں قدم ہی نہ رکھنے دیا۔ پورے خاندان نے حیدر خان سے تعلقات منقطع کر لیے۔ دراصل تمہاری تائی کی بہن ہی تمہارے بابا کی منگیتر تھی ادھر تمہاری پھوپھو

اسی گھر کی بہو تھی۔ اُن لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ اگر تمہارے دادا نے اپنے بیٹے کو گھر میں داخل ہونے اور رہائش رکھنے کی اجازت دے دی تو اسی وقت تمہاری پھوپھو کو طلاق دے دی جائے گی۔ بس ان باتوں کے سبب تمہارے بابا ہمیشہ کے لیے تمہاری مما کو لے کر اس گھر سے چلے آئے۔ مجھے حیدر خان ایک بھائی کی طرح عزیز تھے۔ اُن دنوں میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے شوہر سے کہہ دیا حیدر خان نہ صرف میرے مالک کے بیٹے ہیں بلکہ میرے بھائی بھی ہیں۔ میں نے پانچ سال کا عرصہ ان کے انتظار میں اس دہلیز پر گزارا ہے۔ اس کڑے وقت میں جبکہ ان کی بیوی حاملہ ہے انہیں میری ضرورت ہوگی۔ میں اُن کے ساتھ جاؤں گی۔ یوں میں اپنے ایک ماہ کے بچے اور شوہر کے ساتھ تمہارے بابا جان اور مما کے ساتھ چلی آئی اور عہدِ وفا نبھانے کی خاطر آج تک ان کے ساتھ ہوں۔

آسیہ بی بی! تمہارے ننھیال کے بارے میں تو مجھے کوئی علم نہیں لیکن تمہاری مما کے بارے میں تو میں جانتی ہوں۔ کئی دن ہم لوگ ہوٹل میں مقیم رہے۔ تمہارے بابا جان کے پاس انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری تھی۔ چند دن کی دوڑ دھوپ کے بعد انہیں دوسرے شہر میں نوکری مل گئی تو ہم سب لوگ ان کے ساتھ چلے آئے۔ تمہارے پاپا اور مما میں بے انتہا محبت تھی۔ دکھ سکھ میں ساتھ نبھانے کا وعدہ تھا۔ دونوں نے باخوبی نبھایا۔ نازیہ بی بی کے بعد مسرور پیدا ہوئے پھر منصور میاں اور پھر تم۔ تمہاری پیدائش کے کچھ عرصہ بعد تمہاری مما کچھ بیمار رہنے لگیں۔ پہلے پہل تو کسی نے بھی اس بیماری کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ لیکن جب وہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتے ہوئے ایک دم برسوں کی بیمار نظر آنے لگیں تو خان صاحب نے ان کے علاج میں دن رات ایک کر دیے جانے کیسا روگ تھا۔''

آپا ماں کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

''کہ جان لے کر ہی ٹلا۔ تمہارے پاپا نے تو اس صدمہ میں جوگ لے لیا۔ دیوانوں سے بھی بدتر ہو گئے۔ دو ماہ بستر علالت پر دراز رہے۔ کوئی بھی غم بٹانے والا نہ تھا۔ دوست احباب تھے یا میں اور میرا خاوند۔ تمہاری پرورش کا مکمل ذمہ گویا میں نے لے رکھا تھا۔ لیکن خان صاحب نے تمہیں ہر دم اپنے قریب رکھا۔ ایک طرح سے تم ان کے ہاتھوں ہی میں پلی بڑھیں۔ یہاں تک کہ نازیہ بی بی تمہیں سنبھالنے کے قابل ہو گئیں۔ تمہارے پاپا نے آسیہ بی بی! تم لوگوں کے کارن پورا جہان چھوڑ دیا۔ اور پھر گھر والوں سے جو تعلق ٹوٹا تھا کبھی نہ جڑ سکا۔ ایک دوسرے کی خبر ہی نہ رہی۔ لیکن خان صاحب کو یہ احساس شدت سے ہوا کہ فروزاں بی بی (تمہاری مما) اُن سے جدا ہوئی ہیں شاید اسی جرم کی سزا کے طور پر جوان سے والدین کے معاملے میں سرزد ہوا تھا۔ انہوں نے خاندانی روایات توڑی تھیں۔ زندگی بھر سکون نہ پا سکے۔ ایک بار لوٹ کر اپنے آبائی شہر بھی گئے جہاں اب کسی کا نام و نشان نہ تھا۔ تمہارے دادا نے ساری جائیداد تمہارے تایا کے نام کر دی تھی۔ اور تمہارے تایا آبائی گھر فروخت کر کے جانے کس شہر میں آباد ہو گئے تھے۔ اُن کی خبر آج تک نہ مل سکی۔ نہ ہی تمہاری پھوپھو پھر انہیں مل سکیں۔ خان صاحب نے عہد کر رکھا ہے کہ اپنے بچوں کی شادیاں صرف اپنے بھائی کے بچوں سے کریں گے۔ بس اسی خیال میں وہ روشن خیالی سے تنگ نظری کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ اسی خیال میں وہ آپ سب لوگوں پر پابندیاں عائد کرتے ہیں کہ نئے زمانے کے نئے طور طریقوں کے مطابق بلکہ پرانی فطرت انسانی کے مطابق کہیں کسی

کو پسند نہ کر بیٹھو اور اُن کا عہد ٹوٹ نہ جائے۔ صرف اسی خیال سے۔ یہ سب پابندیاں عائد ہیں تم لوگوں پر آسیہ بی بی! تم لڑکی ہو لڑکیوں پر کچھ اصول لاگو کیے جاتے ہیں لیکن مسرور میاں اور منصور میاں تو مرد ہیں اپنی فطرت میں بالکل آزاد لیکن تمہارے پاپا نے ان کو بھی پابند بنا رکھا ہے۔ مسرور میاں شادی کے قابل ہیں بلکہ منصور میاں بھی برسر روزگار ہیں لیکن شادی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ نازیہ بی بی اس سال پورے تیس برس کی ہو جائیں گی۔"

وہ پھر رونے لگیں۔

"خان صاحب تم سب لوگوں کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔ یہ میں سمجھتے ہوئے بھی نہیں سمجھ سکی۔ بی بی! تم اس بات کو بہت گہرائی میں لے رہی ہو۔ بات صرف اتنی سی ہے وہ تم سب لوگوں کو اپنے خاندان کی امانت سمجھتے ہیں اور بخوبی اُن کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔"

آسیہ نے جوہر کے ساتھ سب کچن سن رہی تھی جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ سخت دقیانوسیت ہے۔ اب چاہے ہماری پھپھو اور تایا کے ہاں ایک بھی بچہ نہ ہو ہم اُن کے منتظر بیٹھے رہیں۔ نہیں آیا ماں! ہم میں انتظار کی بلکہ اس فرسودہ خیال کو تقویت دینے اور پروان چڑھانے کی ہمت نہیں۔ ہم ان روایتوں کو توڑیں گے۔ ہم کسی کے پابند نہیں ہیں۔ ہم آزاد زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔"

حیدر خان کے انکار نے آسیہ کو از حد مشتعل کر رکھا تھا۔ کل تک اس کی آرزو تھی ایم۔اے میں ایڈمیشن لینے کی لیکن ابھی چند لمحے قبل اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی صورت بھی یونیورسٹی کی حدود میں قدم نہیں رکھے گی۔ چاہے حیدر خان اسے بھیجنے پر بہ دل و جان راضی ہوں۔

"بیٹی۔ میری اچھی بیٹا لڑکیاں ہر معاملے میں ماں باپ کی رائے مقدم سمجھتی ہیں۔ تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ منصور میاں آپ اسے سمجھائیں۔ خان صاحب نے آپ سب کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کے بدلے آپ اُن کا جس قدر احترام کریں فرماں برداری کریں کہ ان کا حق ہے۔"

"آیا ماں! ایک حد تک اس کی بات بھی درست ہے۔ اب ایسی بھی کیا پابندی۔ زندگی فٹ پاتھ کے کنارے کھلا ہوا پھول تو نہیں کہ ہر کوئی اسے توڑ کر لے جا سکتا ہے۔ پاپا کو ہم پر اعتماد کرنا چاہیے۔"

"وہ اعتماد کریں یا نہ کریں یہ ان کی ذات کا پرابلم ہے۔ میں یہ جان گئی ہوں کہ انہیں ہم سے کس قدر پیار ہے۔ آیا ماں! انہوں نے خود بے شک اپنی روایات سے بغاوت کی ہے لیکن ہمارے لیے وہی قید پسند کرتے ہیں۔"

"بیٹی انہیں شدت سے یہ احساس ہو گیا ہے کہ بغاوت کا انجام خطرناک اور تکلیف دہ ہے بس اسی خاطر۔ اس دوری کا ازالہ کرنے کے لیے وہ یہ فیصلہ کیے ہوئے ہیں اور ہر دم اپنے خاندان کی تلاش میں ہیں۔"

"اگر وہ مزید دس سال نہ مل سکیں تب؟" آسیہ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"خدا نہ کرے بچھڑے ایک نہ ایک دن مل جایا کرتے ہیں۔ تم دل چھوٹا نہ کرو بی بی۔ بزرگوں کا کہا ماننے میں بہتری ہوتی ہے۔"

منصور خاموشی سے ان کی گفتگو سُن رہے تھے۔ آسیہ نے انہیں مخاطب کیا۔

''بہر حال! منصور خان آپ پاپا سے کہہ دیجیے مجھے ان کا فیصلہ منظور ہے۔''

''آس! میری پیاری بہن دیکھنا انکل آفندی اُن سے منوا کے چھوڑیں گے۔ اب اگر تم ضد کرو گی نا تو انکل بھی خفا ہو جائیں گے اور تم جانتی ہو نا وہ ہمیں اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔'' منصور خان نے التجائیہ طریقے سے کہا۔

آسیہ خاموش رہ گئی۔ منصور خان اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ آیا ماں آفندی صاحب کی خاطر تواضع کا حکم دینے کچن کی طرف چلی گئیں۔ جو کافی دیر سے حیدر خان کے کمرے میں تھے۔ شام کے سائے رات میں بدلنے والے تھے۔ جب آفندی صاحب آسیہ کے کمرے کی طرف آئے۔

''آسیہ بیٹے! چند اتم اپنے پاپا کی بات مان لو۔ آج حیدر نے مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے اور مجھے تسلیم کرنا پڑا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے یا جو کچھ تم سے منوانا چاہتا ہے جس ڈگر پر تم لوگوں کو چلا رہا ہے وہ تم سب کے لیے بہتر ہے۔ میں جانتا ہوں اس کی یہ ضد کچھ کچھ بے جا ہے لیکن بہر حال وہ تمہارا باپ ہے آسیہ بیٹی۔ مجھ سے زیادہ، جہان میں بسنے والے ہر شخص سے زیادہ تمہاری بہتری سوچ سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے انکل میں اپنی خواہشوں پر بند باندھنا جانتی ہوں۔ آج کے بعد پاپا میرے لبوں پر ایسے کوئی الفاظ نہ دیکھیں گے۔'' آسیہ نے دھیرج سے جواب دیا اور خاموش ہو گئی۔

❁❁❁❁

دوسری دفعہ جب وہ نظر آئی تو نازیہ اور منصور خان بھی اس کے ساتھ تھے۔

''سسٹر! عجیب عجیب حرکتیں ہیں تمہاری۔ یار اب بھلا یہ بھی کوئی معمول ہے روزانہ اس پارک میں تمہاری خاطر تشریف لائی جائے۔ دل تو گھر کے لان میں بہل سکتا ہے جو رنگینی میں اس گراؤنڈ سے ہرگز کم نہیں۔''

''مگر منصور خان! میں ہر روز ایک جیسا ماحول اور ایک جیسے چہرے دیکھ کر اکتا چکی ہوں۔''

منصور ہنس پڑے۔

''اس کا مطلب ہے ہم تو خوامخواہ ہی تمہاری نظروں کے سامنے ہیں اور وہ بھی پورے بائیس برس سے، پہلے تو ہمیں روپوش ہونا چاہیے۔''

''اللہ منصور خان! آپ پہلے اپنی ذات کو درمیان میں لے آتے ہیں۔ میں نے تو بائی داوے ایک بات کی تھی۔ آپ لوگ ہی میری زندگی ہیں۔ آپ سے اکتا کر موت کے دامن میں پناہ ملے گی۔''

پاس سے گزرتے بیدار بخت نے چونک کر ان لوگوں کو دیکھا۔ آج انہیں دیکھ کر آسیہ کے چہرے پر شناسائی کے احساس نے ڈیرا جمایا۔

اُن کی آوازیں دور تک بیدار بخت کے ساتھ چلتی رہیں آج وہ آف وائٹ شلوار سوٹ میں دوپٹہ سلیقے سے شانوں پر پھیلائے روز سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ منصور خان کی موجودگی میں شاید اس کی آنکھوں کی انوکھی چمک اور بھی بڑھ جایا کرتی تھی۔ اعتماد اور مان ساتھ ساتھ جولہراتا تھا۔

''نازیہ آپا!'' آسیہ نے نازیہ کو مخاطب کیا۔
''آپ کو خبر ہے میں آپ کو یہاں کیوں لایا کرتی ہوں۔''
''نو۔'' نازیہ نے مختصر سا جواب دیا۔
''حیرت ہے بھئی، صرف اس لیے کہ آزاد فضاؤں میں اڑتے پنچھیوں کو دیکھ کر شاید آپ کے دل میں اڑنے کی خواہش پیدا ہو جائے۔ پاپا نے تو آپ کے پر کاٹ کر رکھ دیے ہیں۔ آپ کے دل سے امنگ اور آرزو نوچ کر پھینک دی ہے۔ پاپا کی مصلحتوں کا سب سے اہم شکار آپ ہیں۔ میں آپ کی زندگی کی روش بدلنا چاہتی ہوں۔''
''بی بی! تم مجھے بغاوت پر آمادہ کرنا چاہتی ہو تو۔۔۔ میں تو پاپا کے فیصلے پر بالکل مطمئن اور خوش ہوں۔''
آسیہ جانتی تھی کہ نازیہ آپا کتنے فیصد سچ بول رہی تھیں۔ جب دل میں محبتوں کے سدا بہار روگ گھر کر لیں تو آدمی کس حد تک خوش ہوتا ہے جب جدائی بھی مقدر رہو۔
''یہ دھوکا آپ اپنے اندر چھپی کمزور اور ڈرپوک سی لڑکی کو دے سکتی ہیں مجھے نہیں۔ نازیہ آپی! زمانہ آپ کی خوشی میں خوش ہو سکتا ہے دکھ میں دکھی کوئی بھی نہ ہوگا۔ آپ منزل پانے میں ذرا سی دیر بھی نہ کریں۔''
''بکواس نہیں کرو آسیہ! تم اتنی باغی کب سے ہو گئی ہو۔ نادان لڑکی! اس دنیا میں پاپا کے سوا اپنا اور ہے بھی کون۔ اگر ہم انہیں راضی نہ رکھ سکیں تو ہمیں جینے کا کوئی حق نہیں۔''
''ٹھیک ہے آپ خونِ جگر دے کر پاپا کا گلشن آباد کرتی رہیں ہم سے یہ نہ ہو سکے گا۔''
''کیا کرو گی تم؟'' منصور خان نے اس کی بات سن لی۔ آسیہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''کیا کروں گی۔ جب آپ لوگ ہی آپی کے لیے کچھ نہ کر سکے تو میں کیا کروں گی۔''
''آس سسٹر! دیکھو گھر کے ماحول سے اکتا کر یہاں آتے ہیں تو باتیں اچھی اچھی ہونی چاہئیں تم بور کرنے لگی ہو۔'' آسیہ نے فوراً بات کا موضوع بدل دیا۔ تینوں ایک بینچ پر بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔ بڑی دیر بعد تینوں اٹھے اور گاڑی کی طرف آنے لگے۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے منصور خان نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن چابی نہ پا کر پریشان ہو گئے۔ انہیں بتا کر الٹے قدموں چلے گئے۔ نازیہ اور آسیہ بھی اسی طرف چل پڑیں۔ پورے گراؤنڈ میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ خاصے متفکر تھے۔ تبھی آسیہ نے دیکھا وہ سامنے بیدار بخت کے پاس کھڑے تھے۔ جانے انہوں نے منصور خان کو کیا دیا تھا پھر ان کے ساتھ چل پڑے تھے۔ لمحوں بعد دونوں ان کے سامنے تھے۔
''بہت پریشان کرتی ہو تم آس، اب دیکھو جانے کہاں میں نے چابی گرا دی۔ ان کو اگر نہ ملتی تو آج خاصی پریشانی ہوتی۔''
آسیہ نے بیدار بخت کی طرف دیکھا جو منصور خان کے ساتھ کھڑے دھیرے دھیرے مسکرائے جا رہے تھے۔

''بیدار بخت خان یہ میری سسٹرز نازیہ آپی اور آسیہ ہیں۔ آسیہ ہم سب کی لاڈلی چھوٹی بہن ہے بس سمجھ لیں ہم سب کے جینے کی آس ہے۔''

''گڈ۔'' بیدار بخت نے مسکرا کر کہا۔

نازیہ آپی نے اُن کی طرف دیکھا اور پھر آسیہ کی طرف جو شرارتی انداز میں ان کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی۔

''کیا گھور رہی ہو سسٹر، ان کا شکریہ ادا کرو کہ چلتے چلتے راہ پڑی چابی انہوں نے اٹھالی اور ہم کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔''

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' آسیہ کے کہنے کا انداز قطعاً سنجیدہ نہ تھا۔

''تھینک یو۔'' اس نے دوسری مختصر بات سنی اور چل گئی۔

''میں پچھلے تین دن سے روزانہ آپ کو دیکھا کرتا ہوں۔''

''جی ہاں میں یونیورسٹی کیمپس ہوسٹل میں رہتا ہوں بس تنہائی سے بچنے کا سامان کرتے کرتے یہاں آجاتا ہوں۔ وہاں تو یار لوگ جان نہیں چھوڑتے۔ کچھ دنوں میں میری فیملی یہاں آنے والی ہے۔ پرابلم خود بخود حل ہو جائے گی۔ گھر تو یہاں پر موجود ہے لیکن ہوسٹل میں رہنا میرے لیے بہتر ہے۔'' منصور خان نے قہقہہ لگایا۔

''واہ صاحب! آپ گھر نہ ہونے کی وجہ سے یہاں آجایا کرتے ہیں اور ہم گھر سے اکتا کر یہاں آتے ہیں۔ کیسا تضاد ہے؟''

''گھر سے اکتا کر۔'' بیدار بخت حیران تھے۔

''بعض اوقات شیش محل قید خانے سے زیادہ تنگ و تاریک لگنے لگتے ہیں۔ تب انسان فرار کی راہیں تلاش کرتا ہے۔'' آسیہ نے جل کر کہا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کو ہمارے گھر میں آکر گھر کا سکون مل جائے۔ بیدار بخت! آپ کو دیکھ کر جانے کیوں ایک دم ڈھیر ساری اپنائیت کا احساس ہونے لگا ہے۔ نازیہ آپی کھانے بنانے میں، بھائیوں کو آرام پہنچانے میں بے حد ماہر ہیں۔ آپ کا دل ضرور بہل جائے گا۔'' منصور خان نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر بیدار بخت کی طرف بڑھایا۔

''یہ غریب خانے کا اتا پتا۔ تین دن میں یہیں پر ہوں آپ کا منتظر رہوں گا۔'' منصور خان نے ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔

''انتخاب تو ایک نظر میں ہو گیا۔ جب مل بیٹھیں گے تو ذات کے پرت کھول کر ایک دوسرے کو پہچان بھی سکیں گے۔ مجھے امید ہے آپ ضرور وقت نکال کر گھر آئیں گے۔ کیوں نازیہ آپی!'' منصور خان نے تصدیق چاہی۔

''آف کورس۔ منصور خان کی بہن بھی آپ کو اپنی منتظر ملے گی۔'' نازیہ نے خلوص سے کہا۔

''اور آپ۔'' بے اختیار بیدار بخت نے آسیہ سے پوچھ لیا۔

''میں۔۔۔ میں کسی کو پہلی نظر دیکھ کر رائے قائم کرنے کی عادی نہیں ہوں۔ آپ آئیں گے، ملیں

گے، تب میں یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہوسکوں گی کہ آپ کا انتظار کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔"

"بیدار بخت ہرگز مائنڈ نہ کیجیے گا۔ یہ آسیہ ہے ہی بس اس طرح۔"

❁❁❁❁

شام کو منصور خان بیدار بخت کے منتظر رہے لیکن وہ نہ آئے۔ صبح حسب معمول آسیہ گئی اور معمول کے مطابق بیدار بخت کو بھی وہیں پایا۔ وہ گاڑی سے اتر کر سیدھی ان کی طرف گئی۔

آسمانی رنگ کے سوٹ میں نکھرے نکھرے بیدار بخت مسکراتے چہرے سمیت آسیہ کے استقبال کو دو قدم آگے بڑھ آئے۔

"ہیلو آسیہ رحمٰن۔ وہ آپ کے پارٹنرز کیا ہوئے؟"

"وہ لوگ تو وقتی طور پر میرے ساتھ تھے۔ تنہا یہاں آنا تو میرا معمول ہے۔ آج کل منصور خان یہیں تھے میں کھینچ کھانچ کر انہیں ساتھ لے آتی۔ وہ نازیہ آپی۔ ان کی کیا پوچھیں گے انہیں تو بس دنیا میں لا کر ہی اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان عظیم کر دیا ہے۔"

"وہ کیوں؟ آپ تو سب سے ہی برہم نظر آتی ہیں۔"

"کیا پوچھیں گے آپ اور کیا بتاؤں میں آپ کو۔ وہ گھر بس ایک قید خانہ ہے لیکن نازیہ آپی بخوشی اس میں قید ہیں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" بیدار بخت اس کے ساتھ چل پڑے۔

"آپ۔۔۔ آپ سنجیدگی سے میرے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں نا۔" وہ بے یقین سی تھی۔

"آف کورس آسیہ رحمٰن میں تو اس دن سیلوس میں آپ کو زار و قطار روتا دیکھ کر سنجیدگی سے آپ کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔" بیدار بخت کے کہنے کا انداز تو جو تھا دیکھنے کا انداز کچھ اتنا عجیب اور نیا تھا کہ آسیہ ایک پل کو گھبرا کر رہ گئی۔

"سچ پوچھیے تو میں نے بڑے دن کیمپس میں آپ کی راہ دیکھی۔"

"میں نے تو وہ ارادہ بھی ترک کر دیا ہے۔ آپ۔۔ آپ یونیورسٹی میں۔۔۔" اُس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں ایم۔ اے کا امتحان دینے والا ہوں۔ ایم۔ اے سیاسیات۔" اچانک آسیہ کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔

"تب تو آپ شعبہ سیاسیات کے سر اظہر درانی کو ضرور جانتے ہوں گے۔"

"اُن کی لیاقت اور قابلیت کے پیش نظر انہیں وہاں کون نہیں جانتا مگر آپ کا ان سے کیا تعلق ہے۔" بیدار بخت کو ان لمحوں میں اپنے ایک جواں سال استاد کا ذکر قطعاً اچھا نہیں لگا تھا۔

"کیا میں آپ پر مکمل اعتماد کر لوں۔" صورت کی طرح سوال بھی معصوم سا تھا۔

کتاب بغل میں دبائے ہاتھ سینے پر باندھے، خوب صورت لبوں پر مسکراہٹ سجائے بغور اسے دیکھتے ہوئے بیدار بخت نے جواب دیا۔

"جی چاہے تو ضرور ایسا کریں۔"

آسیہ کتنی دیر انہیں دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”بیدار بخت صاحب! میں چاہتی ہوں دنیا مکمل صلح امن اور آشتی کا گھر ہو۔ انسان انسان کو بوجھ نہیں ایک دوسرے کی ضرورت سمجھیں۔ کسی آنکھ میں دکھ کا آنسو نہ ہو کوئی دل ناشاد نہ ہو۔ میں چاہتی ہوں میرے حصے کی خوشیاں بھی میرے پیاروں کو مل جائیں۔“ بیدار بخت کو آسیہ کی سیدھی سیدھی باتیں بھی الجھی ہوئی لگیں۔ پھر بھی جی چاہا۔ ایک دم کہہ ڈالیں۔

”ٹھیک ہے آسیہ رحمٰن! تم اپنی ساری خوشیاں بے شک لوگوں میں بانٹ دو، یہ بندہ بیدار بخت جسے تمہاری آنکھوں کی چمک میں منزل کا راستہ نظر آ گیا ہے اپنے حصے کی ساری خوشیاں تمہارے نام کر دے گا۔“

”میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ یقین جانیے آپ کے کام آ کر مجھے بے حد خوشی ہوگی۔“ آسیہ نے ان کی آنکھوں میں لمحہ بھر جھانکا۔

”وعدہ کریں۔ اس معاملے میں ساتھ نبھانے کا، رازداری رکھنے کا اور بھرپور مدد کرنے کا۔ دیکھیں میں نے آج تک اپنے معاملات کسی سے نہیں کہے آپ پہلے انسان ہیں جن کے سامنے جانے کیوں دل کھول کر رکھ دینے کو جی چاہا ہے۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔“ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ بیدار بخت اسے روتا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

”دیکھیے آپ رونے لگیں۔ پلیز مجھ پر اعتماد کریں۔“

وہ ایک دم نارمل ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ دونوں چلتے چلتے مخصوص جگہ پر آ گئے۔ آسیہ نے سہولت سے سب کچھ انہیں بتا دیا۔

اپنے مسائل، اپنی کہانی، اپنے پاپا کے بارے میں، مما کے بارے میں۔ نازیہ رحمٰن کے بارے میں مسرور خان اور منصور خان کے بارے میں۔ بیدار بخت سب کچھ سنتے رہے۔

”آسیہ رحمٰن! یہ تو بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔ یقین مانیں میرے دل میں آپ کے لیے ہمدردی ہی ہمدردی ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا میں حتی المقدور اس کے مطابق آپ کے کام آنے کی کوشش کروں گا۔“

”یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔ سچ بیدار بخت صاحب مجھے اپنی آپی بہت عزیز ہیں۔ ان کے دکھ مجھ سے دیکھے نہیں جاتے۔ وہ تو بالکل بے زبان ہیں جان چلی جائے گی لیکن منہ سے بھاپ تک نہ نکالیں گی۔ اب کہاں سے ہم اپنے تایا کے خاندان کو ڈھونڈ لائیں کہ پاپا اپنے عہد و پیمان پورے کر سکیں۔“

”تسلی رکھیں آسیہ رحمٰن۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ایک بار سر اظہر درانی سے مل تو لوں اور منصور خان سے بھی بات ہو جائے۔“

”نہیں نہیں۔ اظہر درانی کے یہاں آنے تک آپ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ منصور خان کہتے ہیں ہمیں از خود اظہر درانی سے یہ بات کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

”ٹھیک ہے کل اسی وقت آپ سے ملاقات ہوگی۔ ان شاء اللہ اچھے نتائج کے ساتھ۔“ وہ مسکراتے ہوئے آسیہ رحمٰن سے رخصت ہو گئے۔

❁❁❁❁

ذیشان بخاری اور مائرہ سید کی آپس میں گاڑھی چھن رہی تھی۔ ذیشان کے توسط سے مائرہ بیدار

بخت سے خاصی بے تکلف تھی۔ اس مسئلہ میں بیدار بخت نے مائرہ کو شامل کرنا ضروری سمجھا۔
''یار! ایک بھی کیا کنجوسی۔ تم نے مائرہ بی بی کی آمد کی خوشی میں مجھے دعوت دے کر ٹرخا دیا۔ پورے گینگ کو مدعو کرنا چاہیے تھا۔ مائرہ بی بی اگر اس بجیل کے پاس گنجائش نہیں ہے تو آپ ہی کر ڈالیے کوئی تقریب بہر ملاقات۔''
''مگر آپ کو ایسی کیا ضرورت آن پڑی مائی ڈیئر بیدار بخت خان۔'' ذیشان بخاری ان کے قریب تھا تو اُن سے واقف بھی بہت حد تک تھا۔
''ضرورت ہے نا یار۔ اور وہ بھی خاص قسم کی۔'' ذیشان بخاری کے لیے اتنی بات کافی تھی۔
''تو بیدار بخت صاحب اس میں متفکر ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے اپنی سالگرہ پارٹی میں، میں پورے گینگ کو مدعو کر رہی ہوں۔ آپ کا شکوہ دور ہو جائے گا۔''
''لیکن یہ تقریب کسی اوپن ایئر ہوٹل میں ہوگی۔ مائرہ بی بی اخراجات کے معاملے میں ذمہ داری آپ مجھ پر ڈال دیں۔''
''وہ کیوں؟'' مائرہ حیران سی رہ گئی۔
''بس ایک وجہ ہے نا۔ وہ میں آپ کو بعد میں سمجھا دوں گا۔ آپ کو ایک کام کرنا ہوگا کہ سالگرہ کا ایک کارڈ اپنے شعبہ کے سراظہر درانی تک پہنچانا ہوگا۔''
''اوکے۔ جو آپ حکم کریں۔'' مائرہ سید بھی بیدار بخت سے بری طرح متاثر تھی۔ تیسری شام بیدار بخت منصور خان کے بتائے ہوئے ایڈریس پر آسیہ رحمٰن کے گھر جا پہنچے۔ حیدر خان لان میں موجود تھے۔ گاڑی پورچ میں روک کر وہ سیدھے ان کی طرف چلے آئے۔ آسیہ رحمٰن نے گھر اور گھر والوں کے بارے میں یوں بتایا تھا کہ انہیں ذرہ برابر اجنبیت محسوس نہ ہو رہی تھی۔ حیدر خان نے انہیں خوش دلی سے ویلکم کیا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
''مجھے بیدار بخت کہتے ہیں۔ منصور خان سے میری دوستی پچھلے چند دنوں میں ہوئی۔ انہوں نے کئی بار بصد اصرار مجھے بلایا لیکن مجھے آج ہی آنے کی فرصت مل سکی۔'' حیدر خان بغور انہیں دیکھ رہے تھے۔
''ہمیں تم سے مل کر خوشی ہوئی ینگ مین۔ فرسٹ امپریشن ہم پر اچھا ہی پڑا منصور خان کے دوست کا۔ آگے کی اللہ جانے۔'' وہ مزاج کے لحاظ سے بیدار بخت کو خوش و خرم ہی لگے۔ وہ ان سے حدود اربعہ پوچھنے لگے۔ لاہور میں رہائش کا سبب، خاندانیت اور جانے کیا کچھ لیکن بیدار بخت نے منصوبے کے تحت ایک بات بھی صحیح نہیں بتائی۔ باتوں ہی باتوں میں ان کی ہمدردیاں جیتنے کی بھرپور کوشش کی۔ اور آخر کار سالگرہ کا کارڈ ان کی طرف بڑھا دیا۔
''یہ کیا ہے برخوردار؟''
''خان صاحب! پرسوں شام میری ملاقات منصور خان سے ہوئی ان کے ساتھ اُن کی ہمشیرہ تھیں۔ میں اپنی کزن مائرہ کے ساتھ جو مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہے، شاپنگ کے لیے آیا تھا۔ دونوں لڑکیوں میں پہلی ملاقات میں دوستی ہوگئی۔ شاید میں آج بھی نہ آپاتا لیکن کزن میرے کان کھا گئی۔ اس نے اپنی اور دوستوں کے ساتھ آسیہ رحمٰن کی شرکت کو ضروری سمجھا۔ بس یہ کارڈ اسی سلسلے میں۔''

حیدر خان کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اُن کی مدبر شخصیت انہیں ہزاروں میں ممتاز بنانے کو کافی تھی۔

''بیٹا۔'' حیدر خان نے انہیں میٹھے لہجے میں پکارا تو ان کی نظریں شفیق چہرے پر جمی رہیں۔ آسیہ رحمٰن کے کہنے کے مطابق بیدار بخت نے ذہن میں جو خیال قائم کیا تھا وہ اس سے یکسر مختلف تھے۔ بیدار بخت کو ان پر پیار سا آنے لگا۔

''منصور خان سے تمہاری دوستی اور ملاقات کس حد تک ہے یہ میں نہیں جانتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس نے تمہیں یہ ضرور بتایا ہوگا کہ میں دنیا میں محدود تعلقات رکھنے کے حق میں ہوں۔''

''سر! یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ دوستی کے ناتے انویٹیشن کارڈ پہنچانا فرض تھا۔ مجھے آنر دینا آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔''

تبھی سامنے برآمدے کی سیڑھیوں سے آسیہ اور نازیہ آتی دکھائی دیں ان پر نظر پڑتے ہی مسکراہٹ بیدار بخت کے لبوں پر آ گئی۔ لیکن آسیہ اور نازیہ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بیدار بخت کی غیور طبیعت نے جوش سا کھایا۔ پھر انہیں آسیہ رحمٰن کی مجبوریوں کے احساس نے آگھیرا۔ سلام دعا کے رسمی مظاہرے کے بعد دونوں نے پاس پڑی کرسیاں سنبھال لیں۔

''آپ کی کزن کیسی ہیں مسٹر بیدار بخت۔ انہوں نے تو وعدہ کیا تھا گھر آنے کا۔''

''اُن کی طرف سے معذرت خواہ ہوتے ہوئے سالگرہ میں شرکت کی دعوت دینے آیا ہوں۔ مائرہ سب دوستوں کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنے قریب دیکھ کر خوش ہوں گی۔''

حیدر خان نے کارڈ آسیہ کی طرف بڑھا دیا۔

''آپی! میں نے مائرہ کے متعلق آپ کو بتایا تھا۔ بالکل اسی طرح مائرہ کے سامنے دو تین بار اپنی پیاری آپی کا نام لیا تھا اور اس نے آپ کے نام بھی کارڈ بھیج دیا۔ کیوں پاپا! کیا خیال ہے مجھے اپنی نئی دوست کے جذبوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے نا۔'' آسیہ نے جان بوجھ کر یہ سوال بیدار بخت کی موجودگی میں کیا۔

''ہاں بیٹے! جب ان لوگوں نے اتنے خلوص سے تمہیں بلایا ہے۔ تم لوگوں کو جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے مسرور خان کل تک کراچی سے لوٹ آئیں گے۔ بس تم دونوں بہنیں ان کے ساتھ چلی جانا۔ اور ہاں نازو بیٹی۔ ایک اچھا نوجوان میرا مہمان ہے۔ اس لیے کچھ منگواؤ نا۔ خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے بنائی کوئی چیز۔'' حیدر خان کی خوش دلی پر دونوں لڑکیاں بھی حیران تھیں۔ وہ تو کسی سے بات کرنے پر بھی راضی نہ تھے۔ اور بیدار بخت سے پہلی ملاقات میں یوں گھل مل گئے تھے۔

دراصل کم گو سے بیدار بخت نے اپنا سارا زور و خطابت یہیں صرف کر دیا تھا۔ صرف حیدر خان پر ذات کا اچھا تاثر ڈالنے کے لیے۔ اب تک گزری زندگی میں مقصدیت تھی تو صرف تعلیم کی حد تک لیکن آسیہ رحمٰن سے مل کر حیات میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ اس لڑکی کی رضامندی اور اطمینان خریدنا اُن کا نصب العین بننے لگا تھا۔

چائے کے دوران خاصی گفتگو رہی۔ واپس آتے ہوئے بیدار بخت نے موقع پا کر آسیہ کو مخاطب

کیا۔

''سر اظہر درانی بھی تقریب میں شریک ہوں گے۔''

آسیہ رحمن کے چہرے پر تشکر کے جذبات و احساسات چھائے تھے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بیدار بخت نے الوداعی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

❁❁❁❁

''بیدار بخت! یہ چکر کیا ہے۔ سر اظہر درانی تو شرکت سے انکار کرتے رہے لیکن میں نے منوا کر دم لیا۔'' مائرہ نے مطلع کرتے کرتے بھی حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

''ہاں بی بی! لڑکیوں کی قوم میں ممتاز جو ہیں آپ اپنے ڈپارٹمنٹ میں۔ انہوں نے آپ کی بات تو ماننا ہی تھی۔'' بیدار بخت نے اسے چھیڑا۔

''آپ کی خاطر سب کچھ کرنا پڑا۔ مگر یہ تو بتایئے بیدار بخت آپ کی وہ کزنز آئیں گی کہاں سے؟'' انہوں نے برتقاضائے مصلحت ادھر بھی جھوٹ بولا تھا۔

''اسی شہر سے اور کہاں سے۔ مائرہ بی بی یہ خیال رہے کہ سر اظہر کو ان سے گفتگو کا موقع ضرور ملے۔''

''او کے سر۔''

مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ لڑکیوں کی تعداد دیکھ کر بیدار بخت اندازہ لگا رہے تھے کہ مائرہ دوستی کے معاملے میں کس قدر تیز تھی۔

تبھی حیدر خان کی امپالا ہوٹل کے گیٹ سے اندر آئی۔ جسے وہ بذات خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ بیدار بخت لپک کر ان کے قریب آئے۔ سیاہ سوٹ میں شاندار سراپے سمیت گاڑی کے قریب کھڑے حیدر خان وہاں موجود سب لوگوں سے جدا نظر آ رہے تھے اور اُن کے جلو میں کھڑی نازیہ اور آسیہ حد درجہ منفرد اور حسین۔

حیدر خان کو دیکھ کر بیدار بخت کو اپنا سارا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آنے لگا۔ لیکن حیدر خان نے اُن کی مشکل آسان کر دی۔

''چلو بیٹی تم اندر جاؤ۔ فون کر کے مجھے بتا دینا میں لینے آ جاؤں گا۔'' بیدار بخت نے رسماً ہی انہیں بھی شریک ہونے کا کہا لیکن وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ بچوں کی تقریب میں بوڑھوں کا کیا کام۔ وہ ان دونوں کو لے کر لان کی طرف آ گئے۔ جہاں کافی مہمان پہلے ہی آ چکے تھے۔

بیدار بخت کے کافی دوست مدعو تھے۔ سارا کھڑاگ ایک تو انہیں اظہر درانی کی خاطر پھیلانا پڑا تھا۔ بلکہ ان کی وجہ سے اسٹاف کے چند دوسرے ممبرز کو بھی شرکت کی دعوت دینا پڑی تھی۔ وہ چاہتے تو سب کو خود اپنے نام سے بلا سکتے تھے لیکن پھر نازیہ اور آسیہ رحمن کا آنا محال ہو جاتا۔ وہ تو اس بات پر ششدر سے رہ گئے تھے کہ حیدر خان نے اتنی جلدی ان پر اعتماد کر لیا تھا۔

مائرہ نے دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ منصوبے کے مطابق آسیہ رحمن اور مائرہ نے گرم جوشی سے مل کر نازیہ کو یقین دلایا کہ ان کی دوستی کی جڑیں بہت گہری ہو چکی ہیں۔ مائرہ انہیں اس کمرے کی طرف لے گئی

جہاں اظہر درانی موجود تھے۔

''نازو آپی! تقریب میں ابھی کچھ دیر ہے۔ فی الحال اندر تشریف رکھیے۔'' دونوں مائرہ کے ساتھ اندر چلی گئیں۔ جونہی نازیہ نے دروازے میں قدم رکھا۔ آسیہ دو قدم پیچھے رک گئی۔

اظہر درانی عین دروازے کے سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ نازیہ انہیں دیکھ کر وہیں کھڑی رہ گئی۔ دونوں کتنی دیر بے یقینی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اظہر درانی صوفے سے اٹھے اور خواب کے عالم میں چلتے نازیہ کی طرف آئے۔

''نازو۔ یہ تم ہو نازو۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔'' وہ حیران تھے۔ نازیہ میں قدم اٹھانے کی ہمت بھی نہ رہی۔ نازیہ ایک ٹک انہیں دیکھے گئی۔

''چھ سال بہت طویل عرصہ ہوتا ہے نازو۔ کسی کو بھول جانے کے لیے کافی سے زیادہ۔ لیکن دیکھ لو میں تمہیں کہیں بھول پایا، میرے جذبوں کی سچائیاں تمہیں یہاں کھینچ لائیں۔ تم نے کہا تھا نا نازو جذبے سچے ہوئے تو ایک روز مل جائیں گے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو ایک دوسرے کو ہر حال میں اپنا لیں گے۔ اپنا وعدہ پورا کر دو۔ نازو۔ فار گاڈ سیک۔''

''نہیں نہیں۔ اظہر خدا کے لیے ایسا نہیں کہو۔ پاپا کے بنائے ہوئے اصولوں سے ٹکرانے کی ہمت آج تک پیدا نہیں ہو سکی۔ میں اتنی خوش نصیب نہ پہلے تھی نہ اب ہوں۔ میں نے تو عرصہ ہوا خواب سمجھ کر تمہیں بھلا دیا ہے۔ تم۔۔ تم مجھے بھول جاؤ۔ اظہر بھول جاؤ۔''

''رفاقت کے ان دو ڈھائی سالوں کا ایک لمحہ بھی تمہیں یاد نہیں نازو۔ اُن لمحوں کی یاد نے اپنی تو جان پر بنائے رکھی۔ دل کسی نظارے میں بہل نہ سکا۔ دل کسی بہانے خوش رہ نہ سکا۔ تمہاری یاد اس قدر باوفا ہے تم بے وفا کس طرح ہو سکتی ہو نازو۔ میں کل ہی خان صاحب کے پاس اپنی امی جان کو لے آؤں گا۔ نازو میری زندگی ہے۔ زندگی سے زیادہ دیر دور نہیں رہا جاتا۔''

''نہیں اظہر۔ بڑی مشکلوں سے پاپا کا اعتماد مجھے دوبارہ حاصل ہوا ہے تم ایسا نہیں کرنا۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔''

''نازو! دنیا اس قدر ایڈوانس ہو گئی ہے تم ابھی تک صدیوں پیچھے ہو۔ اپنے حق کی خاطر ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی آواز بلند کرتا ہے۔ تم کوئی نادان بچی تو نہیں ہو۔ اپنا اچھا برا خود سمجھ سکتی ہو۔ نہیں کرتے نہ کریں تمہارے پاپا تمہاری شادی مجھ سے۔ ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔ نازو! اظہر عمر بھر انتظار کر سکتا ہے لیکن انتظار کی حد ضرور ہونا چاہیے۔ امید کی کرن ضرور سامنے ہو۔''

''میں نے کب آپ کو اپنا پابند بنایا ہے اظہر۔ آپ شادی کریں۔ گھر بنائیں۔ کیا میرے لیے اتنا کافی نہیں کہ میں نے ایک انسان کو دل کی گہرائیوں سے چاہا اور چاہتی رہوں گی۔''

''لعنت بھیجتا ہوں ایسی چاہت پر۔ مجھے دل و دماغ کی تقسیم نہیں چاہیے۔ تم بن جینے کا ڈھنگ آ جاتا تو چھ سال تمہیں بھلا دینے کو کافی تھے۔''

اُسی دم آسیہ اندر آ گئی۔

''آداب اظہر بھائی!'' اظہر درانی نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

چھ سال گزر جانے پر وہ اسی طرح ہی تھے۔ بلکہ ان کا سراپا بھاری ہو کر اور بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ نازیہ کو تو آسیہ نے سنبھال رکھا تھا ورنہ جدائی کا روگ دیمک بن کر اسے چاٹ گیا ہوتا۔

''آپ کی اس ملاقات کی خاطر بہت کچھ کرنا پڑا۔ اظہر بھائی! ان پرانی روایتوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ توڑ ڈالیے یہ رسم و رواج۔ میں آپ کے ساتھ ہوں، مسرور خان، منصور خان آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم جان لٹا کر آپی کی خوشیاں خریدیں گے۔ بس آپ دستِ سوال پاپا کے سامنے دراز کیجیے۔'' اظہر درانی خوش ہو گئے۔

''نازو نے اگر پانچ سال پہلے ہی یہ اجازت دے دی ہوتی تو آج حالات کا رخ کچھ اور ہوتا۔'' نازیہ نظریں جھکائے کھڑی دوپٹے کا آنچل مروڑ رہی تھی۔

''آپ نے ایسی روایت ڈالی کہ مجھے یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت نہ مل سکی۔ اظہر بھائی! وفا کے نام پر حرف آ جائے گا۔ مجھے مرد ذات سے نفرت ہو جائے گی اگر آپ نے منزل کی جانب قدم نہ بڑھائے۔''

''اسے تو ابھی تک انکار ہے آسی! میں کیا قدم بڑھاؤں گا۔ میں جانتا ہوں اگر میں تمہارے گھر آ بھی گیا تو نازو انکار کر دے گی۔''

''ان کی کیا جرأت ہے انکار کی۔ یہ معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اگر پاپا نے بالفرض انکار کر بھی دیا تو ہم مکمل بغاوت کریں گے اور آپی کا ہاتھ آپ کے ہاتھوں میں دے کر رہیں گے۔'' نازو کا رنگ فق ہوا جا رہا تھا۔

''آسیہ! کیا اسی لیے تم مجھے یہاں لے کر آئی تھیں۔ جو کچھ تم یا دوسرے لوگ سوچ رہے ہیں وہ ناممکن ہے جب تک پاپا خود بخوشی یہ سب نہ کریں۔''

''بہر حال، یہ آسیہ کی بھی ضد ہے آپ زندگی گزاریں گی تو اظہر بھائی کے ساتھ ورنہ نہیں۔''

''نہیں کا کیا مطلب؟ کیا تم مجھے جان سے مار ڈالو گی۔'' نازیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بالکل۔ بے وفائی کا ارتکاب کرنے کے بعد جینے کا حق ہی کیا رہ جاتا ہے۔'' آسیہ کے لہجے میں نہ پیار تھا نہ شرارت۔ انتہائی سنجیدہ تھی وہ۔ اس صورت حال کا سب سے زیادہ اثر اسی پر تھا۔ اس کے جذبات مشتعل تھے۔ اس کے دل میں پاپا کی بے جا ضد کے خلاف نفرت ہی نفرت تھی۔ وہ نازیہ کو حوصلہ دینا چاہتی تھی۔ اپنا حق مانگنے کا حوصلہ۔ لیکن نازیہ سخت بزدل تھیں۔ چھ سال قبل جانے محبت کس طرح کر بیٹھی تھیں پاپا سے اجازت لیے بغیر۔ پاپا کو خبر ہو گئی انہوں نے فوراً نازیہ کو یونیورسٹی سے نکال لیا۔ ایم۔اے بھی نہ کرنے دیا۔ گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی۔ بمشکل یہ پابندیاں ہٹنے لگی تھیں کہ آسیہ کا مسئلہ سامنے آتے ہی پاپا دودھ کے جلے کی طرح سی بھی پھونک کر پینے لگے۔ انہوں نے آسیہ کو یونیورسٹی جانے کی اجازت نہ دی۔ بس اسی بات نے آسیہ کے منفی احساسات کو ہوا دی۔ دل میں عہد کر لیا گھر کے نظام کو بدلنے کا، پاپا کے اصولوں سے ٹکرانے کا۔ زندگی ایک موہوم امید کے سہارے گزارنا حماقت تھی۔ پاپا کو کسی انہونی کا انتظار تھا جو انہیں ان کے عزیزوں سے ملا دے۔ لیکن آسیہ کو ان سب باتوں سے نفرت تھی۔ اسی لیے اس نے یہ ساری تگ و دو کی تھی۔ وہ نازیہ اور اظہر درانی کی کورٹ میرج پر بھی راضی تھی

لیکن نازیہ کے لیے تو پاپا کی اجازت کے بغیر گھر سے قدم نکالنا دشوار تھا کجا زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنا۔

بیدار بخت باہر لان میں تھے۔ ذیشان بخاری اور دوسرے دوست ان کا ناطقہ بند کیے دے رہے تھے۔ طرح طرح کے کمنٹس پاس کر رہے تھے اور بیدار بخت اس گھڑی کو برا بھلا کہہ رہے تھے جب انہوں نے آسیہ سے مدد کا وعدہ کر لیا تھا۔

رات گئے تقریب کا اختتام ہوا۔ عین اس وقت جب اظہر درانی اپنی گاڑی باہر نکال رہے تھے۔ حیدر خان کی امپالا گیٹ کے سامنے رکی۔ اور دور کھڑے بیدار بخت کا خون خشک ہو گیا۔ وہ قریب آئے، حیدر خان نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ بیدار نے اُن کے چہرے پر خشونت اور غصہ ڈھونڈا لیکن وہ خوش باش تھے انہوں نے اظہر درانی کو دیکھا ہی نہ تھا اور اگر دیکھا تھا تو پہچان نہ پائے تھے۔

''ہیلو ینگ مین! ہم شاید تاخیر سے آئے ہیں۔''

''جی نہیں، تقریب ابھی ختم ہوئی ہے بس وہ لڑکیاں مل جل کر بیٹھی باتیں کر رہی ہیں۔'' بیدار بخت انہیں لے کر اندر آ گئے۔

''بیدار بخت! تم نے ہمیں اپنے انکل سے نہیں ملوایا ہے۔'' اُن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پارٹی میں مائرہ سید کے والدین بھی شریک تھے اور ذیشان بخاری کے والدین بھی۔ اگر اُن سے مل کر حیدر خان پر اُن کا جھوٹ کھل گیا تو بات جتنی حد تک جھوٹ ہے اس سے بڑا فراڈ بن جائے گی۔

''وہ ابھی ابھی گھر چلے گئے ہیں جناب! ان شاء اللہ اب میرے ساتھ ساتھ ان کی بھی ملاقاتیں آپ سے ہوتی رہیں گی۔''

''آل رائٹ۔ ہم تمہارے اخلاق اور شرافت سے بے حد متاثر ہوئے ہیں ینگ مین۔ ہم بہت کم کسی پر اعتماد کرتے ہیں لیکن تم ہمیں اپنے بیٹوں جیسے لگے ہو۔ منصور خان کے چلے جانے سے اور مسرور خان کے دھندوں میں گم ہو جانے پر ہم تنہائی محسوس کرنے لگے ہیں۔ آ جایا کرو نا ہمارے پاس جب بھی تمہیں وقت ملے۔ نازیہ بھائیوں کو بہت زیادہ مس کرتی ہے۔ تم سے مل کر باتیں کر کے اسے بھی خوشی ہو گی۔''

''جو آپ کا حکم۔ آپ کو علم ہے دورانِ تعلیم بندہ اگر سنجیدگی سے تعلیم حاصل کرے تو کتنا مصروف ہوتا ہے پھر بھی میں اپنی طرف سے حیدر ولا کے مکینوں کے لیے وقت ضرور نکالوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی نظر سامنے بیٹھی آسیہ رحمٰن پر پڑی۔ اور یہ سوچ کر جھرجھری سی آ گئی کہ اگر حیدر خان کو یہ خبر ہو جائے تو وہ یہیں کھڑے کھڑے تعلقات کی اس نئی ڈوری کو ایک جھٹکے سے توڑ دیں۔

❁❁❁❁

موسم گرما کی چھٹیاں پوری کی پوری وہ گھر پر کاٹا کرتے تھے لیکن اس سال وہ گھر پہنچے تو بے نام جذبوں کی کسک نے اندر ہی اندر انہیں بے چین کر دیا۔ ان لمحوں کی یادیں چاروں اور دامن پھیلا کر بیٹھ گئیں۔ جب جب وہ حیدر ولا گئے آسیہ کی معصومیت، صاف گوئی اور بھول پن انہیں شدت سے یاد آئے۔ اس کا۔۔۔ چہرہ نگاہوں کے سامنے پھرتا رہتا۔ کئی بار انہوں نے پاپا سے اجازت لے کر لاہور جانے کی ٹھانی لیکن پاپا کا خیال تھا کہ ایک بار ہی وہاں شفٹ ہوا جائے گا۔ اسی سال ہی انہیں

ریٹائرمنٹ ملی تھی اور اب وہ اپنا مستقل ٹھکانہ لاہور بنانا چاہتے تھے۔ بیدار بخت یہ دن اور گھڑیاں گن گن کر گزار رہے تھے۔ ایک دو بار وہ فون پر حیدر خان سے بات کر چکے تھے۔ اظہر درانی کے حالات سے آگاہی بھی تھی۔ اور منصور تو کھاریاں سے اکثر ان سے ملنے آجایا کرتے تھے۔ بیدار بخت منصور خان کو سر آنکھوں پر بٹھائے رکھتے۔ ان کے گھر میں غیر مردوں کا داخلہ اچھا خاصا ممنوع تھا لیکن منصور خان کو وہ عزیز از جان دوست بنا کر اپنے گھر لے آئے تھے۔ سب سے متعارف کرایا تھا اور فروا سے صاف کہہ دیا تھا۔

''فروا ڈیئر! منصور خان کی سسٹرز تمہارے بھیا کا از حد خیال رکھتی ہیں۔ جتنے دن منصور خان یہاں ہیں تم ان کو شکایت کا موقع نہیں دینا۔ ورنہ یہ اپنی سسٹرز کو ایک کی چار لگائیں گے۔''

بیدار بخت کے گھر میں گو آداب شرعی کا لحاظ رکھا جاتا تھا لیکن اکبر رحمٰن نے اُن پر یا فروا پر بے جا پابندیاں نہیں لگائی تھیں۔ ان سے بڑے بھائی دلدار جو آج کل امریکا میں تھے، بے حد آزاد خیال تھے، دلدار کی بات بچپن سے پھوپھی کی بیٹی سے طے تھی۔ دلدار صرف اس شادی سے بچنے کے لیے امریکا جا کر آباد ہوئے تھے اور آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ پروامیڈیکل کالج کے آخری سال میں تھی اور فروا نے اس سال گریجویشن کیا تھا۔ بیدار بخت ایک عرصے سے سنتے چلے آرہے تھے آمنہ ان کی منگیتر تھی، یہ بات نہ انہیں اچھی لگی تھی نہ بری۔ لیکن آسیہ رحمٰن کو دیکھنے کے بعد ان کے نظریات ایک دم بدل کر رہ گئے۔

وہ خود اپنے معاملات میں حد درجہ سنجیدہ تھے اور کسی ایک بات کو چن کر اس پر قائم ہو جانے اور ڈٹ جانے والے، یہ جرأت اور حوصلہ باوجود صنف نازک ہونے کے انہوں نے آسیہ رحمٰن میں دیکھا تھا۔ بس یہی ادا اُن کا دل لے گئی تھی۔ وہ خوب صورت تھی، ذہین تھی، سمجھ دار تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بیدار بخت کے ذہن سے میل کھاتی تھی۔

پچھلے دنوں مسلسل دو ماہ اُن کے دن کافی حد تک اہل حیدر ولا کی قربت میں گزرے تھے۔ نازیہ میں انہیں پروا کی جھلک نظر آئی تھی اور آسیہ رحمٰن تو چند ملاقاتوں میں ان کی روح میں بسنے لگی تھی۔ بس وہ حال دل کسی پر واضح نہ کر سکتے تھے خود اُس آسیہ رحمٰن پر بھی نہیں۔ جانتے تھے وہ اکھڑ مزاج لڑکی ہے۔ اگر اس نے ایک بار انہیں ٹھکرا دیا تو وہ زندگی بھر پلٹ کر اسے دیکھنے کا حوصلہ بھی اپنے اندر نہیں پائیں گے۔ کجا حال دل کہنا۔

لاہور آتے ہی انہوں نے رنگ کر کے اپنی آمد کے متعلق منصور خان کو بتا دیا جو دو روز قبل ان سے ملے تھے۔ اور دوسرے دن بھری دوپہر میں ان کے گھر جا دھمکے۔

خنک ماحول میں وہ منصور خان اور مسرور خان کے سنگ بیٹھے تھے۔ مسرور خان سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ مینگو اسکوائش سے بھرے مگ لے کر آسیہ رحمٰن کمرے میں داخل ہوئی اور انہیں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''اے بیوٹی فل سرپرائز!'' منصور خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انہوں نے آسیہ کو صرف اسکوائش لانے کا آرڈر دیا تھا۔ بیدار بخت کی آمد کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا ہوا تو ہاتھ میں پکڑی ٹرے ہاتھوں میں کانپنے لگی اور اسکوائش چھلک گیا جسم عجیب انداز میں لرز رہا تھا، کانپ رہا تھا۔ ٹھنڈے کمرے میں وہ پسینے میں نہا گئی۔ جی چاہا دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ اس چہرے کو تکتی رہے۔ لیکن سامنے بیٹھے دونوں بھائی اس کی ایک ایک حرکت غور سے دیکھ سکتے تھے۔ وہ استقبالی طور پر ایک کلمہ بھی نہ کہہ سکی۔ بس چپ چاپ مگ ان کی طرف بڑھا دیا۔ اور انہوں نے مسکراتی آنکھوں سے پیار کی پھوار برساتے ہوئے لے لیا۔

''نازو آپی تو اس وقت محوِ خواب ہوں گی۔''

''جی۔ اگر آپ کہیں تو۔۔۔''

''اوہ نہیں نہیں۔ اُن کی نیند میں خلل پڑ جائے گا، بے آرام ہوں گی۔''

''نازو آپی کا بڑا خیال ہے یار اور ہمیں جو بھری دوپہر میں ذلیل کرنے چلے آئے ہو۔'' منصور اور بیدار آپس میں گہری حدوں تک اپنائیت کی ڈوری میں بندھے تھے۔

''یہ تو ان لمحات کا بدلہ ہے جب تم آدھی راتوں کو بغیر اطلاع کے آکر پرسکون نیندیں لوٹ لیا کرتے تھے۔ وہ تو احسان تھا نا مجھ پر۔''

''اچھا۔ بیدار بخت آپ بھی ہر دوپہر آجایا کریں نا جب تک اس کے احسان کا بدلہ مکمل طور پر اسے نہ مل جائے۔'' مسرور خان نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''نہیں، ہم سزا و جزا کا مسئلہ قیامت کے دن پر اٹھا رکھیں گے۔ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں اپنے کھاتے میں لکھوائیں گے۔''

''کاروباری تو مسرور خان ہیں۔ تم پر اثر کیسے ہو گیا یار۔'' منصور نے پوچھا۔

''پاپا ریٹائرمنٹ کے بعد اسی میدان میں آرہے ہیں۔ شاید مجھے بھی ایسا کرنا پڑ جائے۔ تو نفع و نقصان کے بارے میں معلومات بلکہ تجربات تو صحیح قسم کے ہوں۔''

مسرور خان سے مل کر بیدار بخت کو اور لوگوں کی طرح اجنبیت کا احساس چھو کر بھی نہیں گیا۔ لگتا تھا ان سے بھی برسوں پہلے کی شناسائی ہے۔ شکل و صورت میں دونوں بھائی اپنے پاپا حیدر خان سے مشابہ تھے اور آسیہ رحمٰن بھی۔

کچھ دیر بعد وہ چلی گئی تو منصور خان نے انہیں مخاطب کیا۔

''بیدار بخت میں نے مسرور کو ہر بات بتا دی ہے۔ ان کا فیصلہ صدفی صد نازو آپی اور اظہر درانی کے حق میں ہے تم ان سے کہہ دو۔ وہ جب چاہیں حیدر ولا آجائیں، ہم سب مل کر پاپا کو بھرپور طریقے سے فورس کریں گے۔ اور یہ شادی ہر حال میں کروائیں گے۔''

''لیکن منصور خان! خود نازو کی جو۔۔۔'' بیدار بخت کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

''اُن کی چھوڑو یار۔ وہ تو بس پاپا کے حد درجہ زیرِ اثر ہیں۔ جب پاپا ہی راضی ہوں گے تو وہ کیا انکار کریں گی۔ اظہر درانی کو میں بھی جانتا ہوں۔ زمانہ طالب علمی میں وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ پاپا ان سے بے حد متاثر تھے۔ ان سے محبت و مہربانی کرتے تھے۔ لیکن یہ جان کر کہ نازو آپی اور اظہر درانی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ وہ ایک دم بگڑ گئے۔ یہ ضد انہیں ایمان جتنی عزیز ہے کہ

وہ اپنے بچوں کو اپنے عزیز از جان بھائی کے بچوں سے ہی بیاہیں گے۔ جبکہ آسیہ کو تو اس بات سے چڑ ہے کیا خبر ان لوگوں کا کوئی وجود ہے بھی یا نہیں۔''

بیدار بخت ان نامعلوم افراد کے ذکر سے ہی خار کھانے لگے تھے۔ خدا کرے آسیہ کے کہنے کے مطابق ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ وہ سوچتے سوچتے بولے۔

''تو یار وہ پاکستان کے خطے میں ہی کہیں ہوں گے ڈھونڈنا کوئی اتنا مشکل تو نہیں۔ آخر اس گھر کا وجود بھی تو کہیں ہوگا جسے انکل چھوڑ کر آئے ہوں گے۔''

''یہی تو پرابلم ہے کہ وہ گھر ان کے یہاں آنے کے دو سال بعد بک گیا تھا۔ تب سے آج تک انہیں اپنے خاندان سے کوئی آگاہی نہیں۔''

''اگر وہ کسی دن نازل ہو گئے اور۔۔۔ اور۔۔۔'' اس سے آگے بیدار بخت کچھ نہ سوچ سکے۔ بس اپنے بڑھتے قدموں کو یہیں روک دینے کا سوچا کہ بہت زیادہ سفر طے کرنے کے بعد واپس لوٹنا دشوار ہو جاتا ہے۔

بہت سی باتیں ہوئیں اور آخر کار یہ طے پایا کہ بیدار بخت کل ہی اظہر درانی سے مل کر بات کر لیں گے یہ کام جتنی جلدی ممکن ہو ختم کر سکے۔

❁❁❁❁

اظہر درانی تین ماہ کا ریفریشر کورس کرنے جامعہ ازہر گئے ہوئے تھے یہ پیغام انہوں نے مائرہ اور ذیشان کو دیا تھا۔ اس کے بارے میں جان کر بیدار بخت مایوس سے ہو گئے لیکن انہیں خبر تھی وہ مجبوراً گئے ہوں گے۔ بہر حال ان دنوں میں بیدار بخت حیدر ولا میں ایک ضروری اور اہم فرد کی حیثیت اختیار کر گئے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کئی خوب صورت گھڑیاں انہیں وہاں گزارنے کو میسر آ جاتیں۔

شام کے کئی گھنٹے وہ حیدر خان کی لائبریری میں ان کے ساتھ گزارتے۔ اہم معاملات پر ان سے ڈسکس کرتے بلکہ اپنے مضمون میں انہیں حیدر خان سے کافی مدد ملی تھی۔ وہ روز بروز حیدر خان کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوتے جا رہے تھے۔ اُن کے خوب صورت خیالات کے گرویدہ تھے۔ اگر معاملہ ان کے دل کا نہ ہوتا تو وہ ایک منٹ میں یہ فیصلہ کر دیتے کہ حیدر خان کی چاروں اولادوں کو صبر و شکر کے ساتھ اپنے بچھڑے خاندان کا انتظار کرنا چاہیے لیکن یہ سوچ سب سے پہلے ان کے اعصاب کو بے سکون کر دیتی۔

تین ماہ بھی گزر گئے۔ اظہر درانی نے واپس آتے ہی ان سے رابطہ قائم کیا۔ بیدار بخت نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ تیسری شام اظہر درانی کی والدہ اور بہنیں حیدر ولا چلی آئیں۔

آسیہ رحمٰن نے انہیں عزت و احترام کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ منصور خان سے ملے اور پھر مسرور خان نے پاپا کو اطلاع دی۔ یہ بات سن کر وہ ایک دم کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے ان کی آواز سے کمرے کے در و دیوار گونج گئے۔

''وہ یہاں کیسے آ گئے؟''

''وہ کیوں آئے؟''

''کس نے انہیں بلایا؟''

''تم لوگ جانتے ہو۔ ہمارے خاندان میں شادیاں صرف اپنوں میں ہی ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود تم مجھ سے یہ کہنے کے لیے آئے کہ وہ مجھ سے رشتے کی بات کرنے آئے ہیں۔'' وہ دھاڑے۔

''اس سے قبل کہ میں کوئی سخت سست بات اُن سے کہوں انہیں بتادو۔ وہ اس گھر سے کچھ نہ پاسکیں گے۔''

''پاپا یہ دقیانوسیت ہے۔ اگر خاندان کی بات تھی تو آپ نے شادی ایک غیر خاندان بلکہ غیر ملک کی لڑکی سے کیوں کی۔'' اولاد کیے ہوئے عمل کا حساب مانگ رہی تھی۔

''بکواس بند کرو۔ ہم آج تک اسی کیے کی سزا ہی تو بھگت رہے ہیں۔ اپنے خاندان سے جدا ہیں سب سے دور ہیں بے خبر ہیں۔''

''پاپا اس دنیا میں ہر شخص کو شخصی آزادی صرف معاشرے نے ہی نہیں خدا اور اس کے رسول کے قانون نے بھی دی ہے۔ آپ نازو آپی سے یہ حق نہ چھینیں۔'' مسرور خان نے دبے دبے لہجے میں کہا

''کیوں اُس نے تم سے شکوہ کیا ہے کیا۔ جاؤ اسے بلا کے لاؤ۔'' باہر کھڑے بیدار بخت اسی دم اندر آگئے۔

''انکل وہ پانچ طویل سالوں میں حق نہ کہہ سکیں اب کیا بولیں گی۔ آپ اتنے ظالم کیوں بن رہے ہیں۔ نازو آپی میری بھی بہن ہیں۔ ان کی اداس اور روکھی پھیکی زندگی خود مجھے تکلیف دیتی ہے آپ تو پھر بھی باپ ہیں۔''

''کیا غم ہے اسے۔ کیا کمی رکھی ہے میں نے۔ اس گھر کی کُل مالک ہے وہ۔ دنیا کی ہر خوشی ہر عیش انہیں میسر ہے۔ پھر یہ کس بات کا شکوہ کرتے ہیں۔''

''نہیں انکل۔ یہ مادّی چیزیں کبھی کبھار دکھ کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔ سچی خوشی تو دل کا سکون ہے جو انہیں حاصل نہیں۔'' بیدار بخت سچ مچ دکھی ہو رہے تھے۔

''کیا کہنا چاہتے ہو تم۔''

''انکل نازو آپی عمر کے اکتیس سال پورے کرنے والی ہیں۔ ہر لڑکی کے دل میں کچھ آرزوئیں آباد ہوتی ہیں۔ کیا آپ کو وہ آرزوئیں پامال کر کے سکون ملے گا۔''

''بیدار بخت! تمہارے بارے میں میرا پہلا نظریہ بے شک یہی تھا کہ تم ایک اچھے نوجوان ہو۔ تم واحد شخص ہو جسے میں نے اپنے گھر میں خوش دلی سے آنے کی اجازت دی۔ ذہنی طور پر تمہیں قبول کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرنے بیٹھ جاؤ۔''

''میں نے تو صرف انسانیت کے ناتے حق بات کہنے کی کوشش کی ہے آپ تو روشن خیال ہیں۔ ہر بات باخوبی سمجھتے ہیں۔ ایک دنیا کو آپ جانتے ہیں۔ اندرون ملک بیرون ملک قسم قسم کے لوگوں سے آپ کا واسطہ ہے انکل۔ آخر اظہر درانی میں برائی ہی کیا ہے۔ اگلے دس سال اگر آپ کے بھائی بہن آپ کو نہ مل سکے تو کیا آپ نازو آپی کو انتظار کی صلیب پر لٹکائے رکھیں گے۔ انکل! میں تو دیکھ رہا ہوں آپ کے خیالات زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ جو غلط قسم کی روایات کے پابند

تھے۔"

"بیدار بخت میں نے بہت کچھ صبر کے ساتھ سن لیا ہے کیا یہ بہتر نہیں کہ میرے کچھ کہنے سے قبل خود ہی خاموش ہو جاؤ تم ایک تھرڈ پرسن ہو۔ اصولاً تمہیں میرے معاملات میں مداخلت کا کوئی حق ہی نہیں۔ اپنے بچوں سے متعلق اچھا یا برا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف مجھے ہے۔" وہ لمحہ بھر رکے اور پھر مسرور خان سے مخاطب ہوئے۔

"مسرور! انہیں جا کے کہو وہ اس گھر سے جا سکتے ہیں۔ میرا ان سے کوئی ناتا کوئی تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تم سے نہ کہہ سکو تو مجھے بتاؤ تا کہ میں خود جا کر اُن سے بات کر لوں۔"

"انکل! آپ جو کچھ کر رہے ہیں یہ آپ کے حق میں بہتر نہیں ہے۔ موہوم امیدوں پر زندگیاں بھینٹ چڑھا دینا کہاں کا انصاف ہے۔ اگر آپ کے خاندان کو آپ سے غرض ہوتی تو انہوں نے اب تک آپ سے رابطہ قائم کر لیا ہوتا۔ کیسے باپ ہیں آپ۔ زندگی بھر ان کی خاطر قربانیاں دے کر اب زندگی کی بڑی خوشی چھین لینا چاہتے ہیں۔"

"بیدار بخت چھوڑو۔ پاپا کی بات ٹھیک ہے۔" مسرور خان نے کہا۔

"اس سے کہہ دو مسرور۔ قبل اس کے کہ میں اسے کوئی سخت بات کہوں یہ یہاں سے چلا جائے۔ اس گھر میں اس کے داخلے کا مطلب بغاوت تھا کیا؟ میں آئندہ اس کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا۔"

"تھینک یو انکل۔ اس بات پر بھی احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے کوئی سخت الفاظ نہیں کہے۔ میں جا رہا ہوں آئندہ کبھی یہاں نہ آنے کے لیے۔ اللہ حافظ۔" حیدر خان غصہ ضبط کیے منہ پھیرے کھڑے رہے اور بیدار بخت کمرے سے نکل گئے۔

باہر آسیہ کھڑی تھی اور اس کے ساتھ منصور خان، بیدار نے ان دونوں کی طرف دیکھا تک نہیں اور سخت غصے کے عالم میں کوریڈور میں چلتے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے گئے۔

آسیہ ان کے پیچھے لپکی۔ منصور خان آگے بڑھے۔

"بیدار بخت! ایک منٹ رکو تو سہی۔ بات تو سنو۔" لیکن انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ آسیہ کسی کی پروا کیے بغیر اُن کی طرف بھاگتی ہوئی آئی اور ان کا بازو تھام لیا۔ جسے درشتی سے انہوں نے چھڑاتے ہوئے ایک قہر آلود نگاہ آسیہ پر ڈالی۔

"اب کیا کسر رہ گئی ہے جسے پورا کرنے آپ آئی ہیں آسیہ رحمٰن صاحبہ۔" آسیہ ڈبڈباتی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"بیدار۔۔۔ بیدار پلیز۔"

"کیا بات ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

"میری وجہ سے پاپا نے آپ کی توہین کی۔ میں۔۔ میں۔۔۔"

"کیا سمجھتی ہیں آپ۔ معذرت کے الفاظ یہ ملال ختم کر دیں گے ہرگز نہیں۔ آسیہ رحمٰن میں تو ایک سیدھا سادہ سا طالب علم تھا۔ جسے پڑھائی کے علاوہ کسی بات کی لگن نہ تھی۔ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی

جب آپ مجھ سے ٹکرا گئیں۔ آپ کی الٹی سیدھی باتوں میں آ کر میں نے آپ کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ مجھے تو سچ مچ مداخلت کرنے کا حق ہی نہ تھا۔ بعض اوقات دانستہ طور پر نادانیاں ہو جاتی ہیں۔ میں اسے بھی اپنی ایسی خطا سمجھوں گا۔ آپ کی آپی کو یا پاپا کو ایسی زندگی پسند ہے تو مجھے کیا پڑی ہے۔ کہ میں الجھے مسائل حل کراتا پھروں۔ اظہر درانی میں ہمت ہے تو وہ چھین کر لے جائیں آپ کی آپی کو۔ بہر حال آپ کی باتوں میں آ کر میں نے خوب توہین کرالی ہے اپنی۔ میرے پاپا تھوڑے عرصے میں لاہور آنے والے ہیں۔ انہیں خبر ہو گئی تو جان نکال دیں گے۔ کاش! میں آپ سے نہ ملا ہوتا۔ کاش! میں نے آج حیدر خان صاحب کے سامنے یہ جرأت نہ کی ہوتی۔''

''بیدار بخت۔'' منصور خان نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بیدار بخت نے گردن موڑ کر منصور خان کو دیکھا۔

''بس۔ دوستی کا دعوا یہیں تک تھا دوست! تم نے تو ساتھ نبھانے کا وعدہ کر رکھا ہے مجھ سے۔ مسرور خان سے۔ تمہیں خبر ہے ہم لوگ دوستی کی خاطر ہر چیز قربان کر دینے کو تیار رہتے ہیں۔ تم کیا صرف پاپا کی سخت بات بھی نہیں سن سکتے۔''

''منصور خان میری رگوں میں دوڑنے والا خون بھی خاصا گرم ہے۔ اس میں خلوص اور محبت کی گرمی بھی ہے لیکن میرے عزیز! میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ چلو نازو آپی کی شادی ہم لوگ مل کر دیتے ہیں۔ بولو ہے تم میں حوصلہ پاپا سے ٹکرانے کا۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ میں جانتا ہوں تم یہ زندگی بھر نہ کر سکو گے۔ میری وفا کا دوسرا ثبوت یہ ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے گم شدہ خاندان کو ڈھونڈ کر لے آؤں تاکہ اس گھر پر چھائے دکھ اور مایوسی کے اندھیرے دور ہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا پھر اور کیا کروں۔ میں جا رہا ہوں۔ جب بھی تم کوئی فیصلہ کر لو۔ نازو آپی کی ڈولی اٹھانے یا اپنے عزیزوں کو ڈھونڈ لانے کا تو نازو آپی کو رخصت کرانے میں یا تمہارے عزیزوں کو تلاش کرنے کی مہم میں، میں تمہارا ساتھ ضرور دوں گا۔ اللہ حافظ۔''

بیدار بخت لان عبور کر کے گیٹ کی طرف آ گئے۔ الوداعی نظروں سے اس گھر کے در و دیوار کی طرف دیکھا اور چلے آئے۔

❁❁❁❁

الوداعی پارٹی میں سب لوگ شریک تھے۔ شعبے کی تمام لڑکیاں اور لڑکے، بیدار بخت اپنی ذات میں الجھے بکھرے شریک محفل تھے۔ اظہر درانی بھی اسٹاف کے ساتھ موجود رسم دنیا کے مطابق اپنا دکھ سینے میں چھپائے قہقہے لگا رہے تھے۔ مائرہ سید نے ایک بار ان سے آسیہ کے متعلق پوچھا تو وہ گول مول جواب دے کر خاموش ہو گئے۔ پارٹی کے اختتام پر لڑکیاں اظہر درانی کو گھیرے میں لیے آٹو گراف کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ جب بیدار بخت ان کے قریب گئے۔

اظہر جلدی جلدی سب کو نمٹا کر ان کے ساتھ آ گئے۔ راستے سے کچھ ہٹ کر دونوں کھڑے خاموش خاموش سے بات کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔

''آئی ایم سو ساری سر! میں آپ کے لیے کچھ نہ کر سکا۔''

''مجھے تم سے کیا شکوہ ہوسکتا ہے بیدار بخت۔ تم نے تو اپنے تئیں ہر کوشش کی ہے۔ میں نے نازیہ سے ایک بار اس کا ہاتھ مانگنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ وعدہ پورا ہوگیا۔ پانچ چھ سال کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا۔ انتظار کو پانچ چھ سال بعد بھی ان لوگوں کے خیالات میں تبدیلی نہیں آسکی۔ میں معاشرے میں کسی مقام کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔ شادی میری ضرورت ہے۔ مجھے گھر بنانا ہے۔ اب میں بہت جلد یہ قدم اٹھاؤں گا۔ تم لوگ ابھی میچور نہیں ہو۔ تم لوگوں کی رائے ناقص تھی۔ عمر کا یہ دور جذباتی قسم کا ہوتا ہے۔ نادان تو میں تھا تمہاری باتوں میں آکر ایک دکھ اور مل گیا مجھے۔ میری والدہ اور بہنوں کی جو توہین حیدر خان نے کی ہے۔ وہ زندگی بھر کے لیے مجھ جیسے انسان کو کافی ہے۔ آیندہ ماہ ماہِ رمضان ہے۔ والدہ صاحبہ میرے لیے لڑکی منتخب کر چکی ہے۔ ایک ماہ کے بعد ان شاءاللہ میں شادی کر ڈالوں گا۔''

بیدار بخت انہیں دیکھتے رہ گئے۔ واقعی غیرت پر چوٹ پڑے تو آدمی بہت کچھ فراموش کرنے پر تیار ہوجاتا ہے۔ اظہر درانی جس کا انتظار چھ سال کرتے رہے۔ اسے چند گھڑیوں میں بھول گئے۔ سخت حیران تھے وہ۔

''سر! بہت مجبور ہیں نازو آپی۔'' اظہر درانی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''مجھے اس سے شکوہ بھی کیا ہے۔ نہ اس میں رواجوں کو توڑنے کا حوصلہ ہے نہ میں ایسا قدم اٹھانے پر تیار تھا وہ میری بنتی تو باپ کی محبت اور شفقت کے سائے میں، نہیں بن سکی تو اس پر الزام کیسا۔ بیدار بخت! اب ہر زندگی تو سکون کے ساتھ نہیں گزارا کرتی۔ ہر دل میں کوئی نہ کوئی خلش باقی رہ جاتی ہے۔ نازیہ اس لیے نہ تھی کہ وہ میرے گھر کی بہار بن کر میرے ساتھ رہتی تقدیر سے شکوہ بھی نہیں ہوسکتا۔ بس اب کیا کہوں تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ میری وجہ سے حیدر خان صاحب نے تمہیں بھی۔۔۔''

''نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے انہیں بہن کہا تھا۔ بس بھائی ہونے کے زعم میں انکل پر حق جمانے کی کوشش کی تھی جو میری حماقت تھی۔ میں بھی تو زندگی بھر وہاں قدم نہیں رکھوں گا۔''

''آج ذیشان اور مائرہ سید مجھے ملے تھے۔ سچ پوچھو بیدار بخت بے حد خوش نصیب ہیں وہ لوگ۔ چاہت کی دولت ان کے پاس ہے۔ میں نے دونوں سے کہا۔ اگر انہوں نے کسی معمولی سی بات پر ایک دوسرے کو چھوڑ دیا تو یہ خدا کی رحمت سے انکار ہوگا۔ انہیں چاہیے کہ وہ جلد از جلد اس رشتے کو مستحکم کرلیں۔''

بیدار بخت کے ذہن میں آسیہ رحمٰن کا ہیولا ابھر آیا۔ وقت رخصت اس کی ڈبڈبائی آنکھیں ان کی نظروں کے سامنے پھرنے لگیں۔ وہ اظہر درانی کو اللہ حافظ کہہ کر کیمپس کے گیٹ کی طرف آگئے۔ ان کی بائیک کا رخ حیدر ولا کی طرف تھا۔ جانے کیوں وہ خود کو اُن راہوں کی طرف جانے سے روک نہ سکے۔

حیدر ولا کے در و دیوار پر سکوت طاری تھا۔ روش کے سارے پودے سر نیہوڑائے کھڑے تھے۔ گلاب یاسمین مرجھا گئے تھے۔ برآمدے میں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ سامنے سڑک پر رفتار آہستہ کر کے کتنی دیر مڑ مڑ کر اس گھر کی طرف دیکھتے رہے۔

اس گھر کی خوب صورتی دیکھ کر کون اندازہ کرسکتا ہے کہ اس گھر میں رہنے والے کتنے کم نصیب ہیں۔ پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔ شب و روز وہ ان گلیوں کے چکر کاٹتے رہے۔ انہیں کبھی منصور خان نظر نہیں

آیا۔ آسیہ کی ایک جھلک دیکھنے کو نہ ملی۔ نہ ناز و آپی نظر آئیں۔ اور نہ ہی لان کی معطر فضا میں حیدر خان کسی کے سنگ قہقہے لگاتے پائے گئے۔

ان کے فون نمبر کا تو کسی کو علم ہی نہ تھا۔ وہ بھی خود میں یہ حوصلہ نہ پا سکے کہ فون کر کے کسی کی خیریت ہی معلوم کر لیں۔

ماہِ رمضان آ گیا۔ اکبر خان لوٹ کر آ چکے تھے۔ اُن کی موجودگی میں ماہِ رمضان پورے اہتمام کے ساتھ آیا تھا۔ سحری کے وقت بیدار بخت کو جگانے میں فروا کو خاصی محنت کرنا پڑتی۔ روزہ رکھنے میں سو سو نخرے دکھاتے۔ امتحان سے فارغ ہو گئے تھے۔ دن بھر گھر میں ہی موجود رہتے۔ نماز پڑھ کر پھر سو جاتے۔ اور دوپہر کو ہی بے دار ہوا کرتے۔ فروا کی شوخ و شریر طبیعت کا اثر پورے گھر کے ماحول پر تھا۔ روزہ رکھ کے بھی وہ چین سے پھرا کرتی۔

ایک دوپہر وہ لپک کر ان کے کمرے میں آئی۔

''اے بھیا جی۔ یہ مائرہ سید کون ہیں؟'' اس کا انداز معنی خیز تھا۔

''کیوں کیا ہوا اُسے؟''

''صبح سے کئی بار آپ کا پوچھ چکی ہیں بھائی جان! کیا ہم سے چوری چوری آپ نے کوئی چکر چلا لیا ہے۔''

''ہشت۔ نان سینس۔ وہ میری کلاس فیلو ہے اور میرے دوست ذیشان بخاری کی منگیتر۔''

''اوہ سوری بھائی جان۔''

''میں نے تمہیں بتایا نہیں وہ تم سے ملاقات کی خواہاں تھی۔ اس نے تمہیں ہی فون کیا ہو گا۔ بات اچھی طرح کی تھی نا۔'' بیدار بخت نے وضاحت چاہی۔

''جی نہیں۔ مجھ سے ملاقات کا انہیں کوئی شوق نہیں۔ وہ تو کسی آسیہ رحمٰن کا میسج آپ کو دینا چاہ رہی تھیں۔'' بیدار بخت کے دل میں کچھ خوش گوار دھڑکنیں جاگ اٹھیں۔

''میں کسی آسیہ رحمٰن کو نہیں جانتا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی فروا۔ میں خود مائرہ سے بات کروں گا۔ یہ سب اس کی شرارت ہے تاکہ تم مجھے ستا سکو۔'' جانے کیوں وہ صاف جھوٹ بول گئے۔

فروا اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر نماز کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تو بیدار بخت نے فوراً نمبر ملایا۔ فون پر اتفاق سے آسیہ ہی تھی۔

انہوں نے جھٹ کہا۔

''آسیہ رحمٰن۔ آپ نے مائرہ سے کیا کہا تھا۔ کیا چاہتی ہیں آپ؟'' جواب میں خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

''میرے دوستوں میں میری ریپوٹیشن بہت اچھی ہے آپ میری شہرت خراب کرنا چاہتی ہیں۔ میں آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''بیدار بخت! میں نے تو مائرہ سید کے ذریعے آپ کو یہ پیغام بھجوانا چاہا تھا کہ ناز و آپی سخت بیمار ہیں۔ اگر ہو سکے تو ایک بار انہیں دیکھ جایئے وہ آپ کو بے حد مس کرتی ہیں۔''

''میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ خدا انہیں صحت یاب کرے۔ میں آ بھی جاؤں تو ان کے دکھوں کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔''

وہ رو پڑی۔ ''کیا اب میں یہ امید کبھی نہ رکھوں کہ زندگی کے اس سفر میں ہمارا اور آپ کا سامنا ہوگا۔''

''نہیں آسیہ رحمٰن۔ دنیا بہت بڑی ہے پھر بھی اتنی بڑی نہیں کہ بچھڑے مل نہ پائیں۔ آپ بس یہ امید رکھیے کہ آپ کے تایا ایک نہ ایک دن ضرور آپ سے آن ملیں گے۔ آپ اپنے خوابوں میں ایک ان دیکھا چہرہ بسا لیجیے۔ جو آپ کے لیے خوشیوں کا پیامبر بن کے آئے گا۔ اور ہنسی خوشی زندگی کے دن پورے کیجیے۔'' جواب میں کئی سسکیاں ایک ساتھ ابھریں۔

''میں کل صبح جناح گارڈن میں آؤں گی۔ آپ کو دیکھے بہت دن گزر گئے ہیں اس گھر کی ویرانی مجھے زندہ درگور کر دے گی۔ آپ سے مل کر آپ سے باتیں کر کے میں روح کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ بیدار بخت! کیا میں اتنی حق دار بھی نہیں ہوں کہ آپ میرا دکھ ہی بانٹ لیں۔''

اب کیا بتاتے اسے کہ اُس گھر کے جہاں انہیں ایک چہرہ دیکھ کر الوہی سکون ملا کرتا تھا۔ وہ کتنے پھیرے لگا چکے تھے۔ ایک جھلک کے لیے کس قدر بے قرار تھے۔ آواز سننے کو ترس گئے تھے۔ لیکن اُسے بتانا نہیں چاہتے تھے۔ جانتے تھے بے نام راستوں پر چلنے سے منزل نہیں ملا کرتی۔ آسیہ کا صبیح چہرہ قدرت کے ہاتھوں نے اس لیے نہ بنایا تھا کہ بیدار بخت سے جدائی کے غم میں اس چہرے کے کھلے گلاب مرجھا جائیں وہ آسیہ کو ہمیشہ اسی روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔

''دکھ بانٹنے تو آیا تھا میں۔ کیا صلہ دیا آپ کے پاپا نے۔ میں وہ سلوک بھول نہیں سکا آسیہ رحمٰن! میں آپ سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھ سکتا۔ معذرت خواہ ہوں نہ آسکوں گا۔''

''او۔ کے تھینکس۔'' اُس نے اتنا کہہ کر فون رکھ دیا۔ بیدار بخت کتنی دیر ریسیور تھامے بیٹھے رہے۔ دیر تک کوئی آواز نہ آئی تو نیچے رکھ دیا۔

اُس کے بعد انہیں قرار ہی نہ آیا۔ اپنے کہے پر پشیمان ہوتے رہے۔ افطاری کے وقت بمشکل ہی گھر پر ٹکے۔ اکبر خان پوچھتے رہے لیکن انہیں بتائے بغیر گھر سے نکل آئے۔ ابھی لان میں موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہے تھے کہ فروا انہیں سے اچانک نازل ہوگئی۔

''کہاں جا رہے ہیں چوری چوری؟'' بیدار بخت چونک گئے۔ جیسے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں۔

''جہاں جا رہا ہوں تم بھی چلو۔'' وہ اچک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بیدار بخت پل کی پل میں حیدر ولا کے قریب پہنچنے کے خواہش مند تھے۔

''بھائی جان! ایسی بھی کیا جلدی ہے ہمارے تعاقب میں تو کوئی نہیں۔''

''تعاقب میں کوئی نہیں ہم کسی کے تعاقب میں ہیں بی بی۔ وہ آگے نکل گیا تو ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔'' اگلی سڑک پر موٹر سائیکل موڑتے ہوئے اچانک انہوں نے منصور خان کو دیکھا۔ منصور خان نے اُن سے پہلے انہیں دیکھ لیا تھا۔ ایک دم اُن کے قریب آ کر انہوں نے گاڑی روک دی۔

''ہیلو پارٹنر۔'' انہوں نے سلیوٹ مارا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ بیدار بخت نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ منصور نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور باہر نکل آئے۔

مسافت کی دھول کے باوجود وہ فل یونیفارم میں بے حد خوب صورت لگ رہے تھے اترتے ہی بیدار بخت سے گلے لگ کر ملے اور پھر استفہامیہ نظروں سے فروا کی طرف دیکھا۔

''یہ میری چھوٹی بہنا فروا ہیں۔'' بیدار بخت بھی مزاح کے موڈ میں تھے۔

''ویری گلیڈ ٹو سی یو۔ مس فروا۔'' انہوں نے اپنا بھاری ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھا دیا۔

''واہ واہ جناب آپ تو یوں انجان بن گئے جیسے ہمیں آپ نے دیکھا ہی نہ ہو پہلی بار ملے ہوں۔''

''بھئی نیا شہر ہے کم از کم یہاں تو پہلی بار ہی ملے ہیں نا اس لیے تعارف بے حد ضروری تھا۔ چلو یار اب گھر ہی چلو۔ سچ تمہاری کمی ہم سب کو محسوس ہوتی ہے۔''

''نو۔ نیور منصور خان۔ انسان کے لیے وہی بہت کافی ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہو چکا۔ تم آجاؤ نا کسی وقت۔''

'ماہِ رمضان میں وعدہ نہیں کر سکتا بس عید کے روز دیکھی جائے گی۔ مس فروا آپ ہی آجایئے نازو آپی اور آس آپ سے مل کر خوش ہوں گی۔''

''چھوڑو یار۔ ملاقات کا شوق ہے تو کل چائنیز میں آجانا۔ میں فروا کو لے آؤں گا۔ ملاقات ہو جائے گی ان لوگوں کی۔ فروا اُدھر نہیں جائے گی۔'' وہ بات ٹالنے لگے۔

فروا ہونقوں کی طرح دونوں کا منہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ بیدار بخت نے پھر یاد دلایا۔

''دیکھو بھائی کل شام چائنیز میں آنا نہ بھولنا۔''

''ٹھیک ہے۔ منتظر رہنا۔''

''ہاں یہ یاد رہے کہ روزہ سب کا ہو ورنہ۔''

''تمہیں خبر نہیں بیدار بخت نازو آپی تو بے حد بیمار ہیں۔ اٹھ کر بیٹھنا بھی محال ہے۔ وہ تو نہیں آسکیں گی۔'' نازو آپی کے بارے میں سن کر وہ تڑپ اٹھے۔ بڑی شفیق ہستی بنی ہوئی تھیں وہ بیدار بخت کے لیے۔ دل مچل سا گیا انہیں دیکھنے کو۔ لیکن انہوں نے نرم جذبوں پر سختی کا بند باندھ دیا۔

''خدا انہیں صحت یاب کرے میں فون پر ان سے بات کرلوں گا۔ انکل کیسے ہیں۔''

''ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اپنی آن سمیت زندہ ہیں۔'' منصور کی مسکراہٹ بجھی بجھی سی تھی۔

''خدا کرے تم پر ان کا مان یونہی قائم رہے۔''

''ہاں بیدار بخت! ہمارے سوا ہے ہی کون جس پر پاپا یوں حق جما سکیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اچھا منصور خان اب میں چلتا ہوں۔ ویسے تم دھواں دھار طریقے سے کہاں سے آرہے ہو۔''

''اپنے یونٹ سے۔ روزہ بھی ایک کولڈ اسپاٹ پر افطار کیا ہے۔''

''پھر چلو کھانا میرے ساتھ کھا لینا۔ میں بھی روزہ کھول کر گھر سے نکل آیا ہوں۔''

''شکریہ۔ پھر کبھی آجاؤں گا۔ پاپا کو فون پر بتایا تھا تاخیر پر پریشان ہو جائیں گے۔'' دونوں اپنی اپنی راہ چل دیے۔ فروا کی سمجھ میں ان کی گفتگو نہ آئی تھی۔ اس نے استفسار بھی نہ کیا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھوم پھر کر حیدر و لاکو دیکھنے کے بعد بیدار بخت گھر لوٹ آئے۔

❁❁❁❁

فروا صبح ہی صبح بیڈ روم کے بجائے انہیں پورٹیکو میں دیکھ کر حیران تھی۔ جبکہ پچھلے پندرہ دنوں سے انہوں نے گھر سے باہر صبح کے وقت قدم نہ رکھا تھا۔

''بڑے بنے ٹھنے ہوئے ہیں بھائی جان۔ کہاں کے ارادے ہیں؟''

ڈارک براؤن پینٹ اور کریم کلر شرٹ میں ان کا جسم بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ دراز قد اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ آج انہوں نے موٹر سائیکل کے بجائے گاڑی نکالی۔

''لگتا ہے کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔ میں بھی آجاؤں بھیا جانی۔'' وہ لجاجت سے بولی۔

''نو پرمیشن۔ ہم آج ایک مہم پر جا رہے ہیں۔'' وہ مسکرائے اور گاڑی نکال کر لے گئے۔

جناح گارڈن میں مخصوص جگہ جا کر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہ آیا۔

''آسیہ رحمٰن میں نے تو انکار کے باوجود آنا ضروری سمجھا۔ تم ہی پیچھے رہ گئیں۔'' وہ مایوس سے ہو گئے۔ تبھی سامنے لائٹ براؤن کپڑوں میں وہ آتی دکھائی دی۔ دور سے ہی پریشان لگ رہی تھی۔ قریب آ کر رک گئی۔

''انکار کرنے کے باوجود آپ کیسے آ گئے؟'' وہ عجیب سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''انکار سن کر بھی آپ کیسے آ گئیں۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بس دھیمے سے مسکرا دیے۔ بیدار بخت کو دل میں کئی کلیاں کھلتی چٹکتی محسوس ہوئیں۔

''کیسی ہیں آپ۔ مجھے کچھ کمزور سی لگ رہی ہیں۔''

''سونے کے پنجرے میں بند پنچھی بھی قیدی ہوتا ہے بیدار بخت صاحب!'' آنسو ٹپ ٹپ نیچے گھاس کے فرش میں جذب ہو گئے۔

بیدار کا دل تڑپ اٹھا۔

''میں کیا کر سکتا ہوں؟'' انہوں نے مجبوری کے احساس کے ساتھ کہا۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس اپنائیت کا احساس آپ کو پا کر ملا تھا وہ بھی آپ نے چھین لیا۔''

''میں نے نہیں انکل حیدر خان نے۔ آسیہ! نازو آپی کیسی ہیں۔''

''رات منصور خان انہیں ڈاکٹر عسکری کے پاس لے گئے تھے۔ بس خواب آور دواؤں کے سہارے رات بھر سوتی رہیں۔ سخت ڈپریشن کا شکار ہیں۔ میں تو۔۔۔ میں تو اُن کی طرف سے بالکل مایوس ہوں کہ کبھی وہ زندگی کی رنگینیوں کی طرف لوٹ بھی سکیں گی یا نہیں۔''

''خدا انہیں معجزاتی طور پر خوشیاں بخشے۔ ہم سوائے دعا کے انہیں دے بھی کیا سکتے ہیں۔'' وہ ان کی طرف دیکھتی رہی۔

''آپ کیسی ہیں آسیہ رحمٰن۔''

''کیا بتاؤں آپ پھر کہہ دیں گے میں کیا کرسکتا ہوں۔'' وہ پھر رونے لگی۔ آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں آنکھیں ہیرے کی طرح چمکنے لگیں تو بیدار بخت کو پہلے دن والی آسیہ رحمٰن یاد آگئی۔ ان آنسوؤں نے ان کا دل پہلی بار موہ لیا تھا وہ متواتر اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''تم روتی اچھی لگتی ہو آسیہ رحمٰن لیکن مسکراتے لب اس سے بھی زیادہ خوب صورت لگتے ہیں، مسکرادو نا۔ بڑے دن ہوئے میں نے وہ مسکراہٹ نہیں دیکھی۔'' ایک دم وہ کہہ گئے۔ ایسی بات انہوں نے پہلے کبھی نہیں کہی تھی۔ بے اختیار ہی ان کے لب ہلے تھے اور غیر اختیاری طور پر یہ بات کہہ دی تھی انہوں نے۔ وہ اور بھی تواتر سے آنسو بہانے لگی۔

''مسکرانے کا اختیار ہی کب ہے۔''

''حق، اختیار، دعائیں، خوشیاں کیا ان سب باتوں کے تم خواب ہی دیکھتی ہو۔ یہ سب کچھ ساتھ دعاؤں کے چھیننا پڑتا ہے۔ دعائیں ہم دیں گے تم ہاتھ بڑھا کر سب کچھ چھین لونا۔ کب تک دیکھتی رہو گی لوگوں کی طرف کہ وہ تمہیں خوشیاں دینے آئیں۔''

''کوئی خوشیاں دینے نہیں آتا بیدار بخت لوگ آتے ہیں اور جدائیوں کے غم دے کر چلے جاتے ہیں۔'' اس سے وہ روتی بسورتی بیدار بخت کے دل میں اتری جارہی تھی۔

''کون دے گیا جدائیوں کے غم؟''

وہ بغور ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ مسکرائے بلکہ تھوڑا سا ہنسے۔

''ہاں، ہاں بتاؤ نا۔''

''آپ اور کون۔ بولیے یوں بھی کوئی منجدھار میں چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ پاپا نے اظہر درانی کی وجہ سے صرف آپ کو نہیں ہم لوگوں کو بھی تو بہت کچھ کہا تھا۔ یوں بھی کوئی اثر لیتا ہے باتوں کا۔ آپ مڑ کر آئے بھی نہیں حال تک نہیں پوچھا۔''

بیدار بخت بدستور مسکرائے جارہے تھے۔ جیسے آسیہ کا اظہار وفا ان کے لیے نئی بات نہ ہو۔

''پگلی۔ جو لوگ دل میں آباد ہوں بھاگ کر کہاں جاسکتے ہیں۔ اتنے دنوں کی جدائی میں ہم نے تو تمہیں ذرہ برابر دور محسوس نہیں کیا۔ تمہیں کیسے یہ احساس ہوگیا۔''

''سچ؟'' آسیہ کا انداز بے حد معصومانہ تھا۔

''آف کورس۔ بولو بھلا ہم تمہارے دل سے دور ہیں آس! زندگی گزارنے کو ایک یقین کافی ہوتا ہے کہ کوئی خلوص کی گہرائیوں سمیت ہمارے لیے ہے۔ ہمارے متعلق سوچتا ہے۔ ہمارے دل میں رہتا ہے۔''

آسیہ کے کپکپاتے نرم و نازک ہونٹوں پر مسکان تھی اور آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے۔

''مجھے تو خبر نہ ہوئی۔ اور آپ۔''

''دیوانی لڑکی! جب ہم ہی بے خبر تھے تمہیں خبر کیسے ہوتی۔ کل جب تم نے بات کرتے کرتے اچانک اللہ حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا تب ہمیں محسوس ہوا کہ ہماری قیمتی شے کہیں کھو گئی ہے۔''

وہ ان کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی تصدیق طلب نظروں سے۔ بیدار بخت نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں بھرپور اعتماد بخشنے کی کوشش کی اور خود ہی پوچھا۔

''آس میں اعتماد کرلوں کہ میں اس دل سے دور نہیں۔''

''جی چاہے تو۔ زبردستی نہیں ہے۔''

'پھر آرہے ہیں نا آپ؟''

''نہیں، آج تو آپ آرہی ہیں چائنیز میں۔ فروا سے ملاقات ہوگی۔''

''فروا کون ہے؟''

بیدار بخت حیران تھے کہ انہوں نے تو خیر یہ ذکر نہیں کیا منصور خان نے بھی ان لوگوں کو کچھ نہیں بتایا۔

''مل کر پتا چل جائے گا کہ فروا میری پیاری سی شریر سی چھوٹی بہنا ہے۔ سنو آس! میں اب حیدر ولا کبھی نہیں آؤں گا۔ تم روزانہ واک کے بہانے ادھر آجایا کرو میں بھی آجاؤں گا اپنے پرابلم، اپنے غم مجھے دے دیا کرو۔ اپنے حصے کی خوشیاں میں تمہیں دے دوں گا۔ ٹھیک ہے نا۔'' صرف زبان ہی نہیں آسیہ کی نگاہیں بھی شکریہ ادا کررہی تھیں۔

کتنی دیر وہ درختوں سے چھنتار کے سائے میں ٹھنڈی اور عطر بیز ہوا کا لطف اٹھاتے رہے پھر اپنی اپنی راہ ہولیے۔

❁❁❁❁

ماہِ رمضان پورے کا پورا بیت گیا۔ فروا کے ساتھ مل کر عید کا چاند دیکھتے ہوئے دل نے چپکے سے کئی دعائیں مانگ ڈالیں۔ ابھی وہ اندر آرہے تھے کہ برآمدے میں پڑے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''بیدار بخت ناز و آپی اب بہت اچھی طرح صحت یاب ہوچکی ہیں سمجھ لو کہ زندگی کی طرف لوٹ آئی ہیں۔ عید کے چاند کی مبارک کے ساتھ تمہیں یہ نوید بھی مبارک ہو۔'' منصور خان نے مطلع کیا۔

''خدا مبارک کرے۔''

''اتنے دنوں بعد آج پہلی بار وہ کچن میں آئی ہیں۔ میں نے تمہاری پسند کی ڈشز کا آرڈر دے دیا۔ یار کل لنچ ایک ساتھ کریں گے۔''

''شکریہ۔ ناز و آپی اور آسیہ کو میری طرف سے مبارک کہہ دینا۔''

''لو وہ آسیہ خود ہی آگئی۔ کرلو بات۔''

''ہیلو۔ آس! نیا چاند مبارک ہو۔''

''آپ کو بھی۔''

'کل عید ہے نا۔ لیکن آس تمہارے دیدار کے بغیر عید کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ کاش حالات اس طرح نہ ہوتے۔ سب سے پہلے میں تمہیں دیکھ سکتا۔''

''ایسا ہوسکتا ہے۔ آپ آجائیں۔ پلیز بخت۔''

''نہیں آس! انکل نے جس انداز میں مجھے نکل جانے کا حکم دیا۔ میں شاید زندگی بھر اس طرف نہ

آسکوں۔"

"تو پھر؟"

"پھر کیا! ہم دونوں عید اس وقت تک نہیں منائیں گے جب تک ایک دوسرے سے مل نہ لیں۔ تم کل آٹھ بجے گارڈن آجانا۔"

"نہیں بخت۔ یہ دن کوئی عام دن تو نہیں۔ پاپا کیا سوچیں گے جبکہ وہ عید کے دن ایک لمحہ کے لیے ہمارا گھر سے باہر جانا پسند نہیں کرتے۔"

"ٹھیک ہے نہ آؤ۔ ہم نے بھی عہد کر لیا ہے۔ نہ نئے کپڑے پہنیں گے۔ نہ بنائیں گے۔ نہ سویاں کھائیں گے نہ دوستوں سے ملیں گے۔ نہ کسی محفلِ رنگا رنگ میں انجوائے کریں گے۔"

"چلیے ایسی ہی پابندیاں مجھ پر بھی لاگو کر دیں۔" وہ سکون سے بولی۔

"اس سے کیا ہوگا۔ سوائے ایک طفل تسلی کے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔"

"میں تو اعتماد کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ میرا دل بڑا بے ایمان ہے۔ بہانوں سے بہلتا نہیں۔"

"ایک بار تو آزما کر دیکھ لیں۔"

"چلیے کر لیتے ہیں اعتبار۔ ہمیں خدا کی ذات پر بھروسہ ہے بس اس کے سہارے چھوڑتے ہیں سارا کچھ۔"

"ٹھیک ہے پرسوں کسی وقت ملاقات ہوگی۔ فون کر کے ٹائم بتا دوں گی۔ اللہ حافظ۔"

"ٹھیک ہے اللہ حافظ۔"

❁❁❁❁

آیا ماں اُسے بلانے آگئیں۔ حیدر خان نے اسے اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔ حیدر خان فون پر اس کی گفتگو سن چکے تھے۔ قہر و غضب کی تصویر بنے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

کس سے ہو رہی تھی تمہاری بات چیت؟"

"جی۔۔۔وہ۔۔۔"

"اُسی سے نا۔ جس سے پرسوں کسی وقت ملنے کا وعدہ کیا ہے تم نے آسیہ! تم ایسی غلط سوچ کی مالک ہوگی میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ میں نے تمام بچوں سے زیادہ تمہیں اہمیت دی۔ اس لیے کہ تمہاری مما کی وفات اس وقت ہوئی جب تم بہت چھوٹی سی بچی تھیں۔ میری توجہ اور محبت کی شدت کے ساتھ ضرورت مند۔ میں تم سے بے اندازہ پیار کرتا ہوں آسی! تمہیں میری غیرت کو چیلنج کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے۔ وہ کبھی نہیں ہو سکتا جو تم چاہتی ہو۔ میں نے تم سب کے بارے میں بُرا تو نہیں سوچ رکھا۔ میں اپنے بھائی کی تلاش میں ہوں۔ میرے بھائی کے بیٹے یقیناً اچھے نوجوان ہوں گے۔ اس لفنگے لڑکے بیدار بخت سے ہزار گنا بہتر۔ جس نے تمہارے دل میں بغاوت کا بیج بو دیا ہے۔ میں ایک منٹ کے لیے اسے اپنے گھر میں برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ آئندہ اس سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ انڈر اسٹینڈ۔

میں ہر مرحلے کو نمٹانا باخوبی جانتا ہوں۔"

ڈبڈباتی آنکھوں میں خوف اور سہم لیے وہ کمرے سے باہر آ گئی۔ رات رو رو کر کٹ گئی۔ وہ سامنے دیوار پر آویزاں پاپا کی تصویر سے مخاطب تھی۔

"پاپا! میں نے آپ سے کچھ مانگا تو نہیں۔ کچھ طلب تو نہیں کیا۔ نہ کوئی بے جا ضد کی ہے۔ میری محدود سی دنیا میں بیدار بخت ہی تو ایک ایسا وجود ہے جس سے مل کر جسے دیکھ کر غم غم نظر نہیں آتا۔ روح بہل جاتی ہے۔ فرحاں و شادماں ہو جاتی ہے۔ پاپا! مجھ پر یہ پابندی نہیں لگائیں۔ خدا کی قسم! میں کبھی یہ خواب بھی نہیں دیکھوں گی کہ بیدار بخت میرا جیون ساتھی ہوگا۔ وہ تو ایک خوب صورت سا احساس ہے جس نے مجھے جینے کا حوصلہ بخش دیا ہے۔ وہ تو ایک یقین ہے جو دل میں جاگزیں ہو گیا ہے۔ بس اسے میرے دل سے نہ نکالیے میں اور کچھ نہیں مانگوں گی پاپا کچھ نہیں۔"

نازو آپی نے اسے زار و قطار روتے دیکھا۔ تو گلے لگا کر خود بھی رو پڑیں۔

"محبتیں روگ بن جاتی ہیں میری آس! کہیں تم تو دل نہیں لگا بیٹھیں کہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ مجھے تمہاری آنکھوں میں بیدار کی تصویر نظر آ رہی ہے۔ میں تمہارے دل میں جھانک رہی ہوں جہاں وہ بڑی شان سے جلوہ افروز ہے۔ پر آس! بے نام راستوں پر چلتے چلتے آخر کہاں تک جاؤ گی۔ واپسی کا سفر بے حد دشوار ہوگا۔ پاؤں چھالوں سے پُر ہو جائیں گے۔ روح تم کی دھوپ میں جھلس جائے گی۔ مت آگے بڑھو۔ اسے دھتکار دو۔ اسے روک دو۔ اس کا ہاتھ جھٹک دو۔ تم دونوں بہت معصوم ہو۔ جدائی کا غم تمہیں تو مار ڈالے گا آس میری جان۔" وہ سسک اٹھیں۔

"نہیں آپی! میں نہیں مروں گی۔ آپ تو مجھ سے زیادہ نرم نازک تھیں۔ اتنا بڑا حادثہ جان پر گزر گیا آپ تو نہیں مریں زندہ ہیں۔ میں بھی زندہ رہوں گی۔ وہ میرے دل میں آباد ہے آپی میں کیوں مروں گی؟"

"پگلی۔" نازو آپی نے اس کی پیشانی چوم لی۔

روز عید تھا۔ دوستوں کی آمد آمد تھی۔ نازو اور آسیہ کچن میں مصروف تھیں۔ آس نے زبردستی نازیہ کو خوب صورت گہرے سرخ رنگ کا بنارسی سوٹ پہنا دیا تھا۔ یہ سوٹ اُن میں سے ایک تھا جو نازیہ نے بڑی چاہ سے خرید کر رکھے ہوئے تھے۔ دل میں اظہر درانی کے سنگ زندگی گزارنے کا احساس سمو کر۔ لیکن خود ابھی تک کل والے لباس میں تھی۔

حیدر خان ابھی تھوڑی دیر قبل نماز عید پڑھ کر لوٹے تھے اور انکل آفندی کے ہاں چلے گئے تھے۔ واپس آئے تو ان کے کئی دوست ساتھ تھے۔ ڈرائنگ روم میں محفل جمی تھی۔ مسرور خان بھی وہیں تھے جبکہ منصور خان کچن میں اُن کے پاس موجود تھے۔ بہنوں کا دل بہلانے کی خاطر چھیڑ چھاڑ کیے جا رہے تھے۔ ابھی آسیہ نے کافی بنا کر پاپا کے پاس بھجوائی تھی۔

مائرہ سید نے فون پر مبارک باد دیتے ہوئے اُسے اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ دوسری کئی سہیلیوں نے فرداً فرداً اس سے بات کی تھی بلکہ کئی ملنے بھی آئی تھیں۔ لیکن وہ وعدوں کی پابند بنی مسکرانے کی حق دار بھی نہ سمجھ رہی تھی خود کو۔ اور پھر رات حیدر خان نے جو کچھ کہا تھا اس نے تو روح تک کو سہما کر رکھ دیا تھا۔ کام

کالج سے تھوڑی فراغت ملتے ہی اس کا دل مچل اٹھا۔ گیلری میں آ کر اس نے ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر کی آوازوں پر غور کیا۔ حیدر خان بدستور اپنے دوستوں سے محوِ گفتگو تھے۔ ابھی اس نے بیدار بخت کو رنگ کرنا چاہا تھا کہ گھنٹی بجی۔ اس نے پہلی بیل پر ہی ریسیور اٹھایا۔

''انتظار تھا نا میرا۔'' بیدار بخت کی گمبھیر آواز کانوں سے ٹکرائی تو ایک دم رو دینے کو جی چاہا۔ وہ خاموش رہی۔

''کل بڑی شد و مد کے ساتھ میں نے تمہاری ہاں میں ہاں ملا دی تھی کہ آج کے دن ملاقات نہیں ہوگی۔ نہیں آس! میں اپنا فیصلہ واپس لیتا ہوں۔ تمہیں دیکھے بنا عید کا دن گزر جائے ناممکن ہے۔ آس! تم سچ مچ میری زندگی کی آس ہو۔ تمہارے بنا سانس لینا دشوار ہے بولو نا! عید کا یہ طویل ترین اذیت ناک دن کیسے گزاروں۔ دیکھو ملنے پر اس قدر پابندی تو نہ لگاؤ ایک پل کے لیے سہی اس چہرے کا دیدار بخش دو۔'' آسیہ جی جان سے لرز گئی۔ اگر پاپا پھر ان کی گفتگو سن لیں۔

کتنی دیر دونوں میں بحث ہوتی رہی۔ بیدار کو یقین تھا وہ آ جائے گی۔ لیکن آسیہ اپنے اندر اتنی جرأت پیدا نہ کر سکی۔

تھوڑی دیر بعد منصور خان اندر آئے تو آتے ہی بیدار کا پوچھا۔

''وہ یہاں نہیں آئیں گے منصور خان۔ پاپا نے انہیں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔''

''تم نے کل تو مجھے بتایا ہی نہیں کہ وہ سچ مچ اب کبھی یہاں نہیں آئے گا۔''

''منصور خان! اگر وہ آ گئے تو پاپا انہیں گولی مارنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے بھیا۔ کل شام وہ جب آپ نے فون مجھے دیا تھا۔ پاپا نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔'' آسیہ روہانسی ہو گئی اور بھاگ کر ان کے سینے سے جا لگی۔ منصور خان خاموش کھڑے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

''اگر بیدار بخت یہاں نہیں آیا تو کھانا میں بھی یہاں نہیں کھاؤں گا۔ تم جلدی سے کپڑے بدل ڈالو۔ اور میرے ساتھ چلو۔''

''نہیں بھیا۔ پاپا۔۔۔''

''وہ تمہیں میرے ساتھ جانے سے روک نہیں سکتے تم فٹافٹ تیار ہو جاؤ ہری اپ۔'' آسیہ نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا وہ حد درجہ سنجیدہ تھے۔ پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ اور کچھ دیر بعد تیار ہو کر منصور خان کے پاس آ گئی۔

❁❁❁❁

نازیہ کو خبر نہ تھی۔ منصور خان آسیہ کو لے کر کس طرف گئے ہیں۔ دوپہر سہ پہر میں ڈھلی اور پھر شام ہو گئی۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں۔ جبکہ حیدر خان مسرور خان کے ساتھ کہیں باہر چلے گئے تھے۔ نازیہ اور آیا ماں لان میں تھیں۔ ایک نوعمر لڑکا آیا ماں کے ہاتھ میں کارڈ دے کر چلا گیا۔ نازیہ نے فوراً کارڈ آیا ماں کے ہاتھوں سے لیا اور اسے کھول کر دیکھنے لگیں۔

''کس نے بھیجا ہے بیٹی کیسا کارڈ ہے؟'' نازیہ کے چہرے پر چھائے تاریک سائے اندھیرے کی وجہ سے آیا ماں سے پوشیدہ تھے۔

''پاپا کے ملنے والوں نے بھیجا ہے شادی کا کارڈ ہے۔'' نازیہ دل پر ہاتھ رکھ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بے دم سی ہو گئیں۔

''خدا وہ دن جلد لائے جب تم بھی اپنے بھائیوں کی شادی کے کارڈ بانٹو۔''

''خدا کرے ایسا ہو۔'' نازیہ بمشکل کارڈ لفافے میں رکھ سکیں۔

''آیا ماں! میں اندر جا رہی ہوں۔ دوپہر تک کچن میں کام کرنا پڑا بہت تھک گئی ہوں۔ مہمانوں کی وجہ سے آرام بھی نہیں کر سکی۔ آس جب آئے تو مجھے جگا دیجیے گا۔'' وہ کارڈ ہاتھوں میں تھامے اندر چلی آئیں۔

آسیہ اور منصور خان رات گئے واپس لوٹے۔ پورا وقت انہوں نے بیدار بخت اور فروا کے ساتھ انجوائے کیا تھا۔ ابھی ابھی پورا شہر گھوم کر اور آئس کریم، ایپل سڈر اور دوسری کئی چیزوں سے دل بہلا کر ہی گھر آئے تھے۔ حیدر خان گیلری میں انہیں مل گئے۔

''تم دونوں سارا دن کہاں غائب رہے۔ کھانے پر بھی موجود نہ تھے۔''

''عید کا دن تھا۔ آسیہ کو اپنی سہیلیوں سے اور مجھے اپنے دوستوں سے ملنا تھا۔''

''وہ سب لوگ تمہیں یہاں مل گئے تھے تمہارا جانا ضروری نہ تھا۔''

''کچھ لوگ ایسے بھی تھے پاپا جو یہاں نہ آ سکے تھے۔ میں ان سے ہی ملنے گیا تھا۔'' آسیہ نے گھبرا کر پہلے پاپا کو پھر منصور خان کو دیکھا۔ دونوں اپنی جگہ اٹل تھے۔

''تم چلے جاتے لیکن آسیہ کا مجھے بتا کر جانا ضروری تھا۔''

''میں آسیہ کا بھائی ہوں پاپا اس کا محافظ۔ اس کا نگہبان اس کا خیال رکھنے والا۔ کیا میں اس پر ایسا کوئی حق نہیں رکھتا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو تم۔ لے گئے تھے تو ٹھیک ہے یہ سب کچھ مجھ پر جتا کر شاید کچھ اور بتانا چاہتے ہو۔''

''ہاں پاپا یقیناً۔ میں اپنی بہنوں کو گھٹ گھٹ کر مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ روشن خیال معاشرے میں رہ کر اپنے لیے تو آزادی کے سارے دروازے کھلے رکھوں اور ان سے زندہ رہنے کا حق چھین لوں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ ہم دونوں بیدار بخت کے گھر گئے تھے تاکہ آپ کے ناروا سلوک کا ازالہ ہو سکے۔''

''منصور خان! تم حد سے بڑھنے لگے ہو۔ اگر تم آسیہ کو لے کر اس کے گھر گئے تھے تو سمجھ لو کہ یہ آخری بار ہے آئندہ کبھی ایسا نہ ہو سکے گا۔''

''آپ نے نازیہ آپی کے معاملے میں اپنا فیصلہ منوا لیا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ آسیہ کو اس کی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق ضرور دیا جائے گا۔ یہ آپ کے ضدی بیٹے کا آخری فیصلہ ہے۔''

''تم۔۔۔ تم منصور خان! تمہاری یہ جرأت کہ میرے سامنے ایسی گستاخی کرو۔ کان کھول کر سن لو۔ مجھے اپنی کہی بات سے زیادہ کچھ بھی عزیز نہیں۔ اس گھر میں رہنا چاہتے ہو تو میرے اصولوں پر چلو۔ ورنہ دفع ہو جاؤ۔''

''اور آپ بھی سن لیں میں یہاں سے جاؤں گا تو اپنی بہنوں کو اپنے ساتھ لے کر۔ آپ جیسے ظالم

باپ کے حوالے کر کے نہیں جاؤں گا۔ تم تیار رہنا آسیہ اور آپی سے بھی کہہ دینا۔ میں صبح ہی تم دونوں کو لے کر چلا جاؤں گا۔'' وہ دھم دھم کرتے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور آسیہ نے جھٹ اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

حیدر خان ساری رات نہ سو سکے۔ سخت غصہ تھا انہیں۔ بے حد ملول تھے وہ، دکھ بھی ہو رہا تھا انہیں جس اولاد کی خاطر ہر خوشی اور چین برباد کر دیا تھا انہوں نے، آج وہ ان کے سامنے آ رہی تھی۔ ان کے فیصلوں کو جھٹلا رہی تھی رد کر رہی تھی۔ ماننے سے انکاری تھی۔ بارہا انہوں نے مسرور خان اور منصور خان سے کہا تھا وہ چاہیں تو اُن کی شادیاں کہیں بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن اُن کے خاندان کی بیٹیاں آج تک غیروں میں نہیں بیاہی گئیں وہ کیسے یہ جرم کر لیں۔ لیکن دونوں یہ تاویل ماننے کو تیار نہ تھے۔ مسرور تو خاموش طبع تھے لیکن منصور خان بڑھ چڑھ کر باتیں بنانے لگے تھے۔ کھلم کھلا بغاوت کر رہے تھے۔ آج وہ علی الاعلان آسیہ کو اپنے ساتھ لے کر بیدار بخت کے گھر پہنچ گئے تھے۔ جو حیدر خان کی نگاہ میں سب سے بڑا مجرم تھا جس نے اُن کی اولاد کو بغاوت سکھا دی تھی۔

ساری رات وہ پریشان رہے۔ سجدے میں گر کر روتے رہے۔ انہیں نازیہ کی زندگی کا، اس کی پریشانی کا احساس بے شک نہ ہو بڑھتی عمر کی فکر ضرور تھی۔ خاندان والے تو عنقا ہو کر رہ گئے تھے۔ کس کا دامن تھامتے وہ۔ منصور خان نے ان کے سامنے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ دونوں بہنوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

''خداوندا کیا یہی وہ اولاد ہے۔ جس کی خاطر میں نے ساری دنیا بھلا دی۔ کیا محبت کرنے والوں کو یہی سزا ملا کرتی ہے جو عمر بھر کے لیے میرا مقدر ہو گئی ہے۔ میں کیا کروں۔ میرے مالک، کہاں جاؤں۔ الٰہی مجھے سیدھا راستہ دکھا دے۔ صراط مستقیم پر چلا دے جو اس دنیا میں میرے سکون کا باعث بن جائے۔''

وہ روتے رہے۔ اشکوں نے دامن بھگو دیا۔ رات کے جانے کس پہر وہ سوئے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ منصور خان کے سامنے جھکنے کا نہیں بلکہ اس کے چیلنج کا جواب اس سختی سے دینے کا جو باپ ہونے کے ناتے اُن کا حق تھا۔

❁❁❁❁

کسی نے دیوانوں کی طرح ان کا دروازہ پیٹا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ایک دم دروازے کی طرف گئے۔ اور دروازہ کھول کر حیران ہو کر سامنے دیکھا۔ جہاں فروا کے ساتھ ویران چہرے اور پریشان حلیے کے ساتھ منصور خان کھڑے تھے۔ مارے گھبراہٹ کے حیرانی کے وہ ایک لفظ نہ بول سکے۔ فروا کا رنگ رخ ان سے زیادہ اڑا ہوا تھا۔ بیدار بخت ایک ٹک انہیں دیکھے گئے۔

''نازو مر گئیں۔ نازو آپی مر گئیں بیدار بخت۔''

لمحہ بھر کے لیے بیدار بخت کو یوں لگا گویا ان کے دل کی دھڑکن بند ہونے لگی ہو۔ پھر زمین و آسمان گھومتے دکھائی دینے لگے۔ اور وہ ہکا بکا سے کھڑے منصور خان کا منہ دیکھتے رہے۔

''نہیں منصور خان! ایسا سنگین مذاق تو نہ کرو۔ ابھی رات ہی تو میں نے ان سے بات کی تھی فون

پر، وہ کیسے مرسکتی ہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم جھوٹے ہو۔'' منصور خان نے اپنا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔

''ہم لٹ گئے ہیں بیدار بخت۔ نازو آپی مر گئیں ہیں۔ وہ ہم سے روٹھ گئی ہیں۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں بیدار۔ شاید تمہارے آنے پر وہ ہم سے من جائیں۔ انہیں تم سے بھی تو حد درجہ پیار تھا۔''

فروا رو رہی تھی۔ بیدار دروازے کے پٹ سے سر ٹکائے ابھی تک امید اور نا امیدی کے درمیان چکرا رہے تھے۔ فروا نے انہیں تھام لیا۔

''بھائی جان! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ چلیے نا۔''

اسی عالم میں بیدار باہر کی طرف آئے۔ پروا اور فروا دونوں ہی ان کے ساتھ تھیں۔ مما اور پپا بھی اپنے کمرے سے نکل آئے تھے۔ تینوں منصور خان کے ساتھ ان کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ جی چاہ رہا تھا اڑ کر وہاں پہنچ جائیں۔

جب یہ لوگ حیدر ولا پہنچے۔ آہ و بکا کا طوفان برپا تھا۔ حیدر خان نازو کے پلنگ کی پٹی پر سر رکھے زار و قطار رو رہے تھے۔ آسیہ بے ہوش تھی۔ مائرہ سیدا اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ مسرور خان برآمدے میں کھڑے دنیا و مافیہا سے بے گانہ نظر آرہے تھے۔ بیدار بخت جونہی وہاں پہنچے دھاڑیں مارتے ہوئے اُن کے گلے جا لگے پھر اندر کمرے میں آئے۔ نازو آپی چہرے پر سکون کی چھاپ لگائے ابدی مسکراہٹ سجائے ہمیشہ کی نیند سو رہی تھیں۔

حیدر خان نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے بیدار بخت تھے۔ وہ ایک بار پھر سسک اٹھے۔

''میں لٹ گیا۔ میں تباہ ہو گیا میرے بچے۔ میری نازو مجھ سے روٹھ گئی۔ تم ہی آجاتے بیدار بخت تم اسے جانے سے روکتے۔ وہ ہم سے خفا ہو گئی ہے۔''

گہرے سرخ بنارسی سوٹ میں ملبوس نازو آپی کہیں سے مردہ لگ ہی نہ رہی تھیں۔ بیدار بخت حیدر خان کے پاس جا بیٹھے اُن کے سینے میں سر چھپا کر رونے لگے۔ بے تحاشا آنسو بہانے لگے۔ رفتہ رفتہ سب لوگ آرہے تھے۔ بیدار بخت وہیں حیدر خان کے پاس بیٹھے تھے۔ جن کے چہرے پر دکھ اور مایوسی کے سیاہ بادل امڈ آئے تھے۔ جن کی آنکھیں سرخ انگارہ بنی ہوئی تھیں اور جو پچھتاوے کی مکمل تصویر بنے تھے۔

شاید آسیہ کو ہوش آ گیا تھا وہ بیدار بخت کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ان کا گریبان تھام لیا تھا۔

''میری آپی کو واپس لے آیئے۔ آپ جھوٹے ہیں۔ آپ نے آپی کو خوشیاں خرید کر لا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ آپ مکر گئے۔ آپ نے بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے یہ گھر ہی چھوڑ دیا۔ تاکہ آپی اپنی ناکام زندگی کے بوجھ تلے دب کر خود ہی مٹ جائیں۔ میں بھی زندہ نہیں بچوں گی میں بھی مر جاؤں گی۔ اتنا بڑا داغ، میرا دل پھٹ جائے گا۔ یہ روگ جان لے لے گا۔'' وہ ایک دم چیخنے لگی۔ منصور خان نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

یہ سانحہ بالکل اچانک ہو گیا تھا۔ بیدار بخت کو خبر ہی نہ تھی۔

رات بے خبری میں گزر گئی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر انہیں نہ پا کر آسیہ جو اُن کے کمرے میں گئی تو وہ چین کی نیند سوئی ہوئی تھیں۔ سرہانے اظہر درانی کی شادی کا کارڈ رکھا تھا اور بس۔

آج اظہر کی شادی تھی۔ اور آج ہی کے دن نازو آپی مر گئی تھیں۔ اظہر درانی کسی غیر کا ہو جائے اس سے قبل ہی نازیہ نے موت کو گلے لگایا تھا۔ نہ کسی سے کچھ کہا تھا نہ سنا تھا بس چپ چاپ مر گئی تھیں۔

جانے کس سے انتقام لیا تھا۔ اپنے برباد دل سے۔ جو ایک ناجائز آرزو کر کے انہیں گردن زدنی قرار دلا بیٹھا تھا، پاپا سے جو روایتوں کی چٹان بنے راہ میں حائل تھے۔ یا اظہر درانی سے جنہوں نے سفاک قاتل بن کر ان کے پاس شادی کا کارڈ بھجوا دیا تھا۔

آسیہ کو سب خبر ہو گئی تھی۔ اور وہ ان گھڑیوں کو کوس رہی تھی جب وہ اور منصور خان زمانے کے ہاتھوں سے خوشیاں چھین لینے کی لگن میں سڑکوں سڑکوں گھوم پھر رہے تھے۔ لطف اٹھا رہے تھے اور نازو آپی پر قیامت کی گھڑیاں آ کر ان پر قیامت برپا کر گئی تھیں۔

نازو کی خاموشی جان لیوا تھی۔ دنیا کی کوئی صدا پُر اثر نہ تھی جو اس جسدِ خاکی میں کوئی حرکت لانے میں کامیاب ہوتی۔

بیدار بخت نازیہ کے کمرے میں کھڑے وہ کارڈ دیکھ رہے تھے۔ جس کے سرورق پر دو دلوں کو ایک تیر میں پرو کر یکجا کر دیا تھا۔ جس کے اوپر نوید مسرت لکھا تھا۔ جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اظہر درانی زندگی کے سفر میں نازیہ کے سوا کسی ہم سفر کا انتخاب کر چکے ہیں۔

یہ تیر نازیہ کے دل کے آر پار ہو گیا تھا۔ گھٹ گھٹ کر جی رہی تھیں پھر بھی انسان تو تھیں۔ اور کچھ نہ کر سکیں۔ زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

بیدار بخت کسی بے چین روح کی طرح اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ انہیں سخت غصہ آ رہا تھا اظہر درانی پر۔ یہ خون ان کے سر تھا۔ انہوں نے ہمیشہ کی جدائی پر مہر آخر لگائی تھی تو نازو کو بے خبر تو رہنے دیتے۔ جھٹ انہوں نے اظہر درانی کا نمبر ملایا۔

''سر! نازیہ آپی نے تو آپ کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ تو بے حد معصوم تھیں۔ یہ خون آپ کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ آپ اپنی دنیا بسا رہے تھے۔ انہیں جینے کا حق تو دیتے۔''

''کیا کہہ رہے ہو بیدار بخت۔ خیر تو ہے۔''

''خیر ہی خیر ہے۔ آپ آرام سے سہرا سجائے سر پر۔ قیامت تو ہم لوگوں پر ٹوٹی ہے۔ وہ مر گئی ہیں سر! جنہیں جلانے کو آپ نے نوید مسرت ادھر بھیجی۔ خوش رہیے۔ شادیانے بجوائیے۔''

''میں نے کیا کیا ہے بیدار بخت۔ مجھے تو خبر ہی نہیں نازو میری زندگی سے دور تھی۔ میں یہ کیسے چاہ سکتا تھا کہ وہ مر جائے۔ میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں بیدار بخت! میں آ رہا ہوں۔ میں وہیں آ رہا ہوں۔'' انہوں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

باہر آئے تو اکبر خان اور ان کی ممبر آمدے میں موجود تھے۔

''آپ کیسے آ گئے پاپا۔''

''ڈرائیور ہمیں لے آیا ہے۔ منصور خان نے بھیجا تھا۔ کچھ سامان وغیرہ منگوانے کے لیے ہم اس کے ساتھ چلے آئے۔ بیٹا تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں اور چلے آئے۔ منصور خان بھی ہمارا بیٹا ہے۔ ہم اس کے غم میں شریک نہ ہوتے؟ کہاں ہیں منصور کے پاپا۔ خدا بڑھاپے میں ایسا صدمہ کسی کو نہ دے۔''

بیدار بخت انہیں اندر حیدر خان کے پاس لے آئے۔ حیدر خان، نازیہ کے پلنگ کے پاس کھڑے بغور انہیں دیکھتے آنسو بہا رہے تھے۔ بیدار بخت آستین سے آنسو پونچھتے حیدر خان کے قریب آئے۔

''انکل! میرے پاپا اور مما آئی ہیں۔''

حیدر خان نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اکبر خان چلتے چلتے لڑکھڑا سے گئے۔ حیدر خان ایک ٹک سامنے دیکھتے رہے۔ بیدار بخت اس عجیب صورت حال پر پریشان ہونے لگے۔ مما جیسے خواب کے عالم میں بڑبڑائیں۔

''حیدر خان۔ یہ آپ ہیں حیدر خان۔''

حیدر خان پر سکتہ طاری تھا۔ اکبر خان بے یقین کے عالم میں سامنے دیکھ رہے تھے۔ دو چار قدم آگے بڑھ آئے۔ حیدر خان بھی ایک دم جیسے کسی خواب سے بیدار ہوئے اور تیزی سے آگے بڑھے۔

''بھائی جان۔ بھائی جان۔'' انہوں نے اکبر خان کے دونوں بازو تھام لیے۔

''آپ کیسے آ گئے بھائی جان۔ میں کس دوراہے پر کھڑا ہوں۔ آپ سے ملنے کی خوشی مناؤں یا آپ کے دامن میں منہ چھپا کر بیٹی کے بچھڑ جانے پر ماتم کروں۔ نازیہ۔ آپ کی بیٹی، میرے جگر کا ٹکڑا میری حور شمائل بیٹی مر گئی بھائی جان۔ آپ ایک روز قبل ہی مل جاتے۔ میں اسے مرنے سے بچا لیتا۔ آپ کی اجازت سے میں اس کی خوشیاں اسے دے دیتا۔'' وہ بے ربط سے کئی جملے بولتے چلے گئے۔

اتنا بڑا انکشاف خود بیدار بخت کے لیے کسی شاک سے کم نہ تھا۔ حیدر خان سے اکبر خان کی راہ و رسم کیسے تھی۔ اکبر خان نے اپنے گھر میں کبھی کسی بھائی کا ذکر تک نہ آنے دیا تھا۔ بیدار بخت حیدر ولا میں آنے سے قبل ہی یہ سن چکے تھے کہ یہ بدنصیب خاندان مدتوں سے اپنے عزیز و اقارب سے جدا تھا۔ وہ پل کی پل میں سب کچھ سمجھ گئے۔ اکبر خان اور حیدر خان گلے لگ کر یوں روئے کہ پتھر کی دیواریں بھی لرز کر رہ گئیں۔ جنازے میں پورا شہر شریک ہوا۔ ویران ویران اجڑے اجڑے اظہر درانی بھی۔ جنہیں اس سانحے کی خبر بیدار بخت نے دی تھی۔ لیکن وہ ابھی تک اس بات سے بے خبر تھے کہ شادی کارڈ اس گھر میں کس نے بھجوایا تھا۔ دراصل ان کی والدہ نے ان کے علم میں لائے بغیر صرف اپنی توہین کا بدلہ لینے کی خاطر وہ کارڈ حیدر خان کے نام بھیجا تھا۔ جو بدنصیبی کی داستان کا حرف آخر بن گیا۔

یہ سانحہ دلوں سے سچ مچ خوشی کا احساس ہی چھین کر لے گیا۔ دل و دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہے۔ نہ ملنے کی خوشی تھی نہ نازیہ کے بچھڑ جانے کا غم۔ بس سکوت و جمود طاری تھا سب پر۔ سوئم تک اکبر خان اپنے خاندان سمیت حیدر ولا میں ہی رہے۔ فروا اور پروا اپنی پیاری سی چچازاد کی دلجوئی میں لگی رہیں۔ بیدار بخت تو بہت پہلے ہی اس پورے خاندان کے لیے دل میں انوکھے اور نرالے جذبات محسوس کرنے لگے تھے۔ اب تو ان سب کو رگِ جان سے بھی قریب سمجھنے لگے۔

آسیہ نے اس صدمے کا گہرا اثر لیا تھا۔ تین دن بعد بھی اسے مسلسل بے ہوشی کے عالم میں رکھا جا رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ پروا خود اس کا ٹریٹمنٹ کر رہی تھیں۔ فروا مسلسل اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اکبر خان اور حیدر خان پرسے کے لیے آنے والے مرد حضرات کو اٹینڈ کر رہے تھے۔ مما نے گھر سنبھال رکھا تھا۔ ایک ایک کا خیال رکھ رہی تھیں۔ بیدار بخت دن میں کئی بار اسے جا کر دیکھ آتے یا منصور

خان کے ساتھ بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتوں سے اُن کا دل بہلانے کی کوشش کرتے۔ جانے کیوں انہیں یقین تھا کہ برسوں حیدر ولا کے مکینوں کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہ آسکے گی۔ اور وہ اس تگ و دو میں تھے کہ جامد سناٹوں کو چیر سکیں۔

اس دن دوپہر کو سب کے ساتھ تھوڑا بہت کھانا زہر مار کرنے کے بعد وہ فروا سے کہہ کر آسیہ کے کمرے میں چلے آئے۔ آسیہ کے لیے سوپ انہوں نے اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔ فروا سوپ کا پیالہ لے آئی۔

آسیہ تکیوں کے سہارے بیٹھی برسوں کی مریض لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، بھنچے ہوئے لب، چہرے پر زردی ہی زردی۔ بیدار بخت کا دل کسی نے جکڑ لیا۔ فروا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر واپس چلی گئی۔ بیدار بخت اس کے قریب آبیٹھے۔ نحیف و نزار سی آسیہ کو بغور دیکھتے۔

''آس! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔'' وہ ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔

''میں تو حیران ہوں اس سانحے کے بعد زندہ رہ جانے پر۔''

''تم نہیں مرو گی آس۔ تمہارے ساتھ ایک اور زندگی وابستہ ہے۔''

''مت کچھ کہیے بیدار بخت! اس گھر کے در و دیوار کے بھی کان ہیں۔ پاپا سب کچھ سن لیں گے۔''

''سنتے رہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔''

''بیدار بخت۔ پاپا تو آپ کو جان سے مار دینے پر تلے تھے۔ یہاں کیسے آنے دیا آپ کو؟''

''وہ مجھے نہیں ماریں گے۔ جانتے ہیں مجھے کچھ ہو گیا تو دوسری بیٹی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔''

''ان کے نظریات میں تبدیلی ناممکن ہے، بلاسے میں بھی کیوں نہ مر جاؤں۔ خدا غارت کرے اس خاندان کو۔ جو ہم سے دور رہ کر بھی ہماری خوشیوں کا قاتل بن گیا ہے۔ مر جائیں سارے۔''

''لاحول ولا۔ بددعائیں نہیں دیا کرتے آس! کیا خبر وہ بے چارے بھی کسی کو جی جان سے عزیز ہوں۔'' ہلکی سی مسکراہٹ بیدار کے لبوں پر کھیل گئی۔

آسیہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے بے اختیار بیدار بخت کو تھام لیا۔

''آپ کو یاد ہے۔ کچھ دن پہلے آپ نے کیا کہا تھا؟''

''تم سے تو بہت کچھ کہہ رکھا ہے آس کیا خبر تم کیا یاد دلانا چاہتی ہو۔''

''آپ نے کہا تھا آس تم بن سانس لینا دشوار ہے۔ یہ سچ ہے نا؟''

''سچ ہے تو اتنے دنوں سے دنیا کا ہر کاروبار چھوڑ کر یہاں موجود ہوں۔''

''آپ نے اپنے حصے کی خوشیاں مجھے دینے کا وعدہ کر رکھا ہے نا۔''

''وہ تو تمہیں پہلی نظر دیکھ کر ہی عہد کر لیا تھا۔ اور کچھ بولو۔''

''بس میں بھی آپ کے بنا ایک پل چین سے نہیں رہ سکتی۔ اپنے حصے کی خوشیاں مجھے بخش دیجیے۔ میں انتقام لینا چاہتی ہوں اپنے پاپا سے۔ میری ناز و آپی جانتی تھیں۔ آپ میری زندگی ہیں۔ آپ مجھے مل گئے تو آپی کی روح کو سکون مل جائے گا۔ بیدار بخت! مجھے بھیک مانگنے سے چڑ ہے لیکن جانے کیوں بار ہا دست سوال آپ کے سامنے پھیلانا پڑتا ہے۔ دے دیجیے نا اپنی محبت کی بھیک۔ یہ ماحول میرے

لیے موت ہے خدارا مجھے رہائی دلا دیجیے۔ ورنہ میں بھی۔۔۔ میں بھی نازو آپی کی طرح۔۔۔''

بیدار بخت کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔

''آس! نازو آپی کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ تمہارے بچھڑے عزیز مل گئے ہیں۔ تم تو ان لوگوں کو اب تک بدعائیں دیے جا رہی ہو۔ الحمدللہ وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

''کہاں ہیں وہ لوگ؟'' آسیہ نے سہم کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''یہیں گھر میں ہی ہیں۔ تمہارے تایا جان بھی۔ ان کے بیوی بچے بھی۔''

''آپ اُن سے ملے۔'' اس نے بے یقینی کے عالم میں سوال کیا۔

''جی ہاں ملا ہوں۔ سب بے حد اچھے لوگ ہیں خصوصاً وہ آپ کے کزن صاحب تو ایک دم ماسٹر پیس ہیں شاہکار قسم کے بندے۔''

آسیہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی۔

''ہوتے رہیں۔ آپ کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں ابھی ابھی پاپا سے یہ بات کہہ دوں گی۔ کیا نازو آپی کو موت کی وادیوں میں دھکیل کر انہیں چین نہیں ملا جو مجھے بھی وہ زندہ درگور کرنا چاہتے ہیں۔ بیدار بخت مجھے آپ پر مکمل یقین ہے۔ آپ کے علاوہ مجھ میں کسی کو قبول کرنے کی سکت ہی نہیں ہے۔''

''آس! دونٹ بی سلی۔ ہوسکتا ہے تمہارے پاپا کا انتخاب مجھ سے بہتر ہو۔'' اُن کے لہجے کی شرارت پریشانی کے غبار میں چھپ گئی۔

''ہوتا رہے۔ دل ہے کسی بزنس مین کی کاروباری مصلحتیں نہیں ساتیں اس میں۔ بس آپ میرا انتخاب ہیں۔''

''یہ تو سچ ہے لیکن میرے پاس تمہارے لیے ایک نقد نذرانہ دل کے سوا کچھ نہیں۔ ابھی تو میں نے صرف مقابلے کا امتحان دیا ہے کیا خبر میرا مستقبل کیا ہو۔ میں تمہیں تحفظ دے سکوں یا نہ دے سکوں۔''

''مجھے صرف آپ چاہئیں۔''

''لگتا ہے تمہارے ان کزن صاحب سے باقاعدہ ڈوئل لڑنا پڑے گا۔ آسیہ! تمہارے پاپا تو ویسے بھی میری جان کے لاگو ہو رہے تھے۔ تمہارے ارادے اُن پر واضح ہو گئے تو۔۔۔ تو جانتی ہو کیا ہوگا۔ جبکہ تمہارے اصلی وارث بھی حیدر ولا میں موجود ہیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''اطلاعاً یہ تو عرض کرو کہ اس پختہ قسم کے فیصلے کی عمر کتنی ہے۔''

''بس جب سے آپ کو دیکھا۔'' وہ ذرّہ برابر مزاح کے موڈ میں نہ تھی۔ خطرناک حد تک سنجیدہ انہیں گھورتی ہوئی بولی۔

''تم نے صحیح سمت ہی دیکھا۔ آس! ہم بیدار بخت خان ولد اکبر رحمٰن خان تمہارے تایا زاد ہی ہوتے ہیں۔ تم ہماری امانت تھیں۔ تمہاری کیا مجال تھی کہ کسی اور جانب دیکھ بھی لیتیں۔''

''اوہ نو۔''

''دس از اے فیکٹ۔ تم میری کزن ہو آس۔ میرے چاچا حیدر رحمٰن خان کی بیٹی۔''

''اوہ گاڈ۔ یہ سب مذاق تو نہیں۔''

وہ اچانک یہ سن کر بے حوصلہ سی ہونے لگی۔ اس کے ہاتھ پیر سنسنا سے گئے۔

''یہ سب کیسے ہوا۔ آپ کو پہلے خبر نہ تھی۔ نہیں نہیں آپ مجھے بہلا رہے ہیں۔''

''آس نازو آپی مرکر یادگار تو بن گئی ہیں۔ بچھڑے ہوؤں کو بھی ملا دیا ہے انہوں نے۔ میں حیدر خان سے ملتا تھا، لیکن حقیقت سے نا آشنا تھا۔ منصور پاپا سے ملتے تھے پر اس رشتے سے بے خبر تھے۔ پاپا میرے دوست کی بہن کی وفات کا سن کر از راہِ اخلاق چلے آئے تھے۔ انہیں تو خبر ہی نہ تھی اسی شہر کے ایک کونے میں اُن کا بھائی آباد ہے۔''

''میں کہاں تھی۔ مجھے خبر کیوں نہ ہوئی۔''

''اب تو اچھی طرح خبر ہوگئی آس! نازیہ آپی یقیناً ایک نہ بھولنے والی چیز ہیں لیکن وقت کے لگائے زخم وقت کی مہربانی سے مندمل ہوتے ہیں۔ وہ جاتے جاتے بھی ہم پر احسان کر گئی ہیں۔ پگلی اب راہ میں کون سی دیوار حائل ہوگی۔ ہم تمہارے ہی ہیں۔''

فروا اندر داخل ہوئی۔

''بھائی جان! آپ انہیں سوپ پلانے آئے ہیں یا۔۔۔''

آخری فقرے شاید اس نے سن لیے تھے۔ بیدار بخت کھسیانے سے ہو گئے۔

''بعض باتیں غذائیت سے بھرپور ہوتی ہیں۔ اتنی توانائی منوں خوراک کھا کر بھی نہیں ملتی جتنی چند الفاظ سن کر مل جاتی ہے۔''

''چلیے اچھا ہے ہمیں بھی خبر ہوگئی۔ آس! ڈیئر اب تو سوپ کی ضرورت نہیں رہی نا۔'' وہ آسیہ پر جھک گئی۔ آس کے اداس چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔

❁❁❁❁

اکبر خان، حیدر خان کے کمرے میں تھے۔ دس دن بعد وہ اپنے گھر چلے گئے تھے۔ ہر شام وہ حیدر ولا آجایا کرتے تھے۔ بیدار بخت کی تقرری ہوگئی تھی۔ ابھی دو دن ہوئے وہ یہاں سے جا چکے تھے۔ نازیہ کی موت کا غم بے حد گہرا تھا۔ حیدر خان صرف اپنے کمرے کے ہو کر رہ گئے تھے۔ نازیہ کی معصوم صورت ہر دم اُن کی نگاہوں کے سامنے رہتی، فریاد کرتی، سوال کرتی۔ خوشیوں کی بھیک مانگتی۔ جتنی دیر وہ تنہا رہتے مینٹل ٹینشن کا شکار رہتے۔ اس لیے اُن کے دوست انہیں ہرگز تنہا نہ چھوڑتے۔ فروا اور پروا بھی اکبر خان کے ساتھ آتی رہتیں۔ اور آسیہ کا دل بہلا رہتا۔

اس شام اکبر خان تنہا ہی آئے اور سیدھے حیدر خان کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

بھائی کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ احترام کے ساتھ انہیں بٹھایا۔ حال احوال پوچھا اور سنا۔

لیکن اکبر خان کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آئے۔

''حیدر۔ مجھے آج تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔''

''کہیے بھائی جان اور ہے بھی کون آپ کے سوا، جس سے دل کی بات کہی یا سنی جائے۔''

''بیدار بخت تمہارے گھر میں کب سے آرہا ہے؟''

''ڈیڑھ سال سے بھی زیادہ عرصے سے۔لیکن آپ نے کیوں پوچھا بھائی جان۔''

''رات اُس کا فون آیا تھا۔'' اتنا کہہ کر اکبر خان لمحہ بھر کو خاموش ہو گئے اور بغور حیدر خان کی طرف دیکھنے لگے۔

''اچھا۔خیریت سے ہے نا۔''

''ہاں۔حیدر خان! تمہیں یاد ہے وہ دن جب تم فروزاں کو لے کر گھر آئے تھے۔''

''بخوبی یاد ہے۔لیکن بیدار بخت کے بارے میں بتاتے بتاتے آپ یہ کیا کہنے لگے؟''

''ہاں وہ بھی بتاتا ہوں مگر پہلے یہی ذکر کروں گا۔بابا جان نے کھڑے کھڑے تمہیں حکم دیا تھا گھر سے نکل جانے کا۔تم چلے گئے۔بابا جان نے برہمی کے اسی عالم میں اپنی پوری جائیداد میرے نام منتقل کر دی۔تمہارے جانے کے بعد گھر میں بہت بڑا انقلاب آ گیا۔تمہاری شادی کی خبر پاتے ہی اعجاز نے ہمشیرہ کو طلاق نامہ ہاتھ میں پکڑا کے گھر کی دہلیز سے باہر کر دیا۔بس یہی بات بابا جان کو مشتعل کر گئی۔ سائرہ انہیں ہم دونوں سے کہیں زیادہ عزیز تھی۔اس کی بربادی کا ذمہ دار انہوں نے تمہیں ٹھہرایا۔جب سائرہ ہمارے گھر آئی تو اس کی گود میں چند ماہ کی بچی بھی تھی۔بابا جان نے تم سے ہمیشہ کے لیے اپنا ناتا توڑ لیا۔بلکہ مجھے بھی بہت بڑی قسم دے کر مجھ سے عہد لیا کہ میں زندگی کے کسی موڑ پر تم سے کوئی ربط نہ رکھوں گا۔میں نے بابا جان کی وفات کے بعد وہ گھر بیچ ڈالا۔باقی ماندہ جائیداد بھی فروخت کر دی اور روپیہ بینک میں جمع کرا دیا۔میں سروس میں تھا۔جائیداد کی دیکھ بھال مجھ سے نہ ہو سکتی تھی۔شہروں شہروں پھرتا رہا۔سائرہ بھی میرے ساتھ رہی۔اس کی بچی کی پرورش میں نے اپنی بچیوں کی طرح کی۔سائرہ کے لیے یہ سانحہ جان لیوا ثابت ہوا۔ہنستا بستا گھر ایک لمحے میں اجڑ گیا۔وہ بمشکل چند سال جی سکی۔اس کے بعد وہ بچی ہمارے پاس ہی رہ گئی۔میں نے اس کی تعلیم و تربیت پر مناسب توجہ دی۔آج کل وہ فوج میں کیپٹن ڈاکٹر ہے۔اس کی تقرری سیالکوٹ میں ہے۔آمنہ ایک بہترین لڑکی ہے۔بابا جان نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں اس کی شادی اپنے بیٹے سے کروں ہم سب کا شروع سے یہی خیال تھا کہ آمنہ میرے بڑے بیٹے دلدار سے بیاہی جائے گی۔لیکن دلدار چار سال قبل باہر جو گیا تو بس وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ایک انڈین لڑکی سے شادی کر کے اس نے مستقل رہائش وہیں اختیار کر لی۔آمنہ بے حد مضبوط اعصاب کی مالک ہے وہ شروع سے خود کو دلدار سے وابستہ سمجھتی تھی لیکن اُس کی شادی کی خبر اس نے زندہ دلی کے ساتھ سنی۔میں بابا جان کی روح کے سامنے شرمندہ تھا۔میں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کر لیا کہ اس کی شادی بیدار بخت کے ساتھ ہو گی۔گو کوئی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی پھر بھی بیدار بخت کو میرے فیصلے کا علم ہے۔لیکن اس کے باوجود کل اس نے فون پر مجھ سے بات کرتے ہوئے مجھے مطلع کیا کہ وہ پروا اور فروا کی شادیاں مسرور خان اور منصور خان سے کرنا چاہتا ہے اور آسیہ کو اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتا ہے۔''

حیدر خان کے چہرے پر سکون کی لہریں پھیل گئیں۔

''یہی تو میری بھی آرزو ہے بھائی جان۔یقین مانیے میری پھولوں جیسی نازک بیٹی میری اس آرزو پر قربان ہو گئی۔بیدار بخت ٹھیک کہتا ہے میں نے عہد کر رکھا تھا۔جیسے ہی آپ مجھ سے ملے، میں

آپ کی یہ امانتیں آپ کے سپرد کردوں گا۔ آپ سے دور رہ کر میں نے بہت سزا پالی ہے۔ مجھے دامن میں پناہ دے کر خوشیاں دے دیجیے۔"

"تم نے میری پوری بات نہیں سنی حیدر خان۔" اکبر خان کا لہجہ تیکھا تھا۔ حیدر خان ان کی بات کے منتظر نظر آنے لگے۔

"بابا جان نے بہت سے فیصلے ایک ساتھ کر دیے تھے۔ تم سے قطع تعلقی کا فیصلہ۔ تمہیں عاق کر دینے کا فیصلہ اور جائیداد میرے نام منتقل کر دینے کا فیصلہ۔ جائیداد میرے نام لگا دینا ان کے بس میں تھا۔ میرے انکار یا اقرار کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ میں کچھ نہ کر سکا۔ لیکن بعد میں، میں نے تمہارے حق کو پہچانتے ہوئے تمہارا حصہ آج تک محفوظ رکھا۔ تمہارے حصے کی رقم بینک میں آج تک موجود ہے۔ باوجود اس کے کہ بابا جان نے تمہیں ہر حق سے محروم کر دیا تھا۔ میں نے وہ سب کچھ تمہیں ہی لوٹا دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم میرے عزاز جان بھائی تھے۔ بابا جان نے تم سے ملنے پر پابندی لگا دی۔ وہ پابندی بڑے غیر متوقع انداز میں ٹوٹ گئی۔ نادانستگی میں جب تم سے ملاقات ہوئی تو تمہاری جوان بیٹی کی لاش میرے سامنے تھی۔ میں وہ پتھر دل کہاں سے لاتا کہ تمہیں اس حال میں چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ خونی رشتہ غالب آ گیا۔ میں نے تمام محبتیں تم کو لوٹا دیں ایک فیصلہ بابا جان نے سائرہ کی بیٹی سے متعلق بھی کیا تھا۔ جس میں دلدار نے تمہاری قائم کردہ روایت پر عمل کیا۔ اور مجھے میرا عہد پورا کرنے میں مدد نہ دی لیکن میں بیدار بخت سے اس کی شادی ضرور کروں گا۔ اگر ایسا نہ کروں تو شاید بقیہ زندگی سکون سے جی نہ سکوں۔ کوئی باطل خیال دل میں لاتے ہی سائرہ میرے سامنے آ جاتی ہے۔ اس کا گھر تمہاری وجہ سے اجڑا۔ اب تمہاری بیٹی اس کی بیٹی کی خوشیوں میں حائل ہو رہی ہے۔ میں آمنہ پر یہ ظلم نہیں کر سکتا۔ بیدار بخت میری لاش سے گزر کر تمہاری بیٹی سے شادی کر سکے گا۔ رہا میری بیٹیوں کا سوال۔ اس معاملے میں میرے ساتھ ساتھ میری بیوی بھی اپنی بچیوں کی حق دار ہے۔ اُسے کسی صورت میں تمہارے بیٹوں کو اپنی بیٹیاں دینا منظور نہیں۔ وہ میرے اس فیصلے پر گھر چھوڑنے پر تیار ہے۔ خود سوچو حیدر خان میں اپنا گھر کیسے اجاڑ دوں۔ لوگ کیا کہیں گے، کیا سوچیں گے، تمہاری بھابھی کے ذہن سے یہ احساس ہی نہیں نکل پایا کہ تم نے اس کی بہن کو ٹھکرا دیا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ جس باپ نے میری بہن کو ٹھکرا دیا میں اس کے بیٹوں پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ اِن کی رگوں میں تمہارے ساتھ ساتھ ایک غیر ملکی عورت کا خون بھی دوڑ رہا ہے۔ اور بے شک یہ وہی عورت ہے جس نے تم سے تمہارا خاندان چھڑا دیا۔ ایک بھائی کی محبت تمہیں ذہنی سہارا دے سکتی ہے، تمہارے حصے کی جائیداد تمہیں لوٹا سکتی ہے۔ لیکن تمہارے بچوں کو قبول نہیں کر سکتی۔ یہ شادیاں نہیں ہو سکتیں۔ تم جلد از جلد اپنے بچوں کی شادیاں جہاں جی چاہے کر دو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔ میں تمہارا پیسہ کل ہی تمہارے نام منتقل کرا دوں گا۔ میں ہمیشہ ایک مخلص اور ہمدرد بڑے بھائی کی طرح تم سے ملتا رہوں گا۔ لیکن تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ بیدار بخت اس گھر میں قدم نہ رکھ سکے۔ تم اسے ٹھکرا دو۔ دھتکار دو۔ اس کے ذہن سے اپنی بیٹی کا خیال مٹا دو۔ مجھے بابا جان کے سامنے کچھ نہ کچھ سرخرو ہونے کا موقع دے دو۔ حیدر خان! آمنہ بن ماں کی بچی ہے۔ آخر تمہاری بھی بھانجی ہے۔ میں اُس کے معصوم دل پر یہ زخم نہیں لگا سکتا۔ بیدار بخت کو ہر حال میں اس سے شادی کرنا ہوگی۔"

صبح روشن

''ٹھیک ہے بھائی جان! سب ٹھیک ہے۔ میں تو آج تک اس وعدے کی ایفائی میں سفاک اور بے رحم بنا اپنی اولاد کے ارمانوں سے کھیل رہا تھا جو میں نے ایک عرصہ قبل آپ سے کر لیا تھا۔ آپ نے اپنا فیصلہ سنا دیا میں نے قبول کیا۔ کاش! آپ چند مہینے پہلے مجھے مل جاتے میری بیٹی میری ناجائز ضد کی بھینٹ تو نہ چڑھتی۔ بات بیدار بخت کی آرزو کی نہیں آپ کی رضا کی تھی۔ مجھے نہ جائیداد چاہیے نہ روپیہ، نہ آپ سے مقابلہ۔ میری کل جائیداد تو میرے یہ بچے ہیں۔ آپ نے مجھے عہد سے آزاد کر دیا اب میں جہان میں ان کی خوشیاں خود تلاش کروں گا۔ بیدار بخت سے آمنہ کی شادی ضرور ہوگی۔ وہ روپیہ میری مرحوم بہن کی مظلوم بیٹی کو جہیز میں دے کر رخصت کر دیجیے گا۔ ان شاء اللہ آپ کو میری ذات سے کوئی شکوہ نہ ہوگا۔ اگر آپ کا مجھ سے ملنا بھی آپ کی زندگی میں کوئی خرابی پیدا کرتا ہو تو میں ایک بار پھر آپ کی جدائی کو گوارا کر لوں گا۔ آپ کو میری طرف سے کوئی پریشانی اب نہ ملے گی۔''

حیدر خان کی آنکھوں سے ٹپکے آنسو ان کے دامن میں جذب ہو گئے۔ اُن کی نگاہوں میں آسیہ کی صورت سما گئی۔ بیدار بخت کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ جانتے تھے ان دونوں کی خوشیاں ایک دوسرے سے وابستہ تھیں۔ لیکن آج وہ کل سے بھی زیادہ مجبور تھے۔

❁❁❁❁

بیدار بخت دوسرے دن ہی چھٹی لے کر گھر آ گئے۔ اکبر خان نے فون پر انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ لیکن وہ سخت ترین احتجاج کی قوت پیدا کر کے گھر آئے تھے۔ پورا دن ماں سے بحث کرتے رہے، قائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ ان کی نگاہ میں آسیہ کا صرف ایک قصور تھا کہ وہ حیدر خان کی بیٹی تھی اور حیدر خان اُن کی بہن کے ارمانوں کا قاتل تھا۔ آمنہ انہیں صرف نند کے ناتے عزیز نہ تھی بلکہ یہ بات اس کے حق میں جاتی تھی کہ وہ ان کے بھائی کی بیٹی بھی تھی۔ غرض والدین میں سے ایک بھی بیدار بخت کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔

بہنیں الگ سہمی سہمی پھر رہی تھیں۔ بیدار بخت گھر کے ماحول سے گھبرا کر حیدر ولا آ گئے۔ مسرور خان اور منصور خان دونوں ہی گھر سے باہر تھے۔ آسیہ کے بارے میں انہیں خبر نہ تھی۔ وہ حیدر خان کے پاس آ گئے۔ بجھے بجھے خاموش خاموش۔ آتے ہی اُن کی آغوش میں سر رکھ دیا۔

''چاچا اب تو مجھے اس گھر کے معاملات میں مداخلت کا مکمل حق ہے نا۔'' کافی دیر بعد انہوں نے کچھ کہنے کی ہمت کی۔

حیدر خان خاموش رہے۔

''چاچا! کیا آپ کا فیصلہ بھی وہی ہے جو میرے پاپا کا فیصلہ ہے؟''

''ہاں بیٹے۔ وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ ان کے آگے سر اُٹھانے کی ہمت کب ہے۔''

''مگر کیوں؟ آخر آپ میرے چاچا ہیں۔ اصولاً میں آپ کا اور آپ میرے حق دار ہیں۔''

''نہیں بیٹے کل تک میں تمہیں حق دار نہیں سمجھتا تھا آج لوگ اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ جب تم نے پہلی بار میرے گھر میں قدم رکھا تھا تو میں سوچا کرتا تھا کہ کاش تم میرے بھتیجے ہوتے آج سوچ رہا ہوں کہ اتنے اچھے نوجوان سے میرا کوئی رشتہ نہ ہوتا۔ میں کسی وعدے کا پابند نہ ہوتا اور چپ چاپ اپنی

بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیتا۔''

''تو میں نے بھی یہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کا عہد کر رکھا ہے۔ مجھے میرے فیصلے سے کوئی ہٹا نہیں سکتا۔''

''کیا کرو گے تم؟''

''اپنے والدین سے مکمل کٹ آف۔''

''نہیں بیٹے! ایسی غلطی نہ کرنا۔ ماں باپ تو ٹھنڈی چھاؤں ہوتے ہیں۔ ان سے بچھڑ کر ہزاروں عیش میسر ہونے کے باوجود سکون کہیں نہیں مل سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بھی خود کو آزما کر دیکھ لوں گا۔''

وہ کمرے سے نکل آئے۔ باہر آسیہ کھڑی تھی۔ وہ سیدھے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ آسیہ لپک کر ان کے پیچھے آئی۔ بیدار بخت کے چلتے قدم رُک گئے۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ برآمدے کے ستون سے لگی وہ کھڑی تھی۔ دونوں خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بیدار بخت اتنی دیر سے خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ آسیہ کی مظلومیت انہیں رلا گئی۔ بیتے دنوں کا ایک ایک لمحہ نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔

''آس! تم سچ مچ ہو تو میری زندگی کی آس۔ لیکن میں نے تمہیں یاس کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ یہ دنیا بے درد ہے، ہوتی رہے۔ بیدار بخت نے جیون کی راہوں پر تم سنگ چلنے کا وعدہ کیا ہے مر کر بھی اسے نبھائے گا۔ بس تم ثابت قدمی سے انتظار کرنا میرا۔ میں چاہوں تو ابھی تمہیں لے کر جا سکتا ہوں۔ ہم عاقل و بالغ ہیں۔ باشعور ہیں۔ اپنا اچھا برا جانتے ہیں۔ لیکن اس زندگی کا کیا فائدہ جو صرف ہم دونوں کی خاطر ہو۔ میں اپنے جذبوں کی سچائی کو آزماؤں گا۔ اپنی وفا کا امتحان لوں گا۔ بس تم دروازہ کھلا رکھنا۔ انتظار کرنا۔ جذبوں کی صداقت ایک دن سب کو مجبور کر دے گی۔ تمہیں تو مجھ پر مکمل اعتماد ہے نا۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے وہ مسکرا پڑے۔

آسیہ نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ اس کی آنکھیں اقرار کی چغلی کھا رہی تھیں۔ ہیرے جیسے چمکتی آنکھیں، وسوسوں کا شکار بھی تھیں لیکن اعتماد کی روشنی کچھ زیادہ تھی۔ الوداعی نظریں اس پر ڈال کر وہ حیدر ولا سے نکل آئے۔

❁❁❁❁

پھر کتنے دن بے کیفی کے ساتھ گزرتے چلے گئے۔ بیدار بخت اپنے گھر سے مکمل طور پر کٹ چکے تھے۔ جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ اکبر خان نہ مان سکتے تھے اور جو کچھ وہ چاہتے تھے بیدار بخت کے لیے اس پر عمل کرنا دشوار تھا۔ ایک سال کے تین سو پینسٹھ دن گزر گئے گھر سے دور ہوئے۔ کیا نہیں تھا ان کے پاس۔ بہترین اکاموڈیشن، اونچا عہدہ، اچھی شہرت، اعلیٰ تعلیم بقدر ضرورت پیسہ لیکن زندگی خالی خالی سی تھی۔

اور آج ذیشان بخاری کی سنگت میں عید کا خوب صورت دن آ کر گزر گیا تھا۔ ذیشان بخاری بھی ان کی طرح حالات کا شکار ہو گیا تھا۔ گھریلو جھگڑوں کی بنا پر اس کی منگنی توڑ دی گئی تھی۔ مائرہ سید اس کی

کزن تھی۔ خالہ اور چچا کی بیٹی۔ دوہرے رشتوں کے باوجود دوری مقدر بن گئی تھی۔ جبکہ بیدار بخت سمجھتے تھے کہ ان کی شادی بھی ہو چکی ہوگی۔ اُسے یوں ناکام و نامراد دیکھ کر نفسیاتی طور پر انہیں تسلی ہوئی کہ اس جہاں میں صرف وہ ہی نہیں شکارِ ستم ہائے جہاں اور بھی ہیں۔

رات گزر گئی۔ انہیں بے حد دکھ تھا۔ عید کا دن تنہا ہی گزر گیا تھا۔ ادھر تو مجبوریوں کے قفل باہر جانے والے دروازوں پر لگے تھے۔ والدین اور بہن بھائیوں کو بھی ان کی یاد نہ آئی تھی۔ سب نے حرف مکرر سمجھ کر انہیں یادوں کی لوح سے مٹا ڈالا تھا۔ اتنا بڑا قصور تو نہیں تھا ان کا۔

دوسرا دن بھی چھٹی کا تھا۔ بے کیفی کے عالم میں گزر گیا۔ ذیشان بخاری اُن سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کے لیے وہی کافی تھا جو انہوں نے از خود بتا دیا تھا۔ انا کے تقاضوں نے انہیں پوری دنیا سے جدا کر رکھا تھا۔ شام کے ڈھلتے سایوں میں ذیشان بخاری نے کرسیاں لان میں رکھوائیں اور انہیں وہیں لے آئے۔

ابھی وہ کوک سے دل بہلا رہے تھے کہ ایک فوجی جیپ سیدھی اندر برآمدے کے قریب جا رُکی۔ دروازہ کھلا اور منصور خان باہر نکلے۔ دوسری طرف سے آمنہ برآمد ہوئی۔ بیدار بخت بوتل سامنے پڑی میز پر رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کی غیر متوقع آمد سے وہ پریشان ہو گئے تھے۔ اس دن انہیں یہاں آنے کی کیا پڑی تھی۔ ذیشان بخاری بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں لپک کر ان کی طرف آئے۔

اور آتے ہی منصور خان نے گرم جوشی کے ساتھ بیدار بخت کو گلے لگا لیا۔

''بڑے استاد نکلے تم تو یار۔ ہم سب سے بچھڑ کر چین سے ہو۔ واہ واہ کیا ٹھاٹھ ہیں نواب صاحب کے۔'' منصور خان کے چہرے پر کسی پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ انہوں نے ذیشان سے ہاتھ ملایا۔ بیدار بخت آمنہ کو منصور خان کے ساتھ دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے۔

''کیا سب نے آپ دونوں کو میرے پاس آنے کی اجازت دے دی؟''

منصور خان نے قہقہہ لگایا۔

''کس کی بات کرتے ہو۔ جو ہماری آتی جاتی سانسوں پر بھی اپنی اجارہ داری رکھنا چاہتے ہیں۔ بخت زمانے کے ہاتھوں سے چھیننا پڑتا ہے اور اس چھین جھپٹ کا سارا کریڈٹ ڈاکٹر آمنہ کو جاتا ہے۔ مجھے تو اپنی اس کزن کے وجود کا علم نہ تھا۔ یہ مجھے میرے یونٹ میں ڈھونڈتی ہوئی آئیں۔''

''لیکن میرا ان سب باتوں سے کیا تعلق۔ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اس گھر اور اس کے ہر فرد سے اپنے آپ کو لاتعلق سمجھوں۔ منصور خان اگر تم یہ سفارش بن کر آئے ہو کہ میں ڈاکٹر آمنہ کو شریکِ حیات مان لوں تو تم غلطی پر ہو۔ آمنہ کو تو میں نے ایک بہن سے زیادہ کبھی کچھ نہیں سمجھا۔ بچپن سے یہ دلدار بھائی سے منسوب رہیں۔ ان کے لیے ذہن میں کبھی کوئی خوب صورت خاکہ کسی حوالے سے آیا تو وہ دلدار بھائی کی ذات تھی میں ان پر اور خود پر یہ ظلم نہیں کر سکتا۔''

''بیدار بخت۔'' آمنہ نے انہیں مخاطب کیا۔

''نہ تم نے ہمیں بٹھایا نہ خیریت پوچھی۔ بس اپنی باتوں میں لگ گئے۔ ہم سے بھی تو پوچھو کہ ہم پر کیا گزری ہے۔''

''کیا پوچھوں سب جانتا ہوں۔ پاپا کا آپ پر کیا کم رعب ہے۔ اب بھی انہوں نے آپ کو بھیجا ہوگا تاکہ مجھے قائل کیا جاسکے۔''

''اوہ بیدار بخت۔ لاحول ولاقوۃ کس بات کا قائل۔ میں ماموں جان کی ہر بات سن چکی ہوں۔ مجھے بے حد شارٹ نوٹس پر گھر بلوایا گیا تھا۔ بات کہی گئی تھی۔ میں نے صاف جواب دے دیا۔ کہہ دیا انہیں کہ اپنے سے تین سال چھوٹے ایسے لڑکے سے جسے میں نے عمر بھر بھائی کی نگاہ سے دیکھا ہے شادی نہیں کروں گی۔ انہوں نے مجھے پیار سے سمجھایا۔ درشتی سے آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے ہر بات کا مناسب جواب دیا اور واپس چلی آئی۔ بیدار بخت! تم میرے بھائی ہو میرے دوست ہو۔ کیا اس معاشرے میں چین سے جینے کا حق صرف مرد حضرات کو ہے۔ عورت کا کوئی حق نہیں۔ اس کے کوئی خیالات، کوئی سوچ، کوئی پسند نہیں۔ ماموں جان نے مجھے پال پوس دیا۔ اس لیے کہ میں اتفاق سے ان کی بہن کی بیٹی تھی۔ اس احسان کا بدلہ یوں میں نہ دے سکوں گی۔ ابھی پچھلے دنوں مجھے خبر ہوئی کہ کیپٹن منصور خان میرے ماموں زاد ہوتے ہیں۔ ماموں جان کے گھر سے اپنا ناتا ٹوٹ جانے پر میں نے ان کے پاس پناہ لی۔ ماموں جان ان سے، مسرور خان سے، آسیہ سے اس لیے متنفر ہیں نا کہ وہ ایک ترک لڑکی کے جو حیدر ماموں کی محبت میں اپنا سب کچھ چھوڑ آئی تھی، بچے ہیں۔ میں نے تو انہیں محبت، ایثار، خلوص اور شفقت کا سمبل پایا۔ میں آئندہ دو دنوں میں نئی زندگی کی طرف قدم رکھنے والی ہوں۔ سوچا اپنے اس کزن کو جو میری وجہ سے بدتر حالات کا شکار ہوگیا، مدعو کرلوں۔''

بیدار بخت نے حیران ہو کر منصور خان کی طرف دیکھا۔ کیا کہہ رہی تھی ڈاکٹر آمنہ۔ کیا منصور خان میں از خود کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت پیدا ہوگئی۔ وہ۔۔۔ وہ تو۔۔۔ فروا۔ بیدار بخت یہ سوچتے سوچتے رک سے گئے۔

''پریشان ہوگئے ہو بیدار بخت۔ بھئی کچھ دینا دلانا ہرگز نہیں صرف دعاؤں کے ساتھ رخصت کردینا اپنی کزن کو۔'' منصور خان مسکرائے جارہے تھے۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔''

''مگر کیا۔ ہاں ہاں جانتا ہوں روایتی بھائیوں کی طرح تمہیں بھی اس ہستی کے بارے میں چھان بین کی ضرورت پڑ گئی ہوگی جسے آمنہ نے اپنے لیے چنا۔ اپنا تو ایمان ہے جس شے کو خلوص و محبت کے ترازو میں تولا اور پرکھا جائے وہ کھوٹی کبھی نہیں ہوسکتی۔ کیپٹن عدنان میرا بہترین دوست ہے تمہیں اس سے مل کر یقیناً خوشی ہوگی۔''

بیدار بخت کا ذہن ابھی تک اس نئی صورت حال کو قبول نہ کرسکا تھا۔

''لیکن وہ پاپا لوگ۔۔۔ وہ کیسے راضی ہوں گے؟''

''واہ یار واہ۔ حد ہوگئی ہے بونگے پن کی۔ بغاوت کرتے ہو، کرنا نہیں جانتے برخوردار۔ آمنہ جب ان سے ناتا توڑ کر آگئی ہے تو ہر فیصلہ خود ہی کرے گی۔ تمہاری طرح تو نہیں دو سال سے گھر سے دور ہو کر بھی پراگریس زیرو بٹا زیرو۔''

''میں کچھ نہیں کرسکا تو تم نے کون سا کدو میں تیر مار لیا۔ چلو اچھا ہے آمنہ تو خوش گوار زندگی کی

طرف قدم بڑھائیں ہم بھی۔۔۔"

"ہاں یار ہم لوگوں کے لیے تو بنے بنائے حالات عرش سے اتریں گے۔" منصور خان نے گہرا طنز کیا نہ صرف بیدار بخت بلکہ اپنے آپ پر بھی۔

دونوں کچھ دیر وہاں ٹھہرے۔ چائے پی اور چلے گئے۔ بیدار بخت نے ذیشان بخاری سمیت نکاح کی تقریب میں شرکت کی۔ کیپٹن عدنان سے مل کر کمپنی میں ایک اچھے انسان کے اضافے کا احساس ہوا اور آمنہ کی خوشیوں پر خوشی بھی ہوئی۔

❁❁❁❁

اس شادی کی خبر خود آمنہ نے فون کر کے اکبر خان کو دے دی۔ اس خبر نے پورے گھر میں حیرت و استعجاب کی لہر دوڑا دی۔ اکبر خان زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ آمنہ کی اس جرأت پر سخت مشتعل تھے۔ اپنے کمرے میں بند دنیا کے سب معاملات سے خود کو جدا کیے ہوئے تھے۔ پورے گھر سے بائیکاٹ تھا اُن کا۔ ان کی انا اور غیرت پر وار کیا تھا۔ اس خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو خاندان سے باہر بیاہی گئی تھی۔ بلکہ خود شادی کر بیٹھی تھی۔ اتنا بڑا قدم تو مرد ہو کر بیدار بخت نے بھی نہیں اٹھایا تھا۔ سخت غصہ تھا انہیں۔ زندگی بھر آمنہ کا منہ دیکھنے کے قائل نہ تھے۔ ہر تعلق توڑ ڈالا تھا انہوں نے۔ اور جب انہیں علم ہوا کہ منصور خان نے بھرپور سپورٹ کی اور بیدار بخت نے شادی میں شرکت کی تھی ان دونوں کے خلاف غم و غصہ اور نفرت بھر گئی ان کے دل میں۔ یقیناً اس سب میں بیدار کا ہاتھ تھا۔ انہوں نے اپنی راہ کی دیوار آسانی سے ہٹا دی تھی۔ دلدار بڑے بیٹے تھے۔ اُن سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ انہوں نے والدین کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ بیدار بخت اکبر خان کی آخری امید تھے۔ انہوں نے بھی ایک بے جا ضد پر اڑ کر والدین سے ٹکر لی ہوئی تھی۔ اکبر خان کو ہر دم یہ خدشہ رہتا کہ حیدر خان نے اُن کی حمایت کی تو وہ آسیہ سے شادی کرنے میں ایک پل بھی تاخیر نہیں کریں گے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی آن پر قائم تھے۔

اور آج انہوں نے اپنے وکیل کو بطور خاص بلایا تھا۔ تاکہ سزا کے طور پر بیدار بخت کو اپنی جائیداد سے بے دخل کر دیں۔ فروا اور پروا دونوں پریشان تھیں۔ بھائیوں کے بغیر گھر کی فضا بالکل بے رونق تھی۔ پچھلے دو دن سخت بے قراری اور اداسی کے عالم میں گزرے تھے۔ فروا کو تو بیدار بخت کی یاد نے ایک پل چین نہیں لینے دیا تھا۔ اکبر خان نے فون لاک کر رکھا تھا تاکہ گھر والے بیدار بخت سے رابطہ قائم نہ کر سکیں وہ انہیں یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ بیدار بخت کی ضد اور ہٹ بے اثر ہے۔ ماں بھی اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔ آمنہ کے اقدام نے انہیں بھی جذباتی کر دیا تھا۔ عمر بھر خدمت کرنے کا یہ صلہ دے گئی تھی آمنہ۔ دو دن سے مسلسل کئی فون آ رہے تھے شب و روز۔ ہر جاننے والا آمنہ کے بارے میں پوچھتا سب کے لیے ان کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ بے خبر ہیں۔

ان تلخ حالات میں پروا اور فروا کا دم گھٹنے لگا تھا۔ موقع پر کر فروا حیدر خان کے پاس چلی آئی۔ اُن کے سینے میں سر چھپا کر جی بھر کے روئی۔ ان سے مدد مانگی۔ لیکن انہوں نے اس معاملے میں خود کو معذور ظاہر کیا۔

"چاچا جانی بھائی گھر کی رونق ہوتے ہیں۔ ان کے دم سے خوشیوں کا احساس زندہ رہتا ہے۔

لیکن ہمارے دامن میں ایسی کوئی خوشی نہیں رہی۔ آپ پاپا سے بات کریں نا۔''

''نہیں بیٹی۔ ان لوگوں کا فیصلہ رد کرنے کے بعد ان سے کوئی بات منوانے کا حق دار نہیں رہا۔ میں بھائی جان سے کچھ نہیں کہوں گا۔''

''چاچا! کیا آپ بھی پتھر کے ہوگئے ہیں۔ آسیہ کی خاموشی بیدار بھائی کی مجبوری۔ کسی چیز کا احساس نہیں آپ کو۔''

''سب خبر ہے لیکن اس کے باوجود بھی میں مجبور ہوں۔ بولنے کا اذن نہیں ہے مجھے۔''

''ٹھیک ہے پھر جو فیصلہ ہم کریں گے اُسے آپ کو قبول کرنا ہوگا۔''

''کیسا فیصلہ بیٹی؟''

''جو بھی ہے آپ کے سامنے ہی ہوگا۔'' وہ کھٹ کھٹ کرتی ان کے کمرے سے چلی آئی۔

❁❁❁❁

مائرہ سید کے گھر سے اس نے بیدار بخت کے آفس کا نمبر ملایا۔

''بھائی جان! ہم لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں رہا۔ جس گھر سے بھائی سب ناتے توڑ جائیں وہاں رہنے والی بدنصیب بہنیں اس طرح ہی زندگی گزارتی ہیں۔ آپ اپنے حق کی جنگ لڑتے لڑتے ہمیں بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلے گئے۔''

''اس لیے نا کہ پاپا ایک نہ ایک دن اولاد کی خوشیاں تسلیم کرلیں گے۔''

''ایسا ناممکن ہے۔''

''اب تو وہ سہارا بھی نہیں رہا۔ تمہیں خبر نہیں آمنہ نے شادی کرلی۔''

''تو کیا ہوا؟ یہ عمل بھی آپ کے کھاتے میں لگایا جارہا ہے۔ پاپا آپ کو عاق کررہے ہیں بھائی جان! مجھے جائیداد تو کیا وہ زندگی بھی نہیں چاہیے جس میں بھائیوں کا وجود شامل نہ ہو۔ اگر آپ کو میرا منہ دیکھنا گوارا ہو تو کل تک گھر آجایئے گا۔'' فروا نے کہا۔

''کیسی باتیں کررہی ہو۔ وہاں میں نہیں آسکتا۔''

''کیا میرے جنازے کو کندھا دینے بھی نہیں آئیں گے۔'' وہ سسک پڑی۔

''فروا۔'' انہوں نے تنبیہی انداز میں کہا۔

''ہاں بھائی جان! دو سال کوئی کم مدت نہیں ہے۔ ایک بار بھی آپ نے فون نہیں کیا۔ ایک بار خط نہیں لکھا۔ ایک بار ملنے نہیں آئے۔ ہم ایسے قصوروار نہ تھے۔ کاش چاچا جان ہم سے ملے ہی نہ ہوتے زندگی تو چین سے گزر رہی تھی۔ دُور ہو جانا بہادری تو نہیں بھائی جان۔ مانتی ہوں آپ حق بجانب ہیں۔ پاپا کی ضد بے جا ہے لیکن سزا ہمیں کیوں مل رہی ہے۔ حیدر خان پاپا کے بھائی ہیں۔ نازو آپی نے مر کر انہیں سرتاپا بدل ڈالا۔ میں بھی۔۔۔ میں بھی یہ قربانی دے دوں گی۔ اپنے پیارے بھائی کے لیے جان دے دینا تو معمولی سی بات ہے۔ جب میں مرجاؤں گی پاپا خود بخود ٹھیک ہوجائیں گے۔''

''فروا۔ میری پیاری بہن تم کیسی باتیں کررہی ہو۔ پگلی پتھر نہیں پگھلا کرتے۔''

''میں پتھروں سے ٹکرا کر اپنا آپ تو ختم کرسکتی ہوں۔ ٹھیک ہے بھیا جب میری قربانی رنگ لائے

اور آپ کی شادی آسیہ سے ہو جائے تو میری قبر پر آ کر پھول ضرور چڑھا دیجئے گا اس خوشی میں۔" اس نے اللہ حافظ کہے بغیر رابطہ کاٹ دیا۔

❁❁❁❁

زندگی بھر ہر چیز ہمارے کہنے سے قبل ہی ہمیں ملتی رہی۔ آپ نے ہماری پرورش ہماری تربیت اور تعلیم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہم سوچتے تھے ہمارے جیسے خوش نصیب دنیا میں ذرا کم کم ہی ہوں گے۔ بڑے بھائی جان نے جو کچھ کیا مانتی ہوں کہ اس میں اُن کی زیادتی بھی شامل رہی ہے۔ لیکن بنیادی وجہ آپ کی ناجائز آرزو تھی۔ آمنہ آپی کو ہم تو پیدائش سے اب تک اپنی بہن ہی سمجھتے ہیں۔ دونوں بھائیوں نے انہیں اپنی بہن سمجھا۔ دوسرے روپ میں کیسے قبول کرتے۔ بس اسی بات سے بچنے کے لیے انہوں نے دیارِ غیر میں اپنی دنیا بسالی۔ پاپا آپ کو مرجانے والوں کی خواہشوں کا بے حد پاس ہے۔ جبکہ میں جانتی ہوں اگر دادا جان زندہ ہوتے تو چاچا جان کو ہر حال میں اپنی شفقت کے سائے میں پناہ دیتے۔ آمنہ آپی اگر آپ کی بھانجی ہیں تو آسیہ بھی تو آپ کا خون ہے۔ کیا ایک شخص کے جرم کی سزا سب کو دینا روا ہے۔ چاچا جان کی عظمت دیکھیے انہوں نے بڑے بھائی سے کیے وعدے کے احترام میں نازو آپی کی زندگی قربان کر دی۔ آپ انہیں بھی جدا کر کے ذہنی طور پر تسلیم نہیں کر سکے۔ کیا دونوں بیٹوں کو خود سے جدا کر کے خوش ہیں۔ آپ ہمیں روایات کی نذر نہیں کر سکیں گے۔ میرے چاچا کے بیٹے آئیڈیل مرد ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ منصور خان میرا انتخاب ہیں۔ لیکن میں جانتی ہوں آپ اپنی انا اور خودداری کے تقاضوں اور ہماری ماں کے انتقام کے ہاتھوں مجبوراً ہمیں کبھی اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق نہیں دیں گے۔ مجھ میں نہ اپنے بھائیوں کے بغیر زندہ رہنے کا حوصلہ ہے نہ اپنی زندگی اپنی مرضی کے بغیر گزارنے کا۔

اللہ حافظ

آپ کی بیٹی فروا

اس نے خط لکھ کر سرہانے رکھا اور سو گئی۔ رات کے کتنے بے درد لمحے گزر گئے۔ جانے کون سا پہر تھا جب سناٹوں کو چیرتی بیدار بخت کی ٹیوٹا کرولا گھر کے گیٹ پر رکی۔ مسلسل بیل نے خاموشی کی دیوار کو توڑ ڈالا۔ چوکیدار نے آنکھیں مسلتے ہوئے گیٹ کھولا۔ اور ایک طویل عرصے کے بعد بیدار بخت کو سامنے دیکھ کر یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولنے لگا۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ برآمدے میں آئے۔ کوریڈور کا دروازہ کھل چکا تھا اور سامنے ہی اکبر خان موجود تھے۔

"بیدار بخت! کیا تمہاری آمد سے یہ سمجھ لوں کہ تم نے میرے فیصلے کو مان لیا ہے۔"

''اتنی رات گئے میں یہاں صرف اپنی بہن کی خاطر آیا ہوں پاپا۔ یہ وقت باخدا ان باتوں کا ہرگز نہیں ہے۔''

''جانتے ہو اس گھر کے دروازے تم پر بند ہیں۔''

''بہن تک پہنچنے کا ہر راستہ مجھ پر کھلا ہے۔ ہٹ جایئے پاپا ایک لمحہ کی تاخیر بھی نقصان دے سکتی ہے۔''

وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ اکبر خان ان کے پیچھے تھے۔ انہوں نے فروا کے کمرے پر رک کر دروازہ ناک کیا تو وہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ وہ وحشت کے عالم میں آگے بڑھے۔ نیلی خواب ناک روشنی میں فروا کا ساکت وجود ان کا دل دہلا گیا۔ اکبر خان اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ کچھ دیر بعد مما، پُروا اور دوسرے کئی لوگ بھی کمرے میں تھے۔ سرہانے سے جھانکتا کاغذ پروا نے اٹھالیا اور کانپتے ہاتھوں میں پورا پڑھ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اکبر خان کو دے دیا۔ سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پروا بھاگ کر فروا کے قریب آئی۔ نبض دیکھی دل کی دھڑکن سنی۔ ماتھا چھوا۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''ہاسپٹل چلو بیٹا۔ ایک منٹ بھی یہاں نہ رکو۔'' اکبر خان کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ مما فروا کی ٹھنڈی پیشانی چوم رہی تھیں۔ زار و قطار آنسو بہاتے ہوئے خوف زدہ ہوتے ہوئے بیدار بخت نے اسے بازوؤں میں اٹھالیا اور باہر آگئے۔ اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اسے لٹاتے ہوئے اس کا سر پروا کی گود میں رکھ دیا۔ دوسری گاڑی میں اکبر خان اور مما تھیں۔ بیدار بخت گاڑی طوفانی انداز میں اڑاتے ہوئے ہاسپٹل کی طرف چلے۔

ایمرجنسی وارڈ میں موجود سب لوگوں کی جان پر بنی تھی۔ فروا کو آپریشن روم میں لے گئے تھے۔ سب اس کی زندگی اور موت دونوں سے ہی بے خبر تھے۔ آئندہ چند لمحوں میں کیا ہونے والا تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی۔ بیدار بخت نے ڈاکٹر فضل کے آفس سے حیدر ولا فون کیا۔ منصور خان کو مطلع کیا۔ مسرور خان سے بات کی۔ اور پھر آپریشن روم کے باہر آگئے۔ پندرہ منٹ بعد آسیہ اور حیدر خان ان کے سامنے تھے۔ ساتھ میں آیا ماں بھی تھیں۔ ڈیڑھ سال بعد ایک دشمن جاں ان کے سامنے تھی۔ جس کی وفا کا سایہ مانگتے مانگتے عمر بیت رہی تھی۔ حیدر خان اکبر خان کے پاس آئے۔

''یہ سب کیا ہے بھائی جان۔ بچیوں نے ہمیں دکھ دینے کی قسم کھا رکھی ہے کیا۔''

''ہم کمزور لڑکیوں کے پاس اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے پاپا۔'' آسیہ زار و قطار آنسو بہا رہی تھی۔

بیدار بخت ستون سے سر ٹکائے خود کو کسی بری خبر کے لیے ہرگز تیار نہ پا رہے تھے۔ پروا ڈاکٹر ہونے کے ناتے اندر آجا رہی تھی۔

آسیہ نے اس کا بازو تھام لیا۔

''پروا آپی! اب کیسی ہے فروا۔ اسے کہہ دیجیے وہ اتنا بڑا ظلم نہ کرے ہم جیتے جی مر جائیں گے۔''

پروا خاموشی کی صدا بنی اندر چلی گئی۔

ڈاکٹر فضل آپریشن روم سے باہر آئے۔

''اکبر خان صاحب ہماری کوشش کامیاب رہی۔ ان شاء اللہ آپ کی دعاؤں سے فروا بی بی بالکل

ٹھیک ٹھاک ہیں۔صبح تک ہوش آجائے گا۔اگر آپ ایک گھنٹہ بھی تاخیر سے آتے تو زہر اپنا اثر دکھا چکا ہوتا۔"

پو پھٹنے سے قبل ہی منصور خان بدحواس سے ہاسپٹل کے احاطے میں داخل ہوئے۔لان میں سبزے کے فرش پر سفید چادر بچھائے اکبر خان اور حیدر خان نماز فجر ادا کر رہے تھے۔بیدار بخت روش پر ٹہل رہے تھے۔منصور خان سیدھے ان کی طرف آئے۔

❁❁❁❁

کیا شعر تھے یار

یہ روز عید تمہارے لیے مرادوں کے
حسین لمحوں کے غنچے کھلا کے لایا ہو
تمہاری عمر فروزاں رہے ستاروں سے
تمہارے ساتھ کسی باوفا کا سایہ ہو

"بڑی زبردست دعا دی تم نے میرے یار۔عید کا دن تو گزر گیا لیکن دعا اثر کر گئی۔" ذیشان بخاری نے خوشی کا مظاہرہ کیا۔

"مبارک ہو یار۔لیکن اس کا جلوہ کیا ہمارے لیے ممنوع ہے کچھ اتا پتا تو دو۔"

"اگر دیکھ لیتا تو پہچانتے رہنا۔"

ذیشان بخاری کو ہوش سنبھالتے وہ بتائے بغیر گھر چھوڑ آئے تھے۔اب انہیں تفصیلاً سب کچھ بتا دیا تھا۔

فروا خدا کی مہربانی اور ڈاکٹروں کی بھرپور توجہ کے سبب بچ گئی تھی۔اکبر خان نے گویا دوبارہ زندگی پالی تھی۔گھر کے باہر فقرا کا اور گھر کے اندر دوست احباب کا ہجوم تھا۔فروا کی بیماری کی خبر سب سے مخفی رکھی گئی تھی۔یہ تقریب حیدر خان کے اعزاز میں تھی جو برسوں بعد بچھڑے خاندان سے آملے تھے۔سب لوگوں سے بھائی کے خاندان کو متعارف کراتے ہوئے اکبر خان بخوشی یہ اعلان کر رہے تھے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اپنے دونوں بھتیجوں سے بصد فخر منسوب کر رہے ہیں اور بیدار بخت کے لیے آسیہ رحمٰن کو اپنے آنگن کی رونق بنا کر سکون محسوس کر رہے ہیں۔

❁❁❁❁

شام کو پھر ذیشان کا فون آگیا۔

"یار! کیا چکر ہے تم جو بالکل ناامید تھے تم نے تو منزل پالی ہم وہی کے وہی رہ گئے۔لگتا ہے تمہیں تو چلّہ کاٹنے کا انعام ملا ہے۔"

"چلّہ کیسا؟" بیدار بخت حیران تھے۔

"بھئی وہ نفس کشی کی مہم کسی طرف نہ دیکھنے کی قسم۔خود کو مکمل طور پر کسی کا امانت سمجھنے کا ظلم جان ناتواں پر۔بس خدا کو تم پر ترس آگیا۔کیا میں بھی وہی نسخہ آزماؤں۔"

"نہیں میں پاپا اور چاچا کو بھیج رہا ہوں تمہارے جھگڑے اب وہی نمٹائیں گے۔یہ چاروں

شادیاں ایک ساتھ ہی ہوں گی۔ عید کا دن جو اتنا تلخ گزرا اس کا ازالہ کسی صورت تو ہونا چاہیے۔ تم نسخہ پورا کرنے بیٹھ گئے تو ایک قیمتی سال ضائع ہو جائے گا۔''

''شکریہ دوست تم نے اچھے وقت میں ہمیں یاد رکھا ورنہ آج کل کون کسی کو پوچھتا ہے۔'' فون کر کے وہ پلٹے۔ سامنے آسیہ کھڑی تھی۔ مسلسل چار دن اس گھر میں ایک ساتھ رہنے کے باوجود اُن دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ بیدار بخت خوش باش مطمئن سے اُس کے سامنے تھے۔

''مس آسیہ رحمٰن! آپ سنجیدگی سے میرے معاملے میں دلچسپی لے رہی ہیں نا۔''

''ہرگز نہیں۔'' آسیہ نے جھٹ کہا۔ وہ بے گانہ سی بنی ان سے مخاطب تھی۔

''وہ کیوں؟''

''صرف اس لیے کہ حالات کا یہ موڑ آپ کا پیدا کردہ نہیں۔''

''تو اور کس کا ہے؟''

''آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ آپ یہ احسان مجھ پر نہ کریں تو آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔''

''مت پکاریں مجھے۔ دو سال سے کہاں تھے آپ۔ یا وہ دن تھے کہ ایک پل جدا ہو کر چین نہیں تھا یا بچھڑ کر مطمئن رہے۔ عید کے دن آپ کا نہ سہی آپ کے فون کا کتنا انتظار کیا میں نے۔''

بیدار بخت ہنس پڑے۔ ''تم نے خود ہی منع کیا تھا۔ اچھا آج یہ بھی پتا چل گیا کہ عورت کے لب جو کچھ کہتے ہیں وہ اس کے دل کی آواز نہیں ہوتی۔ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ خیر ہمارا گواہ خدا کی ذات کے بعد ذیشان بخاری ہے جس نے ہمیں ماہی بے آب کی طرح تڑپتے دیکھا۔''

''بہر حال کچھ بھی ہو۔ فروا کی قربانی سے آپ مجھے مل گئے تو اس میں آپ کی بہادری کون سی ہے۔ یہ اُسی کا احسان ہے۔''

''اچھا۔ یہی بات ہے ٹھیک ہے ابھی اس کا فیصلہ ہوا جاتا ہے۔'' انہوں نے آسیہ کا بازو تھام لیا اور کھینچ کر فروا کے کمرے میں لے آئے۔ جہاں منصور خان فروا کے بیڈ کے قریب رکھے صوفے پر نیم دراز کوئی میگزین دیکھ رہے تھے۔ پروا انجکشن تیار کر رہی تھیں۔ اور فروا چہرے پر بازو رکھے لیٹی ہوئی تھی۔

''منصور خان! آپ ذرا باہر تشریف لے جایئے ہمیں اپنی سسٹر سے ضروری بات کرنا ہے۔'' بیدار بخت نے میگزین ان کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھ دیا۔

''کیا بات ہے یار! کہاں جاؤں میں؟''

''چلو ٹھیک ہے نہ جاؤ۔ ہاں تو فروا بی بی سچ سچ بتائے آپ نے جو یہ حوصلہ اپنے اندر پیدا کیا مر جانے کا۔ اس کا محرک کون سا جذبہ تھا۔''

فروا نے بازو ہٹا کر بیدار بخت کو دیکھا۔

''کون مر رہا تھا۔ کس کا ارادہ تھا مرنے کا؟'' فروا کے زرد چہرے پر ہلکی سی سرخی پھیل گئی۔ اس کی درز دیدہ نگاہی آسیہ اور بیدار بخت دونوں سے پوشیدہ نہ تھی۔

''تم اور کون جس نے جد پشت تک سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ شکر کرو کہ کیس آگے جانے سے بچ گیا ورنہ اس وقت ہوا کھا رہی ہوتیں۔''

''میں نہیں جناب اصلی مجرم وہ ادھر کھڑی ہیں۔'' فروا نے پروا کی طرف اشارہ کیا۔ جو سرنج میں دوا بھر رہی تھیں۔

''وہ کس طرح؟'' تینوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

''جی ہاں۔ انہوں نے ہی تو سکھایا تھا مجھے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ بدستور حیران تھے۔

''دراصل بھائی جان یہ نسخہ مسرور خان نے ان کے لیے ہانگ کانگ سے امپورٹ کیا تھا۔ فرمانے لگیں۔ میں نے ایسا کیا تو تم مجھے نہ سنبھال سکو گی۔ میں ڈاکٹر ہوں بروقت طبی امداد تمہیں پہنچا سکوں گی اور ویسے بھی تم پاپا کی لاڈلی ہو۔'' فروا مسکرا رہی تھی۔ فتح مندی کے احساس سمیت۔

''لو کر لو گل۔ معاملہ اور کا اور نکلا۔ واہ چھپے رستم مسرور خان اینڈ ڈاکٹر پروا اکبر! یہ چکر سارا آپ کا تھا۔ لو بھئی آس! اب تو ہم پر فروا کا احسان صرف تینتیس فیصد درست مانا جاسکتا ہے باقی سرسٹھ فی صد کارنامہ تو ہمارا اپنا ہے۔ ہم اگر روٹھ کر نہ جاتے تو بہنیں کس بہانے سے والدین کو بے وقوف بناتیں۔ کیوں فروا کیا آپ میں جرأت ہوتی کہ آپ لکھ دیتیں۔ میں منصور خان ولد حیدر خان کی خاطر یہ جہانِ فانی چھوڑے جارہی ہوں۔'' فروا نے چادر میں منہ چھپالیا۔

پروا اس سے قبل باہر نکل چکی تھیں۔ منصور مسکراتے ہوئے دوبارہ میگزین میں غرق ہوا چاہتے تھے۔

بیدار بخت باہر نکلتی آسیہ کے پیچھے آئے۔

''جانِ من! دو سال واقعی بہت طویل مدت ہوتی ہے اور وہ دو روز عید کے جو تم سے بچھڑ کر گزارے۔ وہ ہم دونوں کے ذمے واجب الادا ہیں۔ چند دنوں بعد یہ وصولی مکمل انداز میں ہوگی۔ لیکن معلوم ہے سرسٹھ فی صد کارنامہ ہمارا ہے۔ تینتیس فی صد ہماری سسٹر کا۔ آپ تو بس دینے دینے کی پابند ہوں گی۔ کچھ لینے کی نہیں۔''

چلتے چلتے آسیہ نے مڑ کر دیکھا۔ چہرے پر چھائے دھنک رنگ، آنکھوں میں ہیروں جیسی چمک، لبوں کے کھلے غنچے، یہ سب مل کر اس بات کا احساس ہی نہیں دلا رہے تھے کہ روزِ صبح روشن تک پہنچتے پہنچتے کتنے اندھیارے راہ میں آئے۔

بیدار بخت کو یوں لگا کہ عمر ان ہی جلووں میں بیتی تھی۔ جدائی کا کوئی موڑ آیا ہی نہ تھا۔

اسیروفا

بھاری پردہ اٹھا کر وہ اندر داخل ہوئی تو سرفراز خاں کے ساتھ ساتھ میری نگاہیں بھی اس کے سراپے میں الجھ کر رہ گئیں۔ میں سرفراز خاں کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ یہ میری خواب گاہ تھی۔ یہ میرے آرام کا کمرا تھا۔ جس پر میرے شوہر نے لاکھوں نہیں تو بے حساب ہزاروں روپے خرچ کیے تھے۔ بے حد خوش تھی میں آج۔۔۔ بڑا دیالو تھا میرا شوہر۔

وہ گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ اور میں پلنگ کی پٹی پر بیٹھی اس کی ٹانگیں دبا کر اپنے لیے جنت تک جانے کا آسان راستہ تلاش کر رہی تھی۔

جب خدا بخش نے کسی عورت کے آنے کی خبر دی اور حسب معمول اس نے حکم دیا کہ اس عورت کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔

وہ ٹھٹھک کر دروازے میں رُک گئی اور ہم دونوں کی نگاہیں اس کے سراپے میں الجھ گئیں۔ بے حد مفلوک الحال تھی وہ۔ پھٹے پرانے میلے کپڑے، دھول سے اٹا چہرہ، الجھے بکھرے گندے بالوں کی کئی لٹیں اس کی پھٹی ہوئی اوڑھنی سے نکل کر چہرے پر جھول رہی تھیں۔ سردی کے مارے پھٹے ہوئے ہاتھ، بغل میں دبی چھوٹی سی گٹھڑی اور ننگے پیر۔ جو صعوبتوں اور تکلیفوں کی مکمل داستان سنا رہے تھے۔ یہ تھا اس عورت کا حلیہ۔

رنگت سنولائی ہوئی، کھڑی کھڑی ناک میں دونوں طرف لونگ تھے، سونے کے یا چاندی یا پیتل کے اللہ ہی جانے۔

بھینچے ہوئے پپڑی زدہ لب بند کتاب کی مانند لگ رہے تھے۔ لیکن آنکھیں۔۔۔ آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ چمک دار آنکھیں، صاف ستھری آنکھیں، موٹی موٹی آنکھیں، متحیر آنکھیں، پریشان آنکھیں۔

وہ تھوڑی تھوڑی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''رک کیوں گئی ہو۔ آگے آؤ۔'' میرے کھوجی شوہر نے بھاری بھرکم آواز میں حکم دیا تو وہ آگے بڑھ آئی۔

آسمانی قالین پر اس کے میلے قدموں کے نشان بنتے چلے گئے۔ بیڈ سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر وہ رک گئی۔ سہمی سہمی، الجھی الجھی، اس نے نگاہ بھر کر کسی چیز کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ سوائے ہم دونوں کے۔

''کون ہو تم؟''

''ایک ادنیٰ کنیز جناب کی۔'' لب ولہجہ بے حد شستہ تھا۔

''کیا نام ہے؟''

''زہرہ۔۔۔!'' سرفراز خان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

''کہاں سے آئی ہو؟''

''چھمب کلیار سے۔''

''اچھا۔۔۔ کہو کیسے آنا ہوا؟''

''آپ کے پاس آئی تھی سرکار۔۔۔!'' اس کے چہرے پر حیرانی تو اسی طرح چھائی تھی۔ اب امید کا رنگ بھی شامل ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم اپنے پاس آنے والوں کو خوش آمدید کہا کرتے ہیں۔'' سرفراز خان نے سر ہلایا۔

''سرکار! میں نے سنا ہے آپ بڑے دیالو ہیں۔ سخی ہیں، داتا ہیں۔'' سرفراز خان نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''تم کیا لینا چاہتی ہو؟''

''میں عادی فقیر نہیں ہوں سرکار۔ آپ کی سخاوت کے قصے سنے اور آ گئی۔ بس جو سرکار دے سکیں۔ پانچ بچوں کی خاطر بڑے آدمیوں کے آگے ہاتھ پھیلانے کا فن سیکھا ہے زہری نے۔ مایوس نہ لوٹائیے گا سرکار۔ زہری بڑی امیدیں لے کر آپ کے پاس آئی ہے۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' سرفراز خان نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور کروٹ بدل کر رخ اس کی طرف کر لیا۔

میں خاموش بیٹھی رہی کہ مجھے خاموش رہنا ہی تھا۔ خاموش رہنا میری عادت تھی۔ میں تو گزشتہ پچیس سال سے خاموش تھی۔

''ہاں اب بتاؤ اپنے بارے میں۔ ہم سننا چاہتے ہیں کہ تمہیں کن حالات نے یہاں تک پہنچایا۔''

''سرکار۔۔۔!غریب کیا۔۔۔اس کی زندگی کیا۔۔۔اس کی داستان کیا۔۔۔''

''پھر بھی ہمیں بتاؤ تو سہی۔''

''کیا کہوں سرکار۔۔۔!بس عام سی کہانی ہے میری۔غربت کی گود میں آنکھ کھولی۔غربت میں ہی پلی بڑھی۔ماں نے کرم کیا اور بستی کے ایک شریف گھرانے میں سید صاحب کی بیوی کے پاس پڑھانے بٹھا دیا۔بارہ سال کی عمر میں، میں نے قرآن پاک ختم کرلیا تو پھر گھر لوٹ آئی۔ماں کے لیے میری دو روٹیاں شاید بہت بھاری تھیں۔تیرھویں سال اس نے ساتھ والے گاؤں کے ایک دور پرے کے رشتے دار سے میری سگائی کردی۔قادر بخش بھی میری طرح ایک غریب گھرانے کا فرد تھا۔چڑھاوے کا ایک جوڑا اور چاندی کی چوڑیاں اور بالیاں بھی جانے کتنی دقتوں سے لاسکا۔اس کے گھر جانے کے بعد ایک ہفتہ آرام سے گزرا۔قادر خان میرا مرد تھا اپنا مرد۔میں نے پہلی رات ہی یہ عہد کرلیا تھا کہ زندگی صرف اسی کی خاطر ہے۔آٹھویں دن میں نے محنت اور جدوجہد میں اس کا برابر کا ساتھ دینے کے لیے کام کرنا شروع کردیا۔وہ مزدوری کرنے شہر چلا جاتا اور میں وہیں گاؤں میں ہی روزی کے وسیلے ڈھونڈتی اور ساس سسر کا پیٹ بھرتی۔دوسرے سال بیٹی پیدا ہوئی تو قادر نے سال بھر کی جمع کی ہوئی پونجی اس کے عقیقے پر خرچ کردی۔مجھے سارے سال کی محنت وصول ہوگئی۔میرے لیے تو اس کی نگاہ ہی بہت تھی۔اس نگاہ نے میرا حوصلہ جوان رکھا۔بیٹی کو ساس نے سنبھالا اور میں پھر سے کام میں لگ گئی۔قادر شہر سے ہفتے بعد آتا۔محنت مزدوری سے جو کچھ کماتا میرے ہاتھ پر لا رکھتا۔وہ ایک ایک پائی مجھے عزیز تھی۔میں اسے سنبھال کر رکھ لیتی۔میری تھی۔میں ٹالی کے شہتیر کڑیوں اور پکی اینٹوں والا کوٹھا بنانا چاہتی تھی۔یوں تو سرکنڈوں کے اس چھپر کو بھی میں نے اپنے سلیقے سے جنت بنا رکھا تھا۔لیکن کوٹھے کی آرزو تو بڑی مدت سے جب میں چھوٹی سی بچی تھی میرے دل میں بسی تھی۔ایسا کوٹھا سید صاحب کی بہو کا تھا جس کا پکا فرش وہ روزانہ مجھ سے دھلواتی تھی۔جس کی دیواریں سال چھ ماہ بعد پھر نئی ہوجاتی تھیں۔سفید سفید چونے سے۔

میں محنت کرتی رہی، گھر چلاتی رہی، کپاس کی فصل ہو یا گندم کی۔دونوں موسموں میں مجھے بہت کچھ وصول ہوجاتا۔دو بھینسیں بھی میں نے پال لیں جن کا دودھ مکھن بیچ کر اچھا خاصا منافع مجھے مل جاتا۔

قادر نے چار سالوں میں چار بچے مجھے دیے تو کوٹھے کا خواب بھی پورا کردیا۔پندرہ دن گھر رہ کر اس نے خود کوٹھا تیار کرایا اور چلا گیا۔

سرکار!عورت کے وسیع دامن میں مرد صرف اپنی محبت کے چند پھول ڈال دے تب بھی خوش رہتی ہے۔قید میں رہنا اسے پسند ہوتا ہے۔میں بھی قادو کی محبت کے حصار میں رہنا چاہتی تھی۔اب وہ ہفتے کے بجائے پندرہ دنوں بعد ملنے کے لیے آنے لگا تھا کہتا۔

''زہری تُو جانتی ہے نا محنت مزدوری میں کتنی مشقت اُٹھانی پڑتی ہے۔ہر ہفتے چار میل پیدل سفر

کر کے چھمب آنا بے حد مشکل ہے۔ ایک جمعہ اب میں نے آرام کرنے کا سوچا ہے۔''

قادو کی خوشی کے لیے میں تو زندگی قربان کر سکتی تھی۔ میں نے باخوشی اس کے فیصلے کو مان لیا۔ اور چار بچوں کو پال کر ان پر توجہ دے کر میں نے خود کو بہلا لیا کہ یہ بھی اسی وجود کے حصے ہیں اور قادو بھی تو صرف ان کی خاطر ہی مجھ سے اور گھر سے دور ہے۔ اسی اثنا میں یکے بعد دیگرے ساس سسر بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تو گھر اور باہر دونوں کی ذمہ داریاں مجھ پر آپڑیں اور ایک اور بچے نے بھی میرے آنگن میں پاؤں پاؤں چلنا سیکھ لیا۔

قادر تو شاید ماں باپ کی موت کا ہی منتظر تھا۔ ماں کے چالیسویں کے بعد جو گیا تو پھر لوٹ کر نہ آیا۔

تنہا راتیں کسی امید کے سہارے کٹیں تو آسان ہو جاتی ہیں۔ مایوسی کے اندھیروں والی تنہا راتیں کاٹنا عذاب ہے سرکار۔ سارا دن محنت مزدوری کرتی اور شام کو بچوں میں آبیٹھتی۔ بچوں کا چھپر تھی، ان کا سائبان تھی، مجھے تو کام اور ہر دم کام ہی تھا۔

دو سال بعد ایک دن وہ آیا۔ چہرے پر ندامتوں کے سائے لیے۔ بچوں کے لیے ڈھیروں ڈھیر کپڑے لیے۔ کھانے پینے کی چیزیں لیے۔ شہری زندگی نے اسے پہلے والا قادر نہیں رہنے دیا تھا۔ میرا حسن اور جوانی حوادث کی دھوپ کی نذر ہو گئی تھی لیکن وہ کل سے آج زیادہ جوان تھا۔ صاف ستھرے کپڑے، صاف ستھرا چہرہ جس پر فکر و تردد کی ایک لکیر بھی نہ تھی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی میں سب غم بھلا بیٹھی۔ اس نے میرے دامن میں مسکراہٹوں کے چند پھول ڈالے اور میں موم ہو گئی۔ قادر بہاریں بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ لیکن ان بہاروں کی عمر بہت کم تھی۔ آٹھویں دن وہ جلد آنے کا وعدہ کر کے پھر چلا گیا۔ سکھ کی آس دے کر۔ زندگی چند کپڑوں کے سہارے تو نہ گزرتی۔ پھر وہی محنت تھی اور میں۔ اب کے وقفہ دو کے بجائے چار سال ہو گیا۔ چار سال بہت طویل عرصہ ہے سرکار۔ چار سالوں میں بے شمار راتیں ہوتی ہیں اور ہر رات ایک صدی کے برابر۔ اس اثنا میں میری بڑی بیٹی جوان ہو چکی تھی۔ وہ آیا اور بڑی خاموشی سے اس نے میری بیٹی کی شادی اپنی عمر سے بھی زیادہ کے ایک مرد سے کر کے میرے سر سے بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ اس بار میں نے احتجاج کی آواز بلند کی۔ برادری کے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنایا۔ تو اس نے میرے عذر کے جواب میں کہا کہ اگر وہ دور ہے گھر سے، مجھ سے اور بچوں سے تو صرف اچھے دنوں کی خاطر۔ سب خاموش ہو گئے۔ اندر کے حالات کون جانتا تھا۔

جاتے جاتے اس نے مجھے کہا۔ ''زہری۔۔۔! یہ دوری اب تیرا نصیب ہے۔ تُو لاکھ احتجاج کر، پھر بھی عورت ہے۔ میرے مقابلے میں بالکل کمزور۔ میں مرد ہوں۔ جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ میں نے شادی کر لی ہے شہر کی ایک عورت سے جو میرے لیے ہر لحاظ سے بہت بہتر ہے۔ جو میری شریکِ غم اور میرے دو بچوں کی ماں ہے۔''

پکّے کوٹھے کی رنگین چھت مجھ پر آن پڑی۔ میں آنکھیں پھاڑے منہ کھولے اسے دیکھتی رہی۔ سرکار! اب زہری نے بھیک مانگنے کا فن سیکھ لیا ہے۔ لیکن اس دن تو وہ بے حد اناڑی تھی۔ قادر سے محبت کی بھیک نہ مانگ سکی۔ اسے اپنا نہ بنا سکی۔ اسے حق تھا سرکار! بھلا زبردستی کا بھی کوئی ناتا ہے۔ میری قربانیاں میری وفائیں اسے نہ خرید سکیں۔ میرے آنسو یا آہ وزاری اسے کیا موم کرتی۔ وہ چلا گیا۔ ہر ذمہ داری سے آزاد۔ اور میں خاموش رہی۔ بچے میرے تھے کہ میں نے انہیں جنم دیا تھا۔ پال رہی ہوں کہ اس دنیا میں وسیلہ میری ذات ہی ہے نا۔

آج بھی محنت مزدوری کرتی ہوں۔ لیکن پانچ بچوں کو پیٹ بھر روٹی اور کپڑا مہیا کرنا بہت مشکل ہے۔ آپ جیسے بڑے لوگ میری امداد کر دیتے ہیں تو الجھی زندگی کو سلجھانے میں مدد ضرور مل جاتی ہے۔''

وہ پھر رکی۔ پھر بولی۔

''سرکار! بہت دنوں سے آپ کے بارے میں سن رکھا تھا بس اسی لیے آئی ہوں۔ جو ہو سکے تو۔۔۔''

سرفراز خان نے اس کی باتیں سنی ہوں یا نہ۔ میں نے ایک ایک لفظ غور سے سنا تھا۔ ایک ایک لفظ۔ عورت فطرتاً نرم دل ہے۔ شاید مجھے بھی اس کی مظلومیت پر دکھ ہوا تھا۔ لیکن میں نے نم آنکھیں سرفراز خان سے ہی نہیں اس سے بھی چھپالی تھیں۔

''بہت کچھ ہو سکتا ہے زہرہ بہت کچھ۔''

وہ اسے دیکھتی رہی۔

''تم جاؤ۔ نہا دھو کر اپنا حلیہ بدلو۔ اور میرے مہمان خانے کی مہمان بن جاؤ۔ سخت ظالم تھا قادر۔ عورت تو سنبھال کر رکھنے کی چیز ہے۔ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ اور اس قادر سے بھی نمٹ لوں گا۔ مطمئن رہنا۔ محل میں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔'' مسکراہٹ سرفراز خان کے لبوں پر تھی۔ میں خاموش تھی۔ ہنوز اس کے پیر سہلا رہی تھی۔

وہ خوف زدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی نظریں حیرت و استعجاب سے بھر گئیں۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ بڑی شاکی تھیں اس کی نظریں۔ ان نظروں میں میرے لیے بڑے عجیب جذبات تھے۔ میں سمجھ نہ سکی۔

''نہیں نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ آپ بہت غلط سمجھے۔ میں اس قماش کی عورت نہیں ہوں۔''

''عورت کو مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ اس عورت کو جس کی حیثیت میری زندگی میں ایک ملکہ جیسی ہے اور اس عورت کو جو بھکارن کی مانند میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔''

اس نے پہلے مجھے اور پھر اسے دیکھا۔

''تم تو سچ مچ دیالو ہو۔ سخی داتا ہو۔ مگر مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ نہیں۔ مجھے معاف کر دینا کہ میں نے تمہارا وقت ضائع کیا۔ سخی داتا! مجھے ایسی زندگی سے فاقوں مرنا زیادہ پسند ہے۔ ایسے ریشم و

کم خواب کو کیا کروں گی۔ جن کے نیچے میرا ضمیر میری روح کو ہر روز ایک نئی موت سے آشنا کرتا رہے۔"

"بہت ناسمجھ ہو۔ ضمیر کے چکر میں ہو۔ اپنا حلیہ تو دیکھو۔"

"میں اپنے اندر کی خوب صورتی پر نظر رکھتی ہوں۔"

"یہ چیتھڑے سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"ایمان مجھے حرارت دیتا ہے۔"

"چلتے چلتے پاؤں کانٹوں سے پُر ہو جائیں گے۔"

"میں اسے خدا کی عنایت سمجھ کر ہنس کے سہوں گی۔"

"ایک دن لوگ بھیک دینے کے بجائے تمہیں ٹھوکریں ماریں گے۔"

"میں صبر کا جہاد کروں گی۔ یہ ٹھوکریں بھی کھا ہی لوں گی۔"

"پھر سوچ لو۔ ایک بہترین زندگی تمہاری منتظر ہے۔"

"میرے پانچ بچے منتظر ہیں۔ میں آگے کیسے جاؤں؟"

"جانتی ہو میری حدود میں آ کر واپس جانا اپنے بس میں نہیں رہتا۔"

"مت ڈراؤ مجھے۔ میں کمزور عورت نہیں ہوں۔ اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ کمزور تو یہ عورت ہے جسے تم اپنی ملکہ کہہ رہے ہو۔ جو تمہارے سیاہ کرتوت دیکھ کر بھی خاموش ہے۔ میں جا رہی ہوں اللہ حافظ۔" وہ کمرے سے نکل گئی۔

میں اٹھی۔ باہر آئی۔ میرو طویل برآمدے کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ "میرو۔۔۔! گودام سے کچھ اناج لے جاؤ اور اس عورت کو دو اور یہ کچھ رقم بھی۔" میں نے سو سو کے کئی نوٹ اسے تھما دیے۔

میں برآمدے میں ہی کھڑی رہی۔ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ کیا تھی وہ بھکارن۔۔۔؟ بہت عظیم۔۔۔ بہت حوصلہ مند۔۔۔ بہت بہادر۔ سرفراز خان کو میں نہیں ایک زمانہ جانتا تھا۔ بڑے بڑوں کا پتہ یہ نام سن کر پانی ہو جاتا تھا۔ خوش نصیب بھی تھی کہ شیر کی کچھار سے صحیح سلامت لوٹ گئی تھی۔ کلمۂ حق کہنا بڑا دشوار کام ہے لیکن اس نے سب کچھ کہہ دیا۔

کیا تھی وہ عورت! دنیا کی نظروں میں ایک حقیر بھکارن۔ لیکن میری نظروں میں ایک عظیم عورت۔ جاتے جاتے وہ مجھے بھی آئینہ دکھا گئی تھی۔ اپنے چہرے کے پس منظر میں مجھے اپنا ماضی اور حال بھی ساتھ ساتھ نظر آ رہا تھا۔ بیس پچیس سال پہلے کے واقعات۔ بیس پچیس سال کے دوران کے واقعات۔ میرو ہانپتا کانپتا واپس آیا۔ اناج کی گٹھڑی اس کے سر پر تھی اور روپے اسی طرح مٹھی میں۔ مجھے ایک اور شاک لگا۔ زبردست حیرت ہوئی۔

"یہ کیا ہے؟ کیا وہ اتنی جلدی صادق گنج سے نکل بھی گئی؟"

''بی بی جی! وہ جا رہی تھی۔ گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر میں نے اُسے جالیا۔ مگر اس نے کوئی بھی چیز لینے سے انکار کر دیا۔''

''انکار کر دیا۔۔۔!'' ایک چھوٹی عورت کے اتنے بڑے ظرف کا اندازہ مجھے نہ تھا۔ دولت میں تو بڑی کشش ہے۔ لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ ایک بے مایہ بے سہارا عورت نے ایک مال دار عورت کا نذرانہ ٹھکرا دیا تھا۔ اس کی اتنی جرأت۔۔۔ مجھے غصہ نہیں پیار آ گیا۔

میں مسکرا دی اور پیسے اس کے ہاتھ سے لے کر اندر کمرے میں آ گئی۔

❁❁❁❁

سرفراز خان کے لیے یہ کوئی سانحہ تھا نہ حادثہ۔ نہ باعثِ مسرت واقعہ۔ اس کے معمول میں یہ بات بے حد غیر اہم تھی لیکن میری بظاہر پرسکون زندگی طوفان کی نذر ہو گئی تھی۔ میں صادق گنج کے معروف جاگیردار نواب زادہ سرفراز خان کی خاندانی بیوی تھی۔ واقعی میری حیثیت کسی ملکہ سے کم نہ تھی۔ لیکن ایک راہ چلتی حقیر عورت مجھے کمزور کا خطاب دے کر کس آسانی سے رخصت ہو گئی تھی۔ کیوں کمزور بنی تھی میں۔ کیوں کمزور تھی میں؟ یہ سوال اندر ہی اندر مجھے کھائے جا رہا تھا۔ دو دن سے سخت سردی تھی۔ آسمان کا سینہ سیاہ بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ ٹھٹھری ہوئی فضا میں میرے لیے تو اداسی ہی رچی بسی تھی۔ میں اپنی خواب گاہ میں قید تھی۔ ایک نوکرانی مسلسل میرے سرہانے موجود تھی۔ گھر کا سارا نظام اسی طرح ہی چل رہا تھا۔ میری ناز برداریوں میں کوئی کمی نہ تھی۔

کل ہی موسمِ سرما کی چھٹیاں ہوئی تھیں۔ میری اکلوتی بیٹی شانزہ چھٹیاں گزارنے گھر آ گئی تھی۔ بڑے گھر کے اپنے ادب آداب تھے۔ صبح گیارہ بجے وہ چند لمحوں کے لیے مجھ سے ملنے آئی تھی۔

میری بیس سالہ بیٹی میری طرح حسین بھی تھی اور ذہین بھی۔ وہ اسی سال ایم۔اے پریویس میں داخلہ لے کر لاہور چلی گئی تھی۔ ایک گھنٹہ وہ میرے پاس بیٹھی رہی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں سناتی رہی۔ اور میں سنتی رہی۔ شاید ان ہی باتوں میں دل بہل جائے۔ لیکن دل ہر دم تو قابو میں نہیں رہتا۔ کبھی کبھار سرزنش بھی بن جاتا ہے۔ دل نہ بہلا۔ شانزہ کچھ دیر بعد اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں نے خود کو اعلیٰ پائے کے مصنفوں کی کتابوں میں گم کرنا چاہا۔ مگر اس میں بھی ناکام رہی۔ کتابیں شیلف میں ٹھونس دیں۔ باہر نکل آئی۔ گھنگھور گھٹاؤں نے آسمان کی نیلگوں فضاؤں کو جانے کہاں چھپا دیا تھا۔ خاموشی حرزِ جاں بن رہی تھی۔ میں اوپر کی منزل پر چلی آئی ٹھنڈی یخ ہواؤں نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ میں نے سیاہ قیمتی اور گرم شال اپنے اردگرد لپیٹ لی۔ منڈیر کے قریب کھڑی دور دور تک با آسانی دیکھ سکتی تھی۔ صادق گنج کا وہ حصہ بھی جہاں سرفراز خان نے ایک دنیا آباد کر رکھی تھی۔ رنگ برنگے آنچل، لہراتے آنچل، کھلکھلاتے چہرے میرے سامنے تھے۔ وہ سب کی سب آنگن میں جمع تھیں۔ بے فکری سے قہقہے لگا رہی تھیں۔ سامنے وسیع و عریض برآمدے میں میز

کرسیوں کے ارد گرد بیٹھی کھانے پینے کا شغل کر رہی تھیں اور میں خاموشی سے ان سب کو دیکھ رہی تھی۔

میں تو بیس بائیس سال سے ہی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس وقت سے جب جذبے جوان تھے۔ امنگیں زندہ تھیں۔ لہو گردش میں تھا۔ اور جذبۂ رقابت بھی ساتھ ساتھ رواں دواں تھا۔ میں تو تب سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

زہرہ نے ٹھیک ہی کہا تھا میں کمزور عورت ہوں۔ نفس کی غلام ہوں نا۔ نفس پر قابو نہ پا سکی۔ بس صلے میں بہت کچھ دینا پڑ گیا۔ لوگ جانتے ہیں میں کتنی بڑی عورت ہوں۔ نواب زادہ سرفراز خان کی بیوی۔ ایک عالم مجھ سے آگاہ ہے۔ شہر کی تقریبات میں میری شمولیت مدعو کرنے والوں کے لیے باعثِ فخر بن جاتی ہے۔ اخبار والے میری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتے ہیں۔ ہر عمل اخبار کی اہم ترین چیز بن جاتا ہے۔ میری شخصیت خواتین کے لیے مثالی شخصیت ہے۔ میری قسمت پر رشک کیا جاتا ہے لیکن میں جو کچھ ہوں اپنے آپ کو میں خود ہی جانتی ہوں کہ میں کیا ہوں؟

ایک کھوکھلی عورت۔ نہ تن میرا ہے نہ من۔ پھر بھی زندہ ہوں جھوٹے بہانوں پر۔ بودے حیلوں پر۔ اس محل نما گھر میں کوئی بھی تو ایسا نہیں جسے میں حالِ دل کا شریک بنا سکوں۔ مجھے معمولی سا زکام ہو جائے بیسیوں ڈاکٹر میرے لیے بلائے جاتے ہیں۔ خادماؤں کی ایک لمبی قطار میرے ایک لفظ کی منتظر ہوتی ہے۔ دواؤں کے ساتھ غذاؤں کے بھی ڈھیر لگا دیے جاتے ہیں۔ کبھی طبیعت زیادہ ہی خراب ہو جائے تو تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ سب سے اوّل ہوتا ہے۔ اور نواب زادہ سرفراز خان میرے ساتھ ایک لاؤ لشکر، نوٹوں کے بنڈل، ضروریات زندگی کی وافر مقدار کسی صحت افزا مقام پر بھیج کر اپنے فرائض سے سرخرو ہو جاتا ہے۔ روزانہ فون پر خیریت دریافت کر کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں مطمئن ہو کر اپنی رنگین دنیا میں مگن رہتا ہے۔

لیکن کیا یہ سب کچھ۔۔۔ یہ انداز۔۔۔؟ روپے پیسے کا زیاں، چیزوں کا بے جا مصرف میری روح کے زخم مندمل کر سکتا ہے؟ میرے اندر کی پیاس بجھا سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔

ریشمی کفن میں لپٹا میرا وجود تو سکون پا ہی نہیں سکا۔

نہ صادق گنج کے وسیع محل میں، نہ ملتان میں موجود سرفراز منزل میں، نہ مری کے حسین مرغزاروں میں، نہ پشاور کے گرد و نواح میں، نہ کراچی کے ہنگامہ پرور ماحول میں۔ پھر بھی اکثر میں خوش نظر آتی ہوں۔ جب میری بیش قیمت ساڑھی اور نادر زیورات پر اہلِ محفل کی نظریں جمی ہوتی ہیں پھر بھی میں خوش نظر آتی ہوں۔

جب مجھے بڑی بڑی تقریبات میں چیف گیسٹ کے طور پر مدعو کیا جاتا ہے۔

پھر بھی میں خوش ہوتی ہوں۔ جب فیتا کاٹ کر افتتاح کر رہی ہوتی ہوں۔ میں تو خوش ہی رہتی ہوں۔ اور تو اور ابھی سامنے صحن میں بکھری رنگا رنگ قیامتوں کو دیکھ کر بھی خوش ہی تھی نا۔

''مما۔۔۔مما۔۔۔!!'' میں نے مڑ کر دیکھا۔
شانزہ میرے پیچھے کھڑی مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی نظریں بھی میری نظروں کے تعاقب میں تھی۔ وہ شکستہ سی لگ رہی تھی۔
''یہاں کیوں آ گئیں آپ۔۔۔؟ آپ کی طبیعت کتنی خراب ہے۔ اور یہاں اتنی ٹھنڈی ہوا۔۔۔''
''لیکن اس ہوا کا ایک جھونکا بھی ایسا نہیں جو میرے دل کو ٹھنڈک دے سکے۔'' میں نے سوچا۔
''مما۔ یہ سب کیا ہے؟'' شانزہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔
''کچھ نہیں بیٹی۔ صادق گنج کا معمول ہے اور کیا ہے؟ یہ سب کچھ ماضی بھی ہے اور حال بھی۔''
''میں تو یہاں ایک پل بھی سکون سے نہیں رہ سکتی ماں۔ تم یہاں کب سے ہو؟ کیسے جی رہی ہو؟'' اس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔
شانزہ کو میں نے ہمیشہ صادق گنج کے در و دیوار سے دور رکھا۔ اس کے لیے یہ سب بالکل نیا تھا۔ لیکن وہ جانتی تو سب کچھ تھی۔ میرا ہاتھ تھام کر وہ مجھے نیچے لے آئی۔ زینہ طے کر کے ہم ہال میں آئے تو سامنے ہی شاہنواز کھڑا تھا۔ شکار کا لباس زیب تن کیے۔ کندھے پر بندوق لٹکائے شاہنواز۔ میری نند کا اکلوتا بیٹا۔ اپنے ماموں کی طرح خوب صورت اونچا لمبا مرد۔ رومی شہزادوں کی طرح سرخ اور سفید جسم۔
''آداب مامی جان!'' وہ میرے آگے جھکا۔
''اوہ ہیلو۔ شانزہ بیگم کب آئیں آپ؟'' شاہنواز کی نگاہیں شانزہ کے وجود میں الجھی تھیں۔ میں سٹپٹا گئی۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
''سوری۔۔۔'' شانزہ بے حس و حرکت میرے پہلو میں کھڑی رہی۔ شاہنواز نے ایک نظر اسے دیکھا اور یوں ظاہر کیا گویا اس نے اس حرکت کو کوئی اہمیت نہ دی ہو۔
''شکار کے لیے جا رہا تھا۔ سوچا جانے سے پہلے مامی جان کی دعائیں لیتا جاؤں۔''
میں مسکرا دی۔ ''اچھا کیا بیٹے۔''
شانزہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا ''کیسا شکار؟''
''بن کی ہرنیوں کا۔'' شاہنواز نے اطمینان سے جواب دیا۔
''اچھا۔ کیا شہر میں نایاب ہو گئی ہیں؟''
شاہنواز اونچی آواز میں ہنس دیا۔
''کیا خوب۔ ہرنیوں کا کیا تعلق شہر سے۔ ہاں چڑیا گھر میں مل بھی جائیں تو میرا ان سے کیا کام۔ شکار تو وہی اچھا لگتا ہے جس کے لیے تگ و دو کرنا پڑے۔''
''خیر، خدا آپ کو کامیاب کرے۔''

میں شاہنواز کے ساتھ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی اور شانزہ باہر نکل کر جانے کہاں چلی گئی۔

❁❁❁❁

دس چھٹیاں گزرتے دیر ہی کیا لگی۔ شانزہ کو گئے دو دن بھی گزر گئے۔ پھر وہی میں تھی اور میرے اندر کی تنہائیاں۔ آج کسی ہمدم کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی جو میرے اندر کے دکھ بانٹ سکتا۔

ماں ایک ایسی ہمدم تھی جس کی جھولی میں میں اپنے سارے غم ڈال سکتی تھی۔ لیکن موت کے بے نیاز فرشتے نے اسے کب کا اگلی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ اور تو کوئی نہ تھا۔ شاہنواز کی والدہ شاید مجھ سے بھی زیادہ تنہا تھی۔ مجھ سے بھی زیادہ دکھی۔ سرفراز کے دوستوں کی بیویاں سب کی سب میری ہمدرد تھیں۔ خیر خواہ تھیں، میرا احترام کرتی تھیں لیکن ہر ایک تو دلداری کے فن سے آگاہ نہیں ہوتا۔ شانزہ میری بیٹی تھی۔ میری مخلص۔ مجھ پر جان چھڑکنے والی۔ لیکن یہ غم اسے بتانے والے تو نہ تھے۔ اس کے ننھے منے دل کو ایسے صدمے سے کیسے دوچار کرتی۔

میں پھر بستر پر پڑ گئی۔ سرفراز خان گلبدن خانم کے ساتھ کوئٹہ چلا گیا۔ گلبدن کو برف باری دیکھنے کا شوق تھا۔ جاتے سمے وہ میرے پاس آیا۔ رسمی طور پر الوداعی الفاظ کہے سنے اور روانہ ہو گیا۔

''گلزار'' میں رونق نہ رہی۔ راجہ اندر جو یہاں نہ تھا۔

❁❁❁❁

پورے آٹھ دن بعد دھوپ نکلی تھی۔ چمک دار سنہری دھوپ۔ ملازمہ نے میری بڑی سی کرسی آنگن میں پھولوں کی کیاری کے قریب لا رکھی۔ میز پر صبح کے سارے اخبار، چند ایک خواتین کے رسالے۔ میں وہیں آ بیٹھی۔

جاگیر سے چند عورتیں مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ آ کر نیچے زمین پر بیٹھ گئیں۔ ان میں میرو کی ماں رحیمن بھی تھی۔ اکثر مجھ سے ملنے آیا کرتی تھی۔ اس کا گھر جھمپ میں موجود ہماری وسیع جاگیر میں تھا۔

''بی بی جی! زہری آپ کے پاس آئی تھی؟''

میں نے چند لمحے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے یاد آیا۔

''ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میرے پاس تو نہیں البتہ سرفراز خان کے پاس۔۔۔''

''بی بی جی۔۔۔ لوگ بڑے نمک حرام ہیں۔ آپ کا نمک کھا کر بھی آپ سے دغا کرتے ہیں؟''

''وہ کیسے؟''

''اسے صفورہ نے بھیجا تھا۔''

صفورہ ایک مزارعے کی بیوی کا نام تھا۔ مجھے بہ خوبی اس کا علم تھا۔

''زہری بے چاری غریب عورت ہے بی بی جی۔ صفورہ نے اسے دھوکے سے بھیجا کہ نواب صاحب تمہیں بہت کچھ دیں گے۔ وہ غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ اصل میں نواب صاحب پچھلے دنوں

کپاس کی فصل کا حساب کتاب کرنے گئے تھے تب انہوں نے زہری کو دیکھا تھا اور صفورہ سے کہہ دیا تھا۔ وہ بے چاری تو بے خبری میں چلی آئی۔ واپس آ کر میرے گلے لگ کر روئی کہ وہ بمشکل اپنی عزت بچا کر آئی ہے۔ اب اس نے جھمپ کی رہائش بھی چھوڑ دی ہے۔ اپنے بچوں کو لے کر ایک اور گاؤں میں چلی گئی ہے۔"

"کون سا گاؤں؟"

"بیری والا۔"

"مگر کس لیے؟"

"بی بی جی! وہ غریب لیکن غیرت مند عورت ہے۔ غریب کے پاس ہوتا ہی کیا ہے ایک عزت کے علاوہ۔"

"سنو رحیمن مائی! اب تم جاؤ تو زہرہ کو میرے پاس بھیج دینا۔"

"نہیں بی بی جی۔ وہ ادھر نہیں آئے گی۔"

"نہیں۔ اسے کہہ دینا کہ جس عزت کی حفاظت کرتے ہوئے اس نے جھمپ چھوڑ دیا ہے اس کی حفاظت کا ذمہ میں نے لیا ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"میں نے رحیمن کو کچھ رقم بھی دی کہ وہ خود ہی زہرہ کو یہاں لے آئے۔ پھر کتنی دیر دوسری عورتوں سے گفتگو کرتی رہی۔ ہر عورت کسی حاجت کے تحت میرے پاس آئی تھی۔ میں نے ممکنہ امداد کی اور وہ چلی گئیں۔

اور وہ آ گئی۔

"پہلی نظر میں تو اسے پہچان ہی نہ سکی۔ میرے تصور میں تو اس دن والی مفلوک الحال عورت تھی۔ آج اس کا انداز اور تھا۔ سرفراز خان قدر شناس تھا۔ جوہر شناس تھا۔ اس نے زہرہ کے حسن کا اندازہ خوب لگایا تھا۔ آج اس نے کاٹن کا آسمانی رنگ کا سادہ اور ارزاں کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ لنڈے سے خریدی ہوئی قرمزی رنگ کی جرسی اور اونی شال۔ وہ کسی طور اس دن والی بھکارن نہ لگ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے ایئر کنڈیشنڈ روم میں ہی بلوا لیا تھا۔

"آؤ زہرہ۔۔۔!" وہ دروازے میں رک کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرے پکارنے پر اس نے سلام کیا اور جھجکتی ہوئی اندر بڑھ آئی۔

میں نرم و گداز صوفے پر نیم دراز تھی۔ سیدھی ہو بیٹھی اور اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔

"نہیں بی بی! مجھے اپنی حیثیت کا اندازہ خوب ہے۔"

میں خاموش رہی۔

"آپ نے مجھے یاد فرمایا بی بی؟"

''ہاں زہرہ۔۔۔!'' میں نے یوں کہا جیسے صدیوں کے سفر سے نبرد آزما ہونے کے بعد کوئی منزل پالے اور تھکن بھی محسوس کرے۔

''تم مجھے اچھی لگیں زہرہ۔۔۔ میں بناوٹ میں رہ کر بھی بناوٹ سے نفرت کرتی ہوں۔ تمہاری سچائیاں مجھے پسند آئیں۔''

وہ خوش ہوگئی۔ اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

''سچ بی بی۔''

''ہاں زہرہ۔ ایک دنیا جانتی ہے کہ میں کتنی بڑی عورت ہوں۔ کتنی طاقت اور کتنے اقتدار کی مالک ہوں۔ تم نے مجھے میرے سامنے ہی کمزور عورت کہا۔ اس بات نے مجھے اندر تک جھنجھوڑ دیا۔ تم کیسے جانتی ہو زہرہ کہ میں کمزور ہوں۔ زہرہ! میں بھی ایک عورت ہوں تم بھی ایک عورت ہو۔ حیثیت اور رتبے کے فرق کے باوجود جنس ایک ہی ہے۔ میں جل رہی ہوں۔ میں تڑپ رہی ہوں۔ اپنے اس فقرے کا مطلب مجھے سمجھا دو۔''

''بی بی۔۔۔!'' زہرہ لمحہ بھر کو رک گئی۔ ''عورت ہر تقسیم برداشت کر سکتی ہے لیکن شوہر کی محبت کا بٹوارہ ہرگز نہیں۔ بات چوری چھپے کی ہو تو اور بات ہے۔ ان کی نظریں ایک عورت پر تھیں۔ اور آپ خوش بیٹھی ان کے پاؤں داب رہی تھیں۔ یہ انہونی تھی۔ میں نے پہلی بار ایسا نظارہ دیکھا تھا۔ آپ کی بے حسی نے مجھے دہلا دیا تھا۔ تب میں نے سوچا کہ آپ کمزور ہیں۔ اگر آپ میں طاقت ہوتی تو آپ اسی وقت نواب صاحب کا گریبان پکڑ لیتیں۔ مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیتیں لیکن آپ نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اس ظلم کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا۔ کوئی آواز بلند نہ کی۔''

میری آنسوؤں سے لبریز آنکھیں دیکھ کر وہ خاموش ہوگئی۔ آنسوؤں کے قطرے تواتر سے میرے اپنے ہی دامن میں جذب ہوتے رہے۔ میں نے انہیں روکا نہیں۔ بند نہیں باندھا۔ بہنے ہی دیا۔ اس وقت مجھے رکھ رکھاؤ سے کوئی غرض نہ تھی۔ فطرت بے لباس ہوگئی تھی۔ ریشم و کم خواب کے بھاری پردوں میں لپٹی روح نے اپنا آپ زہرہ کے سامنے عیاں کر دیا تھا۔

''تم نے سچ کہا تھا زہرہ۔ میری کمزوری دولت تھی۔ میری کمزوری شہرت تھی۔ میری کمزوری نام و نمود تھا۔ نفس مجھ پر حاوی ہوگیا۔ میں نے سوچا تھا شاید دولت کے سائے میں گزرنے والی زندگی کے پاس غم آنے کی جرأت نہیں کرتا۔ لیکن وہ سب ایک خواب تھا۔ لمحہ لمحہ موت سے دوچار ہو کر مر نہیں سکتی۔ کیا کروں کہ ایسے نظارے میرا مقدر ہیں۔ میں سوچتی رہی لیکن اپنی ذات کو عیاں نہ کر سکی۔''

''بی بی! عورت کو نہ دولت کمزور بناتی ہے نہ شہرت۔ نہ نام و نمود۔ عورت بس ایک جذبے کی خاطر بک جاتی ہے۔ بنا کسی مول کے اور وہ ہے محبت۔ آپ کو یقیناً سرفراز خان سے محبت ہوگی۔ محبت میں عورت مرد کے بڑے بڑے گناہ معاف کر دیتی ہے۔ مجھے دیکھ لیں بی بی۔ خدا قسم قادر نے ایک اور

عورت سے اپنی دنیا آباد کرلی ہے۔ پانچ بچے چھوڑ کر اپنی ہی دنیا میں گم ہے لیکن میں اسے کبھی بددعا نہیں دے سکی۔ بُرا نہیں کہہ سکی۔ میں اس سے پیار کرتی ہوں۔ بی بی! آنکھیں کھولوں یا بند کروں مجھے اس کے سوا جہان میں کچھ نظر نہیں آتا۔'' وہ اٹھ کر آگے بڑھ آئی۔

''بی بی! معافی چاہتی ہوں۔ میں نے آپ کا دل دُکھایا۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ اصل میں۔۔۔'' وہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ نرمی سے علیحدہ کیے۔

''زہرہ! آئینہ دکھایا ہے تو مجھے اپنے خدوخال مکمل طور پر ہی پہچاننے دو۔ اپنے الفاظ واپس نہ لینا۔ تم ہی تو ہو سچ بولنے والی۔ تم ہی میری ہمدرد ہو۔ میری بہی خواہ۔ میں جھوٹ سے تنگ آچکی ہوں۔ سچ کا زہر میرے لیے تریاق بنے گا۔ میری بیمار روح کو صحت یاب ہونے دو۔''

زہرہ کی سمجھ میں میری بات آئی ہی نہیں۔ پھر میں نے اس کی ذات کو موضوع بنا دیا۔ اس کی سنتی رہی۔ ان لمحوں میں اپنی ہستی کو بھول گئی۔ زہرہ وفا کی زندہ مثال تھی۔ باکردار عورت تھی۔ مجھے اس سے عقیدت سی ہوگئی۔ شام کو میں نے اسے ڈھیروں اشیائے ضرورت سے مالا مال کر کے اپنی گاڑی میں بھجوایا اور اسے گاہے بگاہے اپنے پاس آنے کی دعوت بھی دی۔ بڑے لوگوں کو میں نے اللہ کی دی ہوئی دولت میں حصہ دار بنایا تھا لیکن پہلی بار کسی کی مدد کر کے مجھے دلی مسرت ہوئی تھی۔

مثالی عورت تو زہرہ تھی۔ میں کہاں؟ کاش میرے بس میں ہوتا۔ میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کرتی اور زہرہ کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کرتی۔ زمانے کو دکھاتی۔ زمانے کو سناتی کہ سیکھنا ہے تو اس عورت سے سیکھو۔ جسے اللہ کے سوا کوئی طاقت ڈرا نہیں سکتی۔ جس کا ایمان دولت متزلزل نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ رسم ورواج کی دیواریں میری راہ میں حائل تھیں۔

عورتیں تو وہ بھی تھیں جو گلزار میں آباد تھیں۔ صرف اچھے کپڑے، اچھے کھانے اور چند کھٹکتے سکّوں کی خاطر گناہ کی پستیوں میں ڈوبی۔ عورت میں بھی تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، حسین ذہین، بلند کردار، لیکن اپنی نظروں میں بے حد پست۔ سکون ان کا مقدر رہا۔ جن کے لب مسکراہٹ آشنا تھے۔ میری تقدیر میں تو غم ہی غم تھے۔ صد شکر کہ میں کسی بیٹے کی ماں نہ تھی۔ ورنہ شاید وہ بھی سرفراز خان کی طرح میدانِ کارزار گرم کر چکا ہوتا۔ شانزہ کو میں نے ہمیشہ اس ماحول سے دور رکھا۔ لیکن وہ چند دن یہاں قیام کرنے سال میں دو تین مرتبہ ضرور آتی تھی۔ جب تک بچی تھی لاعلم رہی۔ لیکن اب وہ اکیس سال کی نوجوان اور باشعور لڑکی تھی۔ اپنے باپ سے حد درجہ متنفر۔ میں جانتی تھی شانزہ کا مستقبل شاہنواز سے وابستہ ہے۔ شاہنواز خان، سرفراز خان کا اکلوتا بھانجا اس خاندان کا مکمل پرتو۔ شکل وصورت میں بھی اور عادات وخصائل میں بھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھاتی۔ شانزہ کو بھی علم تھا لیکن میں نے یا اس نے کبھی اس بات کو موضوع بنا کر گفتگو نہ کی تھی۔

رُت بدلی۔ موسمِ گرما بھی آ گیا۔ شانزہ نے مجھے فون کیا۔ اس بار اس کے تمام ساتھی سوات جا رہے تھے۔ اس نے اجازت طلب کی تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔ تختی کے ساتھ۔ وہ روہانسی ہو گئی۔ شاید یہاں کی تنہائیوں کے خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

''ایسا کرو بیٹی اس بار تم اپنی دوستوں کو اِدھر اسٹیٹ ہی لے آؤ۔ اگر جانے کا ارادہ ہو گیا تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''اوہ مما! ونڈر فل آئیڈیا۔ بنڈل آف تھینکس مما۔ ذہین وغیرہ یہاں آ کر بے حد خوش ہوں گی۔ میرے ذہن میں تو یہ بات آئی ہی نہ تھی۔''

تب اس نے تیسرے دن اپنی آمد کا پروگرام بھی مجھے بتا دیا۔ وہ سب پلین سے آ رہی تھیں۔ سرفراز خان نے شاہنواز خان کو ملتان بھیج دیا۔ شام کے دھندلکوں میں جب میں انتظار کی طوالت سے گھبرا کر اندر کمرے کی طرف جا رہی تھی گاڑی کا ہارن بجا اور اس کے ساتھ ہی لڑکیوں کا شور بھی میرے کانوں میں آیا تو میں پلٹ آئی۔

سامنے وسیع پورٹیکو میں رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے اور شاہنواز خان بلیک ہنڈا اکارڈ لاک کر رہا تھا۔

شانزہ بھاگ کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی میری طرف آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ شاہنواز خان بھی اوپر آ چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی سب لڑکیاں بھی۔ میں نے باری باری سب کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں۔ شاہنواز بھی میرے آگے جھک گیا۔

''آج کے دن ہم کیوں محروم رہیں مامی جان۔''

میں مسکرا دی۔

''نہ صرف دعائیں بلکہ داد کے طور پر کمر بھی تھپکے مما۔ ہمیں صحیح سلامت یہاں تک لے آئے شاہنواز خان صاحب۔'' شانزہ کے لہجے میں طنز تھا یا مذاق میں نہ سمجھ سکی۔

پھر وہ تعارف کرا رہی تھی۔

''مما۔۔۔ یہ جبین اور ذہین۔ یہ فرزانہ۔۔۔ یہ انیسہ اور یہ ماورا۔۔۔ ماورا محسن۔۔۔ یہ سب میری مخلص دوست ہیں مما۔''

میں اس نام پر چونک سی گئی۔ یہ نام میں نے بہت پہلے سن رکھا تھا۔ ماورا۔۔۔ ماورا۔۔۔ کوئی میرے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا۔ لڑکیوں کا شور سرفراز خان کے کانوں تک بھی پہنچا۔ اس شور میں میرے اندر کی آواز دب گئی۔ بسنتی رنگ کے شلوار قمیص میں سرفراز خان بھاری بھرکم وجود اور سرخ و سفید رنگت لیے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ کوریڈور کے سرے پر کھڑا جائزہ لیتی نظروں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھ آئی۔

''یہ سب آپ کی بیٹیاں ہیں سرفراز۔ آپ کی بیٹی کی سہیلیاں جو ہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔ کچھ

یاد دلانا چاہا۔ باور کرانا چاہا۔

سرفراز نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور آگے بڑھ آیا۔

''آداب پاپا۔۔۔!'' شانزہ نے دور سے سرفراز کو آداب کیا۔ دوسری لڑکیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ لڑکیاں شاید یہ تجمل نما گھر دیکھ کر ہی پریشان ہوگئی تھیں۔ پھر سرفراز کی خوب صورت شخصیت نے انہیں اور بھی مرعوب کر دیا۔

''موسٹ ویلکم۔۔۔ موسٹ ویلکم مائی ڈاٹرز۔'' سرفراز خان نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ سرفراز خان وفاقی وزیر تھا۔ بے حد مشہور شخصیت۔ یہ لڑکیاں متعدد بار اخباروں میں، ٹی وی، پر اسے دیکھ چکی ہوں گی۔ کیا اب تک شانزہ نے انہیں اپنے باپ کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا۔ جو وہ یوں حیران تھیں۔ لڑکیاں ڈرائنگ ہال کی طرف بڑھ گئیں اور میں کچن میں کچھ ہدایات دینے چلی آئی۔

کچھ دیر بعد جب میں ان کی طرف گئی تو میرے قدم دروازے پر ہی رک گئے۔ دراصل ان لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے اپنا طالب علمی کا دور شدت سے یاد آ گیا تھا۔ میں ایک رئیس اور جاگیردار کی بیوی کے خول سے نکل کر آزادی اور مسرت کے ساتھ چند گھڑیاں گزارنا چاہتی تھی۔ میں نے سنا لڑکیاں کہہ رہی تھیں۔

''بھئی شانزہ! زبردست چیز ہو تم بھی۔ یار بھلا ہمارا تمہارا کیا میل تھا۔ تم خالص رئیس زادی اور ہم غریب لوگ، مزدور پیشہ۔۔۔''

''بکواس بند کرو انیسہ! یہ تم لوگوں کے ذہن میں دولت و حشمت کا بھوت کیوں سما گیا ہے۔ ان عارضی چیزوں کو میں نے کبھی اپنا گردانا ہی نہیں۔ مجھے تو محبت چاہیے۔ صرف محبت اور وہ بھی تم جیسے بے لوث جذبوں والی دوستوں کی۔''

''اچھا اور کچھ نہیں۔ آنے دو شانزہ جی آنے دو بھیا کو۔ سب کچھ بتا دوں گی۔'' یہ شاید ماورا تھی۔ میں اس کی بات سن کر چونک گئی۔ وہ کس کا ذکر کر رہی تھی۔ تبھی کسی اور نے کہا۔

''ارے ان کے کیا کہنے۔ میرا خیال ہے سارا عشق ہوا ہو جائے گا ان صاحب کا۔ یہ سن کر کہ شانزہ کس کی بیٹی ہے۔ اے لڑکی تُو نے اپنے آپ کو مخفی رکھ کر اس نوجوان کا دل لُوٹ لیا ہے جس نے ہم سب کے سامنے دعوا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی کسی ہائی کلاس لڑکی سے شادی نہیں کرے گا اور نہ ہی محبت۔''

''فرزانہ پلیز۔ یہ کیمپس نہیں میرا گھر ہے۔ تم بے باکی سے اتنی اونچی آواز میں اظہار خیال کیے جا رہی ہو۔ پلیز لیو دس ٹاپک۔''

شانزہ نے گھبرائے لہجے میں اسے ٹوکا اور میں لمحہ بھر تاخیر کے بعد اندر داخل ہوئی۔ سب ہی خوف زدہ سی ہوگئیں۔ میں نے خود کو انجان ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کی اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں لڑکیوں کے ساتھ ساتھ میرا بھی وقت اچھا گزر گیا اور ان سے مکمل تعارف بھی ہو گیا۔

کھانے کی میز پر سرفراز خان کے ساتھ ساتھ شاہنواز بھی موجود تھا۔
میں جانتی تھی کہ اسے کس کشش کے تحت یہاں رکنا پڑا ہے۔ آخر وہ سرفراز خان کا بھانجا تھا۔ اس سے مختلف بالکل نہ تھا۔
ان سب لڑکیوں میں ماورا محسن منفرد اور جداسی لڑکی تھی۔ غضب کی خوب صورت اور خاموش طبع۔ اس وقت بھی وہ ہلکے فیروزی رنگ کے سوٹ میں گلاب کے پھول کی مانند تروتازہ لگ رہی تھی۔ شاہنواز بے اختیار بار بار اس کی طرف دیکھ لیتا۔ لیکن وہ نظریں جھکائے کھانا کھانے میں مصروف تھی۔
''مامی جان! کیا واپسی پر بھی معزز مہمانوں کو میری ضرورت ہوگی؟'' وہ مؤدب لہجے میں مجھ سے پوچھ رہا تھا۔
''واہ جناب شاہنواز بھائی! آپ کو ابھی سے ہمارے جانے کی پڑ گئی۔'' فرزانہ شوخ وشریر لگ رہی تھی۔
''نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں۔ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کا قیام کچھ عرصہ یہاں رہے تاکہ میں آئندہ آپ کے ساتھ سفر کرنے کے لیے خود کو تیار کرلوں۔''
''ہم نے اتنا پریشان تو آپ کو نہیں کیا شاہنواز بھائی۔'' جبین نے شکوہ کیا تو شاہنواز نے فوراً اس کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔
''مامی جان! لوگ منہ در منہ بھی اتنا جھوٹ بول لیتے ہیں۔ اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ نہ پوچھیے کچھ کہ میری کیا حالت ہوئی۔ پورا راستہ بس کسی زرخرید غلام کی طرح ان سب کی خدمت میں لگا رہا کہ شانزہ کی دوستوں کو مایوسی نہ ہو۔''
''شکریہ شاہنواز خان آپ کے اس لطفِ خاص کا۔'' میں دیکھ رہی تھی کہ شانزہ کے انداز میں طنز ہی طنز تھا۔
''کیا واقعی آپ آئندہ ہمارے ساتھ جانے کے خیال سے خوف زدہ ہیں۔ تو یقین کیجیے کہ ہم ہرگز آپ کو تنگ نہ کریں گے۔'' یہ ماورا محسن تھی۔
''ارے نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو بس یوں ہی کہہ رہا تھا۔''
''دیکھو نا ماورا۔ آخر یہ رئیس زادے ہیں۔ ہل کر پانی پی لینا بھی خلاف شان ہے۔ ہم سب کو ایک طویل فاصلے سے لانا ان کے لیے تو بہت بڑا مسئلہ تھا ہی۔'' شانزہ نے کہا۔
میں نے شانزہ کی طرف تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ اس کے الفاظ مجھے بھی اس وقت اچھے نہیں لگے تھے۔ جب کہ سرفراز خان بھی میز پر موجود تھا۔
''بیٹے۔ تمہارے ذمے ابھی تو بہت سے کام ہیں۔ یہ تو معمولی سی بات تھی۔ ابھی تو بچیوں نے جاگیر کی سیر کرنا ہے۔ باغات دیکھنے ہیں۔ جھیل پر جانا ہے۔ تم ابھی سے تھک گئے تو کیا تمہارے ماموں

جانی یہ ذمہ داری پوری کریں گے۔''

میں نے ماحول بدلنے کی خاطر ذرا اور انداز اختیار کیا۔ شاہنواز اس خیال سے ہی خوش نظر آ تھا۔ اس کی نظریں اِدھر اُدھر سے ہر پھر کر پھر ماورا پر ٹکتی تھیں۔ میں نے یہ بات خاص طور سے محسوس کی۔ کھانے کے فوراً بعد لڑکیاں سفر کی تھکان کی وجہ سے جلد ہی اپنی خواب گاہ میں چلی گئیں تو میں بھی بیڈ روم میں آ گئی۔ نیندیں تو اکثر ہی روٹھی رہتی تھیں۔ آج بھی نیند نہ آئی۔ ماورا کا نام یادوں کی جھیل میں کسی بھاری اور وزنی پتھر کی طرح گر کر ارتعاش برپا کر چکا تھا۔ کوئی اب بھی میرے کانوں میں سرگوشی کیے جا رہا تھا۔

''ہم اپنی بیٹی کا نام ماورا رکھیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔ ماورا کا مطلب جانتی ہو۔ مجھے تو بہت پسند ہے یہ نام۔''

''یہ تو صدفی صد سچ ہے کہ ماورا تمہاری بیٹی ہے محسن اسد۔''

''ٹھیک ہے خواہشات مرا تو نہیں کرتیں سدا بہار ہوتی ہیں۔ مرے سوا تم نے ہر چیز پالی محسن اسد۔ تم اس کے حق دار بھی تھے۔ آخر میں نے بھی تو ہر چیز پائی ہے محسن اسد۔ ہر چیز۔ دولت، عزت، شہرت لیکن کیا تم بھی ہر شے پانے کے بعد تشنہ ہو میری طرح۔ نہیں نہیں، تم جیسے انسان تشنہ نہیں رہ سکتے۔ تم دل کے غنی تھے محسن اسد۔ مزید اور مزید کی طلب تو مجھے تھی۔ بہت کچھ پا کر بھی میں پیاسی ہوں۔ الجھی ہوئی ہوں۔ لبوں پر مجبوریوں کے قفل ہیں۔ ان مجبوریوں کے جن کو میں نے خود اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ ماورا کے ساتھ تمہارا نام سن کر ہی جانے کیوں دل اس کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ جی چاہا تھا اسے گلے لگالوں۔ ڈھیروں ڈھیر پیار کروں۔ وہ تمہاری بیٹی ہے محسن اسد تمہاری بیٹی۔ مجھے کیسے عزیز نہ ہو۔ یہ خواب تو میں نے بھی تمہارے ساتھ مل کر دیکھے تھے۔ لیکن میں قانع نہ تھی۔ محدود دنیا سے جلد اُکتا گئی تھی۔ زندگی میں بہت کچھ پانے کی تمنا تھی مجھے۔ تمہاری محدود دنیا مجھے کیا دیتی۔'' پتا نہیں کب آنسوؤں کے قطرے قطار اندر قطار آنکھوں میں اترتے چلے گئے اور میرا دامن بھگو گئے۔

''محسن اسد تمہیں یاد ہے۔ تمہارا کسی لڑکی کی طرف دیکھ لینا بھی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوا کرتا تھا۔ آکر دیکھو نا۔ ''گلزار'' عورتوں سے بھرا ہے لیکن میں چپ ہوں اس لیے کہ تمہارے بعد کسی کو چاہ نہ سکی۔ کوئی ناتا نہ جوڑ سکی کسی سے۔ کیا اس لیے کہ سرفراز خان سے قانونی بندھن کے علاوہ کوئی جذباتی روحانی تعلق قائم نہ کر سکی۔ محسن اسد ایک مدت میں نے تو تمہارے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ تمہیں کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ لیکن آج تمہاری بیٹی کو دیکھ کر ڈھیر سارا اضطراب میرے من میں پھیل گیا۔ انسان محبتوں کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود اپنی زندگیاں کسی غیر کے وجود سے آباد کر لیتے ہیں۔ جیسے میں۔ جیسے تم۔ تم کہا کرتے تھے نا۔

''تم میرے دل کا زندہ ارمان ہو دوست۔ کبھی نہ مرنے والی واحد آرزو۔ تمہارے سوا اس زندگی

میں کبھی کسی کا عمل دخل نہ ہو سکے گا۔'' لیکن دیکھ لو۔ تم نے بھی تو اپنی زندگی کسی اور کے نام لگا دی۔ ہاں سچ ہے خواب اور حقیقت میں بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ اک عمر خوابوں میں رہنے کی ہوتی ہے۔ لیکن آدمی جلد ہی حقیقت کی طرف لوٹ آتا ہے۔ خواب تو ایک خلش دے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔''

میں اضطرابی کیفیت میں کھڑکی کی طرف آئی۔ سارے پٹ کھول دیے۔ لان میں سے آنے والی ہوائیں من میں ہونے والی جلن کو دور کرنے میں ناکام رہیں۔ میں نے قریب پڑے ٹیپ ریکارڈر پر اپنی پسندیدہ غزل کی کیسٹ لگائی۔

بھولی بسری چند امیدیں، چند فسانے یاد آئے
تم یاد آئے ساتھ تمہارے اور زمانے یاد آئے

آنسو پھر بہہ نکلے۔ غزل کے بول میرا دل چھیدتے رہے۔ یہ آج ایک ایکا ایکی اتنی محبت۔۔۔ اتنا درد۔۔۔ اتنی تڑپ کہاں سے میرے وجود میں در آئی تھی۔ یہ آج اتنی شدت سے تم مجھے کیوں یاد آ رہے تھے شاید کوئی جذبۂ رقابت دل میں جاگ اٹھا تھا۔ ماورا کو دیکھ کر یہ خیال آیا تھا کہ ایک عورت تمہارے شب و روز کی، تمہارے وجود کی، تمہارے دل و ذہن کی، تمہاری روح کی مالک ہے۔ اس خیال نے سارا چین و قرار لوٹ لیا۔ ماورا محسن اس بات کا زندہ ثبوت تھی کہ تم اس دنیا میں میرے نہیں کسی اور کے ہو۔ کسی اور سے وابستہ ہو۔

کتنی پاگل ہوں میں بھی محسن اسد۔ کس قدر خود غرض۔ اپنی دنیا میں مگن رہی تو تمہارے بارے میں سوچا تک نہیں۔ آج تمہاری زندگی کی ایک جھلک دیکھ کر مارے حسد کے میرا پور پور جل اٹھا۔ وہ یقیناً تمہاری بیٹی تھی محسن! کیونکہ اس میں تمہاری جھلک تھی۔ تمہارا پرتو تھا۔

غزل ختم ہو گئی۔ پر من کی بے کلی سوا ہو گئی۔ میں صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ اور بیتے دنوں کی یادیں کسی فلم کی طرح ذہن کا احاطہ کرنے لگیں۔

زہرہ نے مجھ سے کہا تھا۔ اسے میری بے حسی پر حیرت ہوئی تھی۔ اسے تو حیرت ہونا ہی تھی۔ بھلا اسے کیا خبر محسن اسد کہ میں نے سرفراز خان کو اپنا مانا ہی نہیں۔ جذبۂ رقابت کہاں سے آتا؟ ہاں۔۔۔ میں نے صرف دولت کو اپنا مانا تھا۔ بیش قیمت ملبوسات، نادر زیورات اور ہیرے موتی میرے تھے۔ ان میں، میں کسی کو شریک نہ بنا سکی۔ کاش زہرہ اس وقت مجھے دیکھ لے۔ میرا چہرہ پڑھے۔ میرے دل میں جھانکے۔ میرے احساسات چھو لے تو اسے پتا چلے کہ میں بھی عورت ہوں۔ جذبۂ رقابت اور فطری حسد سے بھرپور۔

رات کٹ گئی۔ صبح کا اُجالا چار سُو پھیل گیا۔ ابھی میں قرآن پاک کی تلاوت کر کے فارغ ہوئی تھی کہ خادمہ نے دستک دی اور بیڈ ٹی کے ساتھ ہی ماورا بھی میرے کمرے میں آ گئی۔

''آداب آنٹی۔۔۔!'' وہ تر و تازہ چہرے کے ساتھ میرے سامنے کھڑی دلفریب مسکراہٹ سمیت میری توجہ اور محبت کی منتظر نظر آ رہی تھی۔

میں نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور دعا مانگنے لگی۔ خادمہ نے قرآن پاک اٹھا کر الماری میں رکھا۔ میں تخت سے اٹھ کر ماورا کی طرف آئی۔

''آنٹی! آپ نے محسوس تو نہیں کیا۔ میں آپ کی پرائیویسی میں چلی آئی۔''

لمحہ بھر بعد وہ خود ہی کہنے لگی۔

''دراصل۔۔۔ جب تک صبح ہی صبح ممّا کا پیار نہ ملے دن بھر قرار ہی نہیں آتا۔ بابا کہتے ہیں ماورا ساری عمر بچہ ہی بنی رہے گی۔ آج آپ کے پاس چلی آئی۔ آپ کا پُرنور چہرہ دیکھ کر دن ٹھیک ٹھاک ہی گزرے گا۔''

اس کی وضاحت پر مجھے بے اختیار پیار آ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''اچھا کیا بیٹی میرا بھی دل خوش ہو گیا۔''

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ دل میں ہزاروں سوال پوری بے تابیوں سمیت ابھرے۔ لیکن میں ایک بھی نہ پوچھ سکی۔ کیا پوچھتی؟ کیسے کہتی کہ جس شخص کو میں نیم جان مرغِ بسمل کے مانند چھوڑ آئی تھی اب وہ کیسا ہے؟ حالات و جذبات کے طوفانوں سے اس نے کیسے مقابلہ کیا۔ ستم ہائے محبت سے کیسے فرار حاصل کیا اس نے؟ کیا پوچھتی بھلا؟ ماورا تو بہت پیاری بچی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ میرا کوئی بیٹا ہوتا محسن اسد، اور میں تمہارے قدموں میں گر کر ماورا کو اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیتی۔

بہت اچھی عورت تمہاری زندگی میں آئی تھی محسن اسد جس نے تمہیں ہیرے جیسی بیٹی دی۔ ایک عام سی لڑکی کیا دیتی بھلا؟ عمر بھر دولت و حشمت سے جدا ہو جانے کے غم میں ہی رہتی۔

ماورا باتیں کرتی رہی اور سوچیں میرا دامن جلاتی رہیں۔

نو بجے شاہنواز آ گیا۔ لڑکیاں ناشتے سے فارغ ہو چکی تھیں۔ آج پہلے دن ان کا پروگرام شاد باغ جانے کا تھا۔ جہاں بہترین آموں کی فصل اپنے عروج پر تھی۔ جہاں خاص ذائقے والے جامن تھے۔ جہاں عربی کھجوروں کا ایک بڑا جھنڈ تھا۔ لیچی تھی اور پُر بہار، خوشبودار، معطر، سرسبز فضائیں تھیں۔ سب نے مجھے بھی ساتھ چلنے کا کہا لیکن میں نہ جا سکی۔ آج مجھے ایک اور سفر کی خواہش ہو رہی تھی۔ کسی اور ہی دنیا میں جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ وہ تھی ماضی کی دنیا، محسن اسد کی دنیا۔ میرے غرور اور اس کی محبت کی دنیا۔ میری نادانی اور اس کی وفا کی دنیا۔ آج میں مکمل تنہائی چاہتی تھی۔

❁❁❁❁

میں فضہ عبداللہ خان صادق گنج کے جاگیردار کی اکلوتی بیٹی جس نے آنکھ کھول کر اپنے چاروں طرف دولت کی جھنکار کے علاوہ کچھ نہ سنا تھا۔ پیدا ہوتے ہی اپنے چچازاد سرفراز خان کی منگیتر تھی۔ اور خاندان کی پہلی لڑکی جو عبداللہ خان کی خواہش پر لاہور کالج میں بی۔ اے کی طالبہ تھی۔ نواب عبداللہ خان

کسی غیر معروف ہستی کا نام نہ تھا۔ بہت بڑے جاگیردار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے سیاست دان بھی تھے۔اور نیشنل اسمبلی کے ممبر بھی۔ میں نہ صرف حسن میں اپنی مثال آپ تھی بلکہ غرور و تکبر میں بھی۔ پورے کالج میں میری دوستی صرف لبنیٰ عتیق سے ہو سکی جو کہ کالج کی خوب صورت ترین لیکن انتہائی سادہ اور معصوم سی لڑکی تھی۔دو سالوں میں دوستی بہت سی حدیں پار کر آئی۔لبنیٰ بھی میری طرح ہوسٹل میں رہائش پذیر تھی۔ کیونکہ ان دنوں اس کے والد جو کہ سفارت خانے سے متعلق تھے،جنیوا میں رہائش پذیر تھے۔ پچھلے دنوں لبنیٰ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کے ڈیڈی اپنی بڑی بیٹی عظمیٰ کی شادی کے لیے پاکستان آ رہے ہیں۔ ہماری ہوسٹل لائف قطعی غیر دلچسپ اور خشک تھی۔ کیونکہ میں اور لبنیٰ دونوں ہی تعلیم برائے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔شادی کے ہنگامے کی خبر اعصاب کے لیے اچھا تاثر لائی۔ میں نے فون پر بابا سے اجازت لے لی کہ ان دنوں شادی کی تقریبات میں دل کھول کر حصہ لینے کی خاطر میں لبنیٰ کے ساتھ اس کے گھر میں رہوں گی۔

اپریل کے مہینے کے خوش گوار دنوں میں عتیق الرحمٰن صاحب پاکستان آئے تو میرا پہلی بار ان سے تعارف ہوا۔لبنیٰ کے ڈیڈی مہربان قسم کے بندے تھے۔ دونوں بیٹیوں سے دوستانہ مراسم تھے۔ان کے اور لبنیٰ کے بھائی سعود اور مسعود بھی ان سے خاصے بے تکلف تھے۔

سعود بھائی میڈیکل کے آخری سال میں تھے اور مسعود نے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔جبکہ عظمیٰ گریجویشن کے بعد ملکوں ملکوں ڈیڈی کے ساتھ گھومتی پھر رہی تھیں۔ عظمیٰ کی شادی اپنی پھپھو کے بیٹے سے طے تھی۔ حسن اسد فوج میں میجر تھے۔ پہلے دن ان سے ملاقات بالکل غیر اتفاقی طور پر بازار میں ہی ہوئی۔ جب عظمیٰ کے ساتھ میں اور لبنیٰ خریداری کے لیے بازار آئے ہوئے تھے۔ فُل وردی میں پہلی نظر میں ہی میجر حسن اسد بے حد بھلے لگے۔ عظمیٰ تو ایک دکان میں جا گھسیں اور لبنیٰ بڑی دیر اُن سے باتیں کرتی رہی۔ تبھی جانے کس کونے سے ان ہی سے ملتا جلتا ایک خوب صورت اور باوقار بندہ آن مخل ہوا۔

اور لبنیٰ کے چہرے پر کئی خوب صورت رنگ بکھر گئے۔ اپنی دوست کے چہرے پر میں نے پہلی بار ایسی بہار دیکھی تھی۔ میجر حسن مجھ سے متعارف ہو چکے تھے۔ لبنیٰ بڑی دیر سے انہیں تنگ کر رہی تھی کہ وہ انار کلی کسی کام سے نہیں بلکہ عظمیٰ کی آمد کی بھنک پا کر آئے ہیں۔

”نفضہ سسٹر! اب برائے مہربانی آپ ان سے پوچھیے کہ یہ بندہ جسے میرا بھائی ہونے کا شرف حاصل ہے اور جو رضا اسد کے نام سے پکارا اور سنا جاتا ہے۔ یہ بندہ انار کلی کیا کرنے آیا ہے؟“

رضا اسد شریر نظریں لبنیٰ پر جمائے کھڑے تھے۔

”بات تو صاف ہے حسن بھائی۔ کہیے تو بتا دوں۔“

دونوں بھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ میجر حسن نے نظروں ہی نظروں میں اسے تنبیہ کی۔

''جی نہیں۔ کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔'' لبنیٰ ان کی شرارت سمجھ گئی تھی۔

''ارے نہیں لبنیٰ جی۔ صاف بات کہہ دینے سے میجر حسن رضا صاحب ہی کیس میں ملوث ہو گے کہ یہ مجھے گھسیٹ کر یہاں لائے ہیں اور یہ رشوت دے کر کہ وہ تو عظمیٰ بھابھی کے دیدار سے سیرا ہوں گے کام ہمارا بھی بن جائے گا۔''

میں ہونق بنی ان سب کا منہ دیکھتی رہی۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ آپ جو سزا دیں بندہ بھگتنے کو حاضر ہے۔'' میجر حسن اسد بے حد خوش تھے۔

''تو پھر چلیے اندر۔'' لبنیٰ نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور جس دکان میں عظمیٰ گئی تھیں وہیں لے آئی۔ وہ بھی کچھ خریداری کا بہانہ کر کے ہی آئے تھے۔ ہماری مرضی پر بہت کچھ انہوں نے بھی لے لیا۔

اور جب سزا کے طور پر میجر حسن اسد ہوٹل میں کھانا کھلا رہے تھے تب رضا اسد نے کرسی گھسیٹ کر لبنیٰ کے مقابل بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''لبنیٰ! کیا تم نے اپنی دوست کو یہ نہیں بتایا کہ ہم تمہارے ہونے والے شوہر نامدار ڈاکٹر رضا اسد ہیں؟''

لبنیٰ کا چہرہ گل رنگ ہو گیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ مجھے لبنیٰ پر غصہ آیا جس نے اتنی رازداری برتی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی چھپانے والی بات تھی۔

''رضا اسد! مہربانی کہ آپ نے مجھے حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ بس آج کے بعد اس کی میری دوستی ختم کیونکہ ہمیں کسی قابل سمجھا ہی نہیں گیا۔''

میں سخت غصے میں تھی۔ لبنیٰ نے پریشان ہو کر میری طرف دیکھا۔

''فضہ جی! اس سے قبل میری آپ کی ملاقات تو ہوئی نہیں میں تو سرخرو ہوں کہ جوں ہی آپ سے ملا اپنا اور آپ کا رشتہ آپ پر واضح کر دیا۔

''ہاں ورنہ کسی اور گڑبڑ کا خدشہ بھی ہو سکتا تھا۔''

میجر حسن نے معصوم انداز میں نظریں جھکائے جھکائے ایک شوشہ چھوڑا۔

''حسن بھائی۔۔۔!'' رضا اسد احتجاجاً چلائے۔

''کیا آپ مجھے اتنا لوفر، لفنگا سمجھتے ہیں؟''

''اور بھی بہت کچھ برخوردار۔۔۔!'' وہ اب بھی مطمئن انداز میں جواب دے رہے تھے۔

''اب دیکھو نا۔ ہم نے عظمیٰ کا انتخاب کیا۔ تم نے جھٹ لبنیٰ کے لیے اپنا نام پیش کر دیا۔ ہم نے منگنی کی تقریب ارینج کی۔ تم نے اپنا پھڈا ساتھ ڈالا۔ ہم نے شادی کا سوچا تم نے بھی تجویز ڈیڈی کے حضور پیش کر دی۔ وہ تو شکر ہے لبنیٰ بی بی ابھی بی۔ اے نہیں ہو سکیں ورنہ شاید ہم سے پہلے تمہاری شادی کی تقریب سلیبریٹ کی جاتی اور آج ہی دیکھ لو میں صرف عظمیٰ کی خاطر بازار آیا تو تم نے سوچا میں کیوں

پیچھے رہ جاؤں۔تم بھی اپنی کھٹارا میں یہاں آدھمکے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جو کچھ آج کل ہو رہا ہے کوئی موروثی مرض ہی ہے جو سب کو ایک ساتھ لگ گیا ہے۔''

رضا اسد نے تشویش بھرے انداز میں کہا تو میجر حسن اسد نے فوراً پوچھا۔

''ہائیں۔۔۔یہ کیا۔۔۔کیا وہ ہمارا برخوردار محسن اسد بھی اسی مرض میں مبتلا ہے؟''

''خبر نہیں۔گھر جا کر پوچھیں گے اور اگر اس کے ساتھ کوئی حادثہ اب تک نہیں ہوا تو اسے دو چار بار انارکلی بھیج دیں گے۔کوئی نہ کوئی قیامت اثر کر ہی جائے گی اس پر بھی۔''

رضا اسد نے کسی انجانی ہستی پر چوٹ کی۔ میں نے اس کمپنی میں خاصا لطف محسوس کیا اور احساسِ تحفظ بھی۔واپسی میں میجر حسن اسد تو کسی کام سے چلے گئے اور رضا اسد نے ہمیں گھر ڈراپ کیا۔

تیل کی رسم والے دن لتاں جان نے میرے پانچ چھ خوب صورت جوڑے اور مختلف زیورات ایک بااعتماد ملازم کے ہاتھ بھجوائے جو میں نے کالج سے واپسی پر وصول کر لیے۔

آنٹی عتیق نے گھر کا سارا انظام عظمیٰ اور لبنیٰ کی سہیلیوں پر چھوڑ رکھا تھا۔جن میں سرِ فہرست میں تھی۔اپنے گھر میں تو مجھے ہل کر پانی پینے کی اجازت بھی نہ تھی۔ایک ایک قدم پر خادمائیں خدمت کے لیے آمادہ رہتی تھیں۔یہاں پر میں آزادتھی۔کام کرنا بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ان دنوں میں نے کچن کے کافی کام خود اپنی مرضی سے سنبھال رکھے تھے۔چائے تو بس میری ذمہ داری تھی۔اور اب تو انکل عتیق میرے ہاتھ کی چائے کے عادی سے ہو گئے تھے۔عظمیٰ ان دنوں صرف شوق کے تحت ایک سوٹ پر گوٹے کا جال بنا رہی تھیں۔لبنیٰ بھی ان کے ساتھ شریک رہتی۔باقی لڑکیاں شام کے بعد اپنے گھروں کو چلی جاتیں اور میں تنہا لبنیٰ کے کمرے میں بیٹھی کسی میگزین میں غرق رہتی۔کبھی کبھار رضا اسد آدھمکتے تو وقت اچھی طرح کٹ جاتا۔آٹھویں دن شادی تھی۔پورے آٹھ دن مایوں میں بیٹھی عظمیٰ جی خوب نکھرتی جا رہی تھیں۔میجر حسن اسد فون پر بار بار رابطہ قائم کرتے۔عظمیٰ کی ایک جھلک کے لیے اس قدر بے قرار تھے کہ لبنیٰ کو اور مجھے خاصی موٹی رشوت کی آفر کرتے۔لیکن ہم نے انہیں کوئی ایسا موقع فراہم نہ کیا۔ان کی بے تابیاں ہمیں بے حد لطف دیتیں۔شادی سے دو روز قبل لڑکیوں نے عظمیٰ کے کمرے میں خوب ہنگامہ مچایا۔بیاہ کے گیتوں کی ریہرسل گلا پھاڑ پھاڑ کر کی۔عظمیٰ کی شریر سہیلیوں نے کچھ نئے گیت بھی سسرال والوں کی خاطر تواضع کے لیے تیار کیے۔

میں اس ہنگامے میں صرف سننے کی حد تک شامل رہی۔اور جب لبنیٰ، آنٹی عتیق کے ساتھ بازار چلی گئی تو میں اندر کمرے میں چلی آئی۔ابھی میرے قدم دروازے میں ہی تھے کہ فون بول اٹھا۔

ان دنوں سب سے زیادہ فون میجر حسن اسد ہی کیا کرتے تھے۔مجھے یقین تھا اب بھی وہی

ہوں گے۔

''ہیلو۔۔۔!''

(جواب میں خاموشی)

''ہیلو۔۔کون صاحب؟''

''سخت حیرانی ہے۔اس گھر میں ہم سے یہ پوچھا جائے کہ کون صاحب؟'' میجر حسن اسد بڑے عجیب لہجے میں کہا۔

''جی ہاں۔پوچھا ہی جائے گا کیونکہ ہم لوگ کسی ایرے غیرے سے بات نہیں کرتے۔''

''دیکھیے۔آپ اپنے بارے میں تو بتائیں کہ آپ کون ہیں؟'' آواز میں شوخی تو ذرہ برابر نہ تھی جو کہ میجر حسن احمد کے لہجے کا خاصا تھی۔

''آپ باخوبی جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟''

''تو پھر آپ کو خبر ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں؟''

''نہیں۔آپ سے تو تب پوچھا جائے گا جب آپ اپنا مکھڑا سہرے میں چھپائے رخصتی کرانے کے لیے آئیں گے۔'' میں نے انہیں چھیڑا۔

''اُف کون نامعقول ہو تم۔بات کرتے ہی رخصتی پر آمادہ ہوگئیں۔دیکھو لڑکی! میں کوئی لوفر لفنگا نہیں اور نہ ہی مجھے چہرہ سہرے میں چھپانے کا شوق ہے۔شاید زندگی بھر ایسا نہ ہو سکے۔''

اب میں میجر حسن اسد کے اس اُکھڑے رویے پر سخت متعجب سی ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی جواب سوچ رہی تھی۔جانے کیا تھا۔مجھے تو یوں لگا کہ میجر حسن اسد اپنے حواسوں میں ہی نہ تھے۔

''حسن بھائی! خیریت تو ہے آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔''

''جی میں میجر حسن اسد نہیں ان کا چھوٹا بھائی محسن اسد بول رہا ہوں۔'' ایک زبردست قہقہہ میرے کانوں میں گونجا۔''آپ بھی غلط فہمی کا شکار ہوگئیں۔دراصل میری اور حسن بھائی کی آواز بے حد ملتی جلتی ہے۔خصوصاً ٹیلی فون پر تو بالکل کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔''

میں جھینپ سی گئی۔چند لمحے قبل کی صورت حال کا خیال کر کے میں تو میجر حسن سمجھ کر اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہہ جاتی۔

''ویسے آپ کی تعریف؟'' اس نے پوچھا۔

''جی میں لبنیٰ کی دوست ہوں۔''

''آئی سی۔عظمیٰ بھابھی سے کہہ دیں۔کمی خاص قسم کی خریداری کے لیے انہیں لینے آرہی ہیں تیار رہیں۔اللہ حافظ۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

دوسرے دن مہندی تھی۔سب سے پہلے مہندی کے تھال سجائے پھلوں اور میووں کی ٹوکریاں پیک کر کے رکھیں اور پھر اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے۔مہندی کلر کے جال لگے سوٹ میں بھاری دوپٹہ اور

کام کی مناسبت سے زیور پہن کر میں ہال میں آئی تو آنٹی نے آگے بڑھ کر میری پیشانی چومی اور میری بلائیں لیں۔ اسد ولا میں بڑی رونق تھی۔ میجر حسن اسد بڑے سارے ہال میں سجے سجائے دیوان پر گاؤ تکیے کے سہارے کُرتے پاجامے میں ملبوس بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ان کے قرب و جوار میں ان کے کزنز اور دوست موجود تھے۔ چاروں طرف سے فلیش لائٹس کی بہتات تھی۔ چاروں کونوں میں کیمرے موجود تھے۔ ایک ایک حرکت محفوظ کی جارہی تھی۔ ڈاکٹر رضا اسد نے بھی کرتا اور پاجامہ زیب تن کر رکھا تھا۔ ان کی والہانہ نظریں بے اختیار لبنیٰ کا طواف کر رہی تھیں۔ رضا اسد کے دوست فقرہ بازی کر رہے تھے۔ لبنیٰ حسن اسد کے قریب جا بیٹھی اور اس نے مجھے بھی گھسیٹ کے ساتھ بٹھا دیا۔ کئی تعریفی و توصیفی نظریں میرے گرد بھی تھیں اور میں سب سے بے نیاز کچھ خاموش سی بیٹھی تھی۔

''حسن بھائی! آپ کی سالیاں مراقبے میں ہیں کیا؟'' رضا اسد نے چوٹ کیا۔

''یہ دونوں ہمارے یار کی فکر میں ہیں۔'' جانے کون تھا یہ۔

''وہ کیوں؟''

''بھئی، کل رات یہ اپنے آپ سے تو گئے۔ گزر جائیں گے جان سے۔''

''معاف کیجیے۔ یہ فکر لگائیں تو آپ لگائیں۔ ہم تو اس لیے خاموش ہیں کہ یہ شیطانوں کا ٹولہ جو ہمارے دولہا بھائی کے کان بھرنے والا ہے ایسے میں ہماری عظمیٰ جی کا کیا ہوگا۔'' لبنیٰ نے جھٹ سے جواب دیا۔

''وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔'' یہ آواز سامنے دروازے سے آئی تو سب کے ساتھ میں نے بھی دروازے کی طرف دیکھا۔ اونچے پورے قد کا وہ نوجوان دروازے میں ایستادہ تھا۔ گھنگھریالے بالوں سے ڈھکے سر کے ساتھ۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں شوخی و شرارت بسائے۔ سیاہ مونچھوں تلے مسکراتے لبوں سے جھانکتے قطار اندر قطار دانتوں سمیت۔ سیاہی مائل بھوری آنکھیں اس کے صحت مند گندمی چہرے کو بے حد پرکشش بنا رہی تھیں۔

''اوہ میرے یار۔ تُو آ ہی گیا۔''

میجر حسن اسد نشست سے اٹھ کر اس کے قریب گئے۔ بے تابی سے گلے لگا لیا اسے۔

''کہاں گیا تھا یہ بانگڑو؟'' میجر حسن اسد کے ایک دوست نے پوچھا۔

''مشقی پروازیں تھیں نا۔ سرگودھا میں ہی تھا۔ چھٹی بھی بہت مشکل سے ملی ہے اور وہ بھی صرف تین دن کی۔''

میجر حسن اسد اسے اپنے ساتھ لپٹائے لپٹائے مسند کی طرف آ گئے۔ رضا اسد نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ اپنی کہے جا رہا تھا۔

''فہد بھائی پرسوں میں آنکھ بچا کر ادھر آ گیا تھا۔ صبح آیا اور شام میں واپس چلا گیا۔ بس عظمیٰ بھابھی

کو مایوں میں بیٹھا دیکھنے کا شوق تھا۔''

''جی نہیں، صرف یہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ شاپنگ کرنے کا بھی۔'' رضا اسد نے اطلاع فراہم کی تو وہ ہنس پڑا۔

''میں نے کوئی خطا نہیں کی بھیا۔ وہ تو ممی نے کہا تھا۔ میں تو کسی سعادت مند خدمت گار کی طرح ان کے ساتھ رہا تھا۔ پپا کے اونچے عہدے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انٹرکان میں ایک عدد وقت کا کھانا آنٹی فیروز سے کھایا تھا اور بس۔۔ چلا گیا تھا۔'' وہ بے حد ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ رشتے دار لڑکیوں کا ہجوم اردگرد جمع تھا۔ محسن اسد متلاشی نظروں سے چاروں طرف جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ ہر چہرے پر شناسائی کے سائے ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے اپنی اور اس کی گفتگو یاد آرہی تھی۔ ایک ایک لفظ۔۔۔ حرف بہ حرف۔۔۔ اور خوامخواہ ہی میں شرمندہ سی ہوئی جارہی تھی۔ خدا کرے اسے کبھی یہ علم نہ ہو کہ فون پر میں نے اس سے بات کی تھی۔

''محسن بھائی، آپ کا فون۔'' کوئی لڑکی اس سے مخاطب تھی۔

''مگر کسی لڑکی کا تو نہیں نا۔'' اس نے خوف زدہ نظر آنے کی بھرپور کوشش کی۔ ''حیران ہوں یہاں پہنچتے ہی کسے ہماری ضرورت پڑ گئی۔''

''سر جوابا یہ گھبراہٹ کیسی؟'' جانے کون تھا پوچھنے والا۔

''گھبراہٹ سی گھبراہٹ سعدی بھائی۔ لڑکیاں پہلی بار بات ہوتے ہی رخصتی کا کہنے لگتی ہیں۔ سہرے دہرے کی بات کرنے لگتی ہیں۔''

میں جو نظریں جھکائے بیٹھی تھی بوکھلا اٹھی۔ جھٹ میری نظریں محسن اسد کے چہرے پر ٹک گئیں اور تو کوئی سمجھا یا نہیں پر محسن اسد مجھے پہچان گیا۔ نظروں ہی نظروں میں یہ پیام مجھے مل گیا کہ تم وہی ہو اور کوئی نہیں۔ پھر فون ریسیو کرنے چل دیا۔ محسن کے واپس آنے تک آنٹی اسد اور انکل بھی وہاں آچکے تھے اور ان کے ساتھ دوسرے رشتہ دار بزرگ بھی۔ مہندی کی رسم ہونے لگی۔ لبنیٰ نے نیگ وصول کیا۔ میجر حسن اسد ہتھیلی سامنے کیے چپ چاپ مہندی لگواتے رہے۔ لڑکیوں نے ڈھولک پھاڑ ڈالنے کی بھرپور سعی کی۔ رضا اسد اور میجر حسن اسد کے دوستوں نے نہ صرف ہتھیلی پر مہندی لگائی بلکہ چہرے اور بے داغ لباس کو بھی نشانہ بنایا اور حسن اسد خاموشی سے سماج کا یہ ظلم سہتے رہے۔ محسن اسد نے چاندی کے تھال میں سے مہندی لے کر حسن اسد کے ہاتھ پر رکھی۔ اس وقت سب لوگ حسن اسد کے اردگرد ہی تھے۔ محسن اسد نے سب کی آنکھ بچا کر میرے زرتار دوپٹے سے اپنے ہاتھ پونچھ لیے۔

''شکریہ۔ واش بیسن تک جانے سے بچا لیا آپ نے۔'' اپنے خوب صورت دوپٹے کا یہ حشر میرے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔

''یہ کیا کیا؟''

''میرا خیال ہے بتانے کی ایسی ضرورت بھی نہیں۔آپ دیکھ رہی ہیں۔''

''جانتے ہیں کتنا قیمتی دوپٹا ہے۔'' میں غصے میں تھی۔اپنے کپڑوں کی بے حد حفاظت کیا کرتی تھی۔میری آنکھیں بے بسی کے احساس سے بھر آئیں۔

''جی ہاں۔اور یہ بھی کہ مہندی رنگ کا ہے۔دیکھیے نا مہندی رنگ پر اگر مزید مہندی کا رنگ چڑھ گیا تو شان دوبالا ہو جائے گی۔''

وہ تو ذرّہ برابر بھی شرمندہ نہ تھا۔اس کی گہری نظریں ہنوز میرے سراپا پر جمی تھیں۔

''سخت غصے میں ہیں آپ۔کیا آپ کو اچھا نہیں لگ رہا کہ اس حرکت کے سبب شاید ہم ایک دوسرے کو بہت عرصے تک یاد رکھیں۔خصوصاً آپ۔کیونکہ رنگ آپ کے دوپٹے پر چڑھے گا۔''

''جی نہیں۔لگتا ہے آپ آداب سے بالکل ناواقف ہیں۔'' میں نے دل کا غبار نکالنا چاہا۔

''اتنا بگڑنے کی ضرورت نہیں۔لائیے میں دوپٹا دھولاتا ہوں۔'' آخری الفاظ تک وہ سعادت مند لگنے لگا تھا۔اس کی معصومیت پر میں بے اختیار مسکرا پڑی۔مصالحتی انداز نے مجھے بے حد نرم کر دیا۔

''چھوڑیے۔مہندی رنگ مہندی رنگ میں چھپ ہی جائے گا۔''

''چلیے خدا کا شکر ہے کہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی۔''

لڑکیاں ادھر متوجہ ہونے لگی تھیں۔میں وہاں سے کھسک گئی۔

دوسرے دن دولہا کے ساتھ دولہا کے بھائیوں کی سج دھج بھی دیکھنے کے قابل تھی۔لبنیٰ نے میرے لیے ڈارک بلیو بنارسی سوٹ کا انتخاب کیا تھا۔اور میرے بناؤ سنگھار میں بھی کوئی کمی اٹھا نہیں رکھی تھی۔بھاری بنارسی غرارہ سنبھالے بڑا سا دوپٹا اوڑھے میں تمام لوگوں میں کھڑی خوامخواہ ہی شرمائے جا رہی تھی۔مجھے خبر ہی نہ تھی کہ کب وہ میرے قریب آ کر رک گیا۔نظر اٹھی تو بس اٹھی ہی رہ گئی۔میں اسے پہچان بھی نہ پائی تھی۔سیاہ شیروانی، سفید براق پاجامے اور سلیم شاہی جوتے میں وہ مغلیہ عہد کا کوئی شہزادہ ہی نظر آ رہا تھا۔میرے متوجہ ہوتے ہی وہ مسکرانے لگا۔

''آپ وہی ہیں نا مہندی رنگ کے سوٹ والی۔واللہ میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔آپ یہ کیسے روپ میں سامنے آئی ہیں۔کسی مغل شہزادی کا گمان ہو رہا ہے۔'' میں لجا سی گئی۔

''آپ کا نام کسی سے پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا۔کیا آپ بتانا پسند کریں گی؟''

''فضہ عبداللہ خان۔'' بے اختیار میں کہہ اٹھی لیکن یہ نہ بتا سکی کہ میں ہیلتھ منسٹر کی اکلوتی بیٹی تھی۔یہ بات تو میں نے یہاں کسی کو بھی نہ بتائی تھی کیونکہ یہ میرے بابا عبداللہ خان کا حکم تھا۔میں پابندِ شرع خاندان کی پہلی بیٹی تھی جو تعلیم کی غرض سے تنہا اس شہر میں تھی اور پردے کی حدود و قیود سے آزاد تھی۔یہ سوچتے ہوئے مجھے خبر نہ تھی کہ میں مسلسل محسن اسد کو ہی دیکھ رہی تھی۔

''آپ یقیناً اس لباس کو دیکھ رہی ہیں۔دراصل کچھ تو مما کی خواہش تھی کچھ دخل میرے ارادے کا بھی۔میں نے سوچا اگر کوئی رخصتی پر آمادہ ہو جائے تو صرف سہرے میں چہرہ چھپانے والا مسئلہ ہی باقی

ہو۔اور سب کام تیار ہو۔'' وہ معنی خیز طریقے پر مسکرایا۔ میں سُرخ پڑ گئی۔

''آپ نے تو ایک غلط فہمی کو موضوع ہی بنا دیا۔ یقین جانیے میں سمجھی تھی میجر حسن اسد ہیں۔''

''چلیے کچھ بھی تھا۔ ہمیں تو خوشی ہے کہ وہ اتفاقی غلط فہمی بری نہ تھی۔ سچ جانیے ہم تو اسے زندگی کا حاصل سمجھ بیٹھے ہیں۔''

میں نے ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کی آواز سنی، دل میں اُتر گئی۔ آپ کی صورت دیکھی ساری دنیا سے مختلف اور جدا نظر آئی۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔''

''چلو یار باہر چلو۔ ڈیڈی تمہیں پکار رہے ہیں۔ نکاح ہونے والا ہے۔'' رضا اسد بڑی جلدی میں تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ محسن اسد ان کے ساتھ باہر کو چل دیا۔

اور میں لبنیٰ کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں خوشبوؤں کا راج تھا۔ یا بکھرے ہوئے کپڑے تھے۔ دروازہ لاک کر کے میں کتنی دیر دلِ نادان کو سنبھالتی رہی۔ آئینے میں اپنے آپ سے نظر ملاتے ہوئے بھی لاج سی آتی رہی۔ وہ شخص بھی تو میرے دل میں اتر گیا تھا۔ ساری دنیا سے جدا اور منفرد لگا تھا اس کے خمدار گھنیرے بالوں میں میرا دل کہیں اٹک کر رہ گیا۔ اس کی گمبھیر آواز کانوں میں سرور سا انڈیلتی رہی۔ رخصتی کے وقت بہ مشکل عظمیٰ جی تک جا سکی اور جب انکل عتیق عظمیٰ جی کو الوداع کہہ رہے تھے محسن اسد بھی پاس ہی کھڑا تھا۔

''ہم بہت جلد عبداللہ خان صاحب کے پاس حاضر ہوں گے کہ ایسی دعاؤں کے ساتھ فضہ عبداللہ خان کو ہمیں دے دیجیے۔''

جاتے جاتے بھی وہ سرگوشی کر گیا اور انجانی خوشیوں بھرے لمحوں کا تصور کر کے میں لجا سی گئی۔

ولیمے کی شام تیار ہوتے ہوئے میں نے خاصا اہتمام کیا۔ سفید کامدار ساڑھی اور سفید ہی بلاؤز کے ساتھ میں نے پلاٹینم کا خوب صورت نیکلس اور آویزے پہنے۔ موی ہاتھوں کی انگلیاں بقول لبنیٰ انگوٹھیوں سے سجی بے حد اچھی لگتی تھیں۔ سلور چین کی نازک سی رسٹ واچ کلائی میں باندھتے ہوئے مجھے بھی احساس ہوا کہ لبنیٰ سچ ہی کہتی تھی۔ جس وقت ہم لوگ اسد ولا پہنچے تقریباً مہمان آ ہی چکے تھے۔ رضا اسد اور محسن اسد داخلی گیٹ پر موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی محسن اسد کے لبوں پر ایک دل فریب اور آسودہ سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ بے اختیار میرے سراپا میں کھویا رہا۔ رضا اسد انکل عتیق اور آنٹی کو لے کر آگے بڑھ گئے لبنیٰ اپنی دوستوں میں الجھ گئی۔ جو گیٹ کے قریب تھیں۔ اور میں محسن اسد کے ساتھ اندر جانے لگی۔ اس کی کلائی کے گرد ایک خوب صورت گجرا لپٹا تھا۔ موتیے اور گلاب کے تر و تازہ پھولوں سے گندھا یہ گجرا۔ اس نے میری طرف بڑھایا۔

''اس حسین شام کے صدقے اسے شرفِ قبولیت بخش دیجیے۔'' وہ خاصا مرعوب سا لگ رہا تھا۔ کہیں سے بھی شوخی اور شرارت نظر نہ آ رہی تھی۔ اس کی پرکشش آنکھوں کی التجا جانے کیوں میں نہ ٹھکرا سکی۔

''شکریہ۔'' میں نے گجرا لے لیا۔

''آپ ہر بار نئے انداز میں سامنے آ کر صرف مجھے چونکاتی ہیں یا سب اہلِ محفل کو۔'' وہ ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''سوچتا تھا جو میری نظر کا انتخاب ہو سارے زمانے سے علیحدہ اور بے مثال ہو۔ بس آپ وہی ہیں فضہ عبداللہ۔ کیا سچ مچ آپ میرے لیے ہی اس دنیا میں آئی ہیں؟''

نگاہوں میں جہانوں کی پیاس لیے وہ مجھے تک رہا تھا۔

''ہاں محسن اسد! میں نے تو شاید کبھی کسی کے بارے میں سوچا تک نہ تھا لیکن تمہیں دیکھ کر یہ خیال آیا کہ تم میرے لیے ہی ہو۔'' یہ سوچتے ہوئے ایک فخر وانبساط کا احساس رگ وپے میں اتر گیا۔ گجرا میں نے گلے میں ہی ڈال لیا کہ اس کا سب سے مناسب مقام یہی تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے محسن اسد میرے قریب ہی رہا۔ پھر اس نے اپنے چند دوستوں سے بھی میرا تعارف کرایا اور جب میں عظمیٰ جی کے پاس بیٹھی رضا اسد کی دل چسپ باتوں میں کھوئی تھی میں نے ہال کے دوسرے کونے کی طرف دیکھا۔ محسن اسد دریچے میں کھڑا اتنا اداس لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے وہ ہنسا بولا تک نہ ہو۔ جی چاہا بھاگ کر اس کے پاس چلی جاؤں لیکن کچھ آدابِ محفل بھی تھے۔ تھوڑی دیر بعد لبنیٰ کہیں سے آئی۔

''فضہ! لان میں تمہاری کچھ دوست موجود ہیں اور تم سے ملنے کی خواہش مند۔''

میں تو محسن اسد کی ذات میں گم تھی۔ اس دخل در معقولات پر مجھے غصہ آیا لیکن باہر چل دی۔ وہ ہماری کالج فیلو تھیں بڑی مشکل سے چند منٹ ان کے ساتھ گزار کر میں لوٹی تو کاریڈور میں مجھے محسن اسد مل گیا۔ وہی لٹالٹا انداز۔۔۔ ویسا ہی کھویا کھویا۔ اس کی نگاہیں بڑی پُراسراری لگ رہی تھیں۔ لیکن مجھے ان نگاہوں سے خوف محسوس نہیں ہوا۔ میرے اندر کی عورت اس راز سے واقف ہو گئی تھی۔ یہ نگاہیں ایک پیغام لیے پھر رہی تھیں۔

''فضہ عبداللہ!'' وہ جلدی سے میرے قریب آیا۔ ''میرا کمرا نہیں دیکھیں گی؟''

خواب ناک سے ماحول میں ہر چیز مجھے محسن اسد کی نظروں کی طرح پُراسراری لگ رہی تھی۔ لمحہ بھر دروازے پر رکی رہی۔ پھر محسن اسد نے مجھے صوفے پر لا بٹھایا۔ گھڑیاں خاموشی سے بیتی جا رہی تھیں۔ محسن اسد میرے سامنے بیٹھا شاید بات کرنے کے لیے الفاظ ہی نہ ڈھونڈ پا رہا تھا۔

''فضہ عبداللہ! سچ بتائیے آپ کوئی ساحرہ ہیں کیا؟ آپ نے مجھے ایک دم بے چین و بے قرار کر دیا ہے حالانکہ ایسا تو میں کبھی نہ تھا۔ ابھی تو میں نے زندگی کے لیے بہت کچھ کرنا تھا۔ ابھی تو مجھے آگے جانا

تھا۔آپ میرے حواس پر چھا گئی ہیں۔فضہ عبداللہ! کیا آپ کے دل میں بھی۔۔۔؟''

وہ بات مکمل نہ کر سکا۔خاموش ہو گیا۔

''محسن اسد! فضہ بھی تو سخت بے چین ہے۔بے قرار ہے۔وہ بھی سرتاپا تمہاری محبت میں غرق ہے۔اسے بھی تمہارے اقرار کی طلب ہے۔''

میری نظروں کا خاموش پیام با آسانی اس کے دل تک رسائی پا گیا۔ماحول کی فسوں خیزی پر میں گھبرا گئی۔موضوع بدل دینا چاہا۔

''آپ کب جا رہے ہیں؟''

''ابھی کچھ دیر بعد۔اسی لیے تو اس قدر بے چین تھا کہ کہیں دل کی بات آپ تک پہنچائے بغیر ہی نہ جانا پڑ جائے۔''

''پھر کب آئیں گے۔'' یہ بے تاب دل کا سوال تھا۔محسن اسد ایک دم ہی مجھے بھی ذات کی اہم ترین ضرورت لگنے لگا تھا۔

''آپ منتظر رہیں تو بار بار آئیں گے۔بہت جلد آئیں گے۔'' میری بے تابی اسے پسند آئی تھی۔ بے حد خوش نظر آنے لگا تھا۔

''اتا پتا جاننے کی ضرورت تو نہیں پھر بھی اس قدر ضرور پوچھوں گا کہ۔۔۔۔'' وہ میری جائے رہائش کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔میں نے فوراً جواباً کہا۔

''ملتان۔''

''ٹھیک ہے۔اتنی راہنمائی کافی ہے۔باقی معاملات میں بندہ اپنی دانش استعمال کر کے عبداللہ خان صاحب کے درِ اقدس تک پہنچ جائے گا۔'' میں اس کا مطلب جان کر شرما سی گئی۔

❁❁❁❁

''فضہ۔۔۔!''

''ہوں۔۔۔''

''اتنی خاموش کیوں ہو؟''

''وہم ہے تمہارا۔ٹھیک ٹھاک ہوں میں۔''

میں نے صورت حال مخفی رکھنے کی کوشش کی۔عجیب موسم دل و ذہن پر چھایا تھا۔خزاں کے موسم سے ملتا جلتا۔دل کہیں لگ ہی نہ رہا تھا۔صبح سے کئی بار میں مہندی رنگ کے اس دوپٹے کو دیکھ چکی تھی جس پر محسن کے ہاتھوں کا لمس اب بھی محسوس ہو رہا تھا۔میں نے وہ سوکھی مہندی اتارنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ آج ویک اینڈ تھا۔لبنیٰ کے اصرار کے باوجود میں اس کے گھر نہیں جا رہی تھی۔بلکہ اسے بھی ہوسٹل میں ہی روک رکھا تھا۔دل بے طرح اداس تھا۔لڑکیاں پکنک کی غرض سے شالامار جا چکی تھیں۔ہوسٹل میں تنہائی اور ویرانی تھی۔کبھی کبھی میٹرن کی آواز سناٹوں کو چیر دیتی یا ٹیلی فون کی گھنٹی۔لبنیٰ بھی مجھ سے تنگ آئی بیٹھی

تھی، بولی۔
''اگر ٹھیک ٹھاک ہو تو چلو۔ ایک چکر عظمیٰ جی کے گھر کا لگا آتے ہیں۔ بہت دن ہوئے اسد ولا میں گئے ہوئے۔ اور سنو فضہ کل شام محسن کا فون آیا تھا۔ تمہارا پوچھ رہا تھا۔ آج گیارہ بجے آ گیا ہوگا گھر۔ چل نا یار اچھی گزر جائے گی۔''
میرا دل دھڑک دھڑک اٹھا۔ فضائیں بول اٹھیں۔ تنکا تنکا پکارنے لگا۔ خوشی بن کر رقص کرنے لگا۔
ظاہر داریوں کا بھرم رکھنے کی خاطر میں نے کہا۔
''نہیں۔ جانا ہو تو تم چلی جاؤ۔ میرا کچھ اسٹڈی کرنے کا موڈ ہے۔''
''فضہ پلیز۔ دیکھو نا اکیلی جاتی ہوئی اچھی لگوں گی۔ چلی چلو میجر حسن اسد بھی تمہیں بے حد یاد کرتے ہیں۔''
''ہاں ہاں۔ یہ بھی تو کہو کہ ڈاکٹر رضا اسد بھی مجھے بے حد مس کرتے ہیں۔'' میں نے اسے چھیڑا۔
''واہ! تمہیں کیوں مس کرنے لگے؟'' لبنیٰ نے جھٹ کہا۔
''اسی لیے تو کہتی ہوں زیادہ ہی ملنے ملانے کا شوق ہو رہا ہے تو میں فون کیے دیتی ہوں۔ آنے بہانے اسد ولا جانے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر لینا تفریحی جگہوں پر کر لینا تجدید عہد۔''
''چلنا ہے تو چلو ورنہ میرا دماغ نہ چاٹو۔'' لبنیٰ چڑ گئی۔
''چلو کیا یاد کرو گی۔ تمہاری منت سماجت ضائع ہو فضہ کو یہ گوارا نہیں۔'' میں نے رعب جمایا۔
اور جب ہم فٹ پاتھ پر کھڑے ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے میجر حسن اسد کی گاڑی عین ہمارے سامنے آ کر رکی۔
''ہیلو گرلز۔'' گاڑی روک کر وہ کھڑکی سے باہر جھانکے۔
''ہیلو حسن بھائی۔'' لبنیٰ کے ساتھ ساتھ میں بھی انہیں دیکھ کر خوش ہو گئی۔
''واہ بھئی واہ! آج تو ہم نے مان لیا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ سچ بتانا گرلز تم ہماری طرف ہی آ رہی تھیں نا۔'' وہ بڑے خلوص سے کہہ رہے تھے۔
''اور جا بھی کہاں سکتے ہیں حسن بھائی۔'' لبنیٰ نے جواباً کہا۔
''ہاں ملا کی دوڑ مسجد تک۔ لبنیٰ جی کی دوڑ ڈاکٹر رضا اسد کے در دولت تک۔'' میں نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے تو لبنیٰ مجھے کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھتی گاڑی میں جا بیٹھی۔ گیٹ پر محسن اسد مل گیا۔ لگتا تھا وہ اسی انتظار میں ہی کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر خوش گوار دھڑکنیں من میں ہلچل مچا گئیں۔
''میجر حسن اسد ہمیشہ سے میرے محسن تھے۔ آج تو احسانوں کا بوجھ کچھ اور بھی زیادہ ہو گیا۔''

محسن نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔
''وہ کیسے؟'' میں نے فوراً پوچھا۔
''انہیں میں نے ہی تو بھیجا تھا۔ بے چارے دوڑے چلے گئے۔'' میں نے رک کر ایک نظر اسے دیکھا تنبیہی انداز میں۔
''سچ فضہ عبداللہ تم بن خود کو ادھورا محسوس کرنے لگا ہوں اتنے بڑے گھر میں بلکہ اتنے خوب صورت شہر میں دل کہیں بہلتا نظر نہیں آرہا تھا۔ ہوسٹل کے باہر کتنے چکر لگا لیے میں نے صبح سے۔ لیکن اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ دراصل ایک بہت بڑی خبر تھی۔''
لبنیٰ کو ادھر متوجہ ہوتا دیکھ کر میں آگے بڑھ گئی۔ محسن کی بات ادھوری رہ گئی۔ رضا اسد ڈرائنگ روم کے دروازے پر مل گئے۔
''ایک بہت بڑی خوش خبری۔'' وہ چلائے۔
لبنیٰ کے ساتھ ساتھ میں بھی ہمہ تن گوش ہوگئی۔
''رضا بھائی۔ پلیز ایسے نہیں بتایئے۔'' محسن اسد نے فوراً انہیں ٹوکا۔
''تو کیسے؟'' رضا اسد نے پوچھا۔
''مابدولت جب یونیفارم میں ان کے سامنے آئیں گے تو خود بخود ہی یہ خبر ان تک پہنچ جائے گی۔''
''اوہ تو محسن جی! اس کا مطلب ہے کہ آپ خیر سے فلائٹ لیفٹیننٹ ہوگئے۔ مبارک ہو۔ مبارک ہو۔ بس ایک منٹ سے بھی قبل ہمارا منہ میٹھا کرایا جانا چاہیے۔'' لبنیٰ نے ایک دم ہی مٹھائی کا مطالبہ کر ڈالا۔
''دھیرج ڈیئر کزن دھیرج۔ اسی لیے تو آپ کو بلوایا ہے۔ کل شام کچھ لوگوں کو بلایا ہے ہم نے۔ پھر آپ تو خصوصی مہمان ہیں۔ جی بھر کے منہ میٹھا کیجیے گا۔''
''اے۔۔۔'' لبنیٰ کے تیور بدل گئے۔
''جی فرمایئے۔'' محسن نے امپریس ہونے کی اداکاری کی۔
''ہمارا شمار عوام الناس میں کب سے ہوگیا۔ اس گھر میں آخر ہماری بھی کوئی حیثیت ہے۔''
''بجا فرمایا آپ نے۔ رضا بھائی پلیز ان کا منہ میٹھا۔۔۔'' محسن نے یہ ذمہ داری رضا اسد پر ڈالی۔
''تو یہ منہ میٹھا یہاں پر نہیں ہوسکتا۔ جانا پڑے گا ہمارے سنگ۔''
''کہاں؟'' لبنیٰ کے بجائے میں بول اٹھی۔
''جہاں ہم لے چلیں۔'' رضا اسد کی جگہ محسن نے جواب دیا۔
''چلیے چلیے انکار کسے ہے بھلا۔ لیکن ون منٹ میں ذرا عظمیٰ جی سے مل لو۔'' لبنیٰ اندر بڑھ گئی۔

اتنے میں میجر حسن اسد بھی ہمارے پاس آ گئے۔
''گڈ گرل۔ تم نے محسن کو مبارک دی؟'' آتے ہی وہ مجھ سے مخاطب تھے۔ میری نظریں ان کی طرف اٹھیں اور پھر بے اختیار محسن پر جا ٹکیں۔
''جی نہیں۔ کیا خبر یہ بات کہاں تک درست ہے۔ جب تک ہم انہیں یونیفارم میں نہیں دیکھیں گے ایک لفظ بھی نہیں کہیں گے۔ ہوسکتا ہے یہ سرگودھا میں تیل بیچتے رہے ہوں۔'' میں شوخ سی ہوگئی۔
''محترمہ! یقین کیجیے، کے۔ جی سے لے کر اب تک ہم نے فارسی کا ایک لفظ نہیں پڑھا پھر تیل کہاں سے بیچتے۔''
''تیل بیچنے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے آپ پر والا جہاز اڑانے کے بجائے بے پر کی اڑاتے رہے ہوں۔''
میجر حسن اسد ان لمحوں میں تشویش ناک حد تک سنجیدہ لگ رہے تھے۔ رضا اسد کے ساتھ ساتھ میں بھی ہنس پڑی۔
''جی ہاں، یہ تو تب ہی پتا چلے گا جب کل میں اپنا جہاز عین اس وقت اس علاقے میں لاؤں گا جب آپ صاحبان لان میں خوش گوار فضاؤں کا لطف اٹھا رہے ہوں گے۔'' محسن نے ہنس کر جواب دیا۔
تب رضا اسد نے بتایا محسن کو جاب لاہور میں ہی ملی تھی۔ اور کل ہی اسے ڈیوٹی جوائن کرنا تھی۔
کیفے کا رخ کرتے ہوئے ہمارے ساتھ عظمیٰ جی بھی تھیں۔ خنک ماحول میں لذیذ اور پُر لطف کھانا کھاتے ہوئے دل چسپ گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ واپسی میں رضا اسد لبنیٰ کے ساتھ چلے گئے۔ میجر حسن اسد کو اپنا ایک ضروری کام یاد آ گیا اور محسن اسد مجھے اور عظمیٰ جی کو گھر لے آیا۔ خوش گوار دنوں کی خوب صورت سی سہ پہر۔۔۔ میں محسن کے ساتھ تھی۔ عظمیٰ کافی دیر ہمارے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہیں۔ ان دنوں وہ بے حد اَپ سیٹ تھیں۔ بس آرام ہی آرام مطلوب تھا انہیں۔
میجر حسن اسد نے زبردستی ہم دونوں کی چھٹی کرادی اور ہوسٹل سے رات کے قیام کی اجازت بھی لے آئے۔
شام کو میں بڑے دنوں بعد کسی گھر کے کچن میں تھی۔ جانے کہاں سے خانہ داری کا شوق آن ٹپکا تھا۔ میں نے اور لبنیٰ نے رات کا کھانا اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ مرغ روسٹ کیا۔ بریانی دم پر لگائی، رائتہ بنایا، سلاد کے لیے تمام سبزیاں نفاست کے ساتھ سجائیں اور اس کے بعد ڈاکٹر رضا اسد کی پسند پر قنجن بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

چاول اُبال کر ایک طرف رکھے ہی تھے کہ محسن اسد کچن میں آ گیا۔ لبنیٰ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ میں نے جلدی سے گھی دیگچے میں ڈالا۔ کڑکڑاتے ہوئے گھی میں چینی اور دو پیالیاں پانی ڈال کر چاشنی تیار کرنے لگی۔ محسن کی گرم جوش نگاہوں کے زیر اثر میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ چمچہ ہلاتے ہوئے بار ہا ہاتھ گڑبڑائے۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ بازو سینے پر لپیٹے وہ عین قریب کھڑا میری ہر حرکت کو بنظر غور دیکھ رہا تھا۔

''کچن انوکھی اشتہا انگیز خوشبوؤں میں بسا تھا۔ خانساماں کے بدلے رویّوں کا سوچ کر ادھر چلا آیا۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ خانساماں کے رویے نہیں انسان بدلا ہوا ہے۔ آپ کی ماما بہت سلیقہ مند خاتون لگتی ہیں۔ انہوں نے آپ کو بہت سکھا دیا ہے۔ مشکور ہوں ان کا۔'' وہ بے حد خوش تھا۔ اب اسے کیا خبر کہ اپنے محل نما گھر میں مجھے ہل کر پانی پینے کی اجازت نہ تھی۔ یہ سب کچھ تو میں نے اپنے شوق اور محنت سے سیکھا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ والہانہ وارفتگی سے مجھے تکتا ہوا شاید میرے دل میں اُتر جانے کا خواہاں تھا۔

''فضہ ۔۔۔ فضہ ۔۔۔! پاپا چاہتے ہیں رضا بھائی کے ساتھ ہی وہ میری شادی کے فرض سے بھی سبک دوش ہو جائیں۔ فضہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ زندگی کا سفر ہم تم مل کر ہی طے کریں۔ تم میرا انتخاب ہو فضہ۔ دیکھو اقرار کے خوب صورت لفظ ہاں سے میرا دستِ سوال بھر دو۔ پلیز فضہ۔''

محسن اسد چند ماہ میں میری خاطر اتنا سنجیدہ تھا۔ کائنات کا پہلا مرد جسے میرے دل تک پہلے روز ہی رسائی ہو گئی تھی۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہ مجھے یوں طلب کرے گا۔

''آہم ۔۔۔ آہم ۔۔۔'' کوریڈور سے لبنیٰ کے کھنکھارنے کی آواز آئی تو میں چونکی۔ میں نے جلدی سے چاول دیگچے میں ڈال کر انہیں ہلایا۔ لب و رُخسار کی سرخی کا احساس خود مجھے بھی ہو رہا تھا۔ میں نظریں اٹھا ہی نہ پائی۔ نظریں ملانے کی ہمت جو نہیں تھی۔

''لبنیٰ جی! سخت بھوک لگ رہی ہے۔ ایمان سے کچن آپ لوگوں نے کیا سنبھالا ڈنر کا ٹائم ہی بدل گیا۔''

''اطلاعاً عرض ہے کہ ایسا کوئی کڑا وقت نہیں ہے صرف ساڑھے سات بجے ہیں جبکہ حسن بھائی نو بجے سے قبل کھانا کھاتے ہی نہیں ہیں۔''

''حسن بھائی کا خیال، رضا بھائی کا خیال کبھی ہمارا خیال بھی رہتا ہے آپ کو؟''

''آپ کا خیال کرنے والے سلامت رہیں۔ ہمیں کیا پڑی ہے۔'' میں نے اُسے گھورا۔ محسن اسد باہر کو بھاگا۔

''سویرے تو یہاں آنے پر سو بار انکار تھا اور اب یہ حالت ہے فضہ کی بچی۔ ہماری بلّی ہمیں ہی میاؤں۔ تجھے تو سمجھ لوں گی۔'' اس کے جاتے ہی لبنیٰ نے مجھے جھاڑ پلائی۔ میں سرخ ہوتی ہوئی مسکراتی رہی۔

''جو کہتی رہو۔ تمہیں اختیار ہے ہمیشہ الٹی سیدھی بکا کرتی ہو۔''
''خیراب تو سیدھی سادھی آنکھوں دیکھی ہی کہہ رہی ہوں۔ تو یہ چکر تھا میں بھی کہوں صبح نخرے بازی آخر کس سلسلے میں تھی۔ اب یہ منت سماجت کا چکر تو وہ فضائیہ کے ہواباز ہی چلا سکتے ہیں ہم تو کان کھینچ کر ہی رکھیں گے۔''
میں نے متنجن میں پھر چمچہ ہلایا۔ پانی خشک ہو چکا تھا۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ یہ کیا چاول تو اس قدر سخت ہو گئے گویا انہیں ابلنے کا تو کیا بھیگنے کا شرف بھی حاصل نہ رہا ہو۔ سخت سراسیمگی کے عالم میں میں نے دم لگا دیا۔
کھانے کی میز پر دوبارہ جو دیدار نصیب ہوا تو حالت پہلے سے بھی ابتر تھی۔ باقی سب کھانوں کا کریڈٹ رضا اسد بڑے فخر سے لبنیٰ کو دیے جا رہے تھے جبکہ متنجن کی بربادی کا الزام خالص میرے نام تھا۔ اور لبنیٰ صاحبہ اس کی چشم دید گواہ۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔
''بتا دو سب کو۔ متنجن تو بس ناز نخروں کی نذر ہو گیا ہے۔''
لبنیٰ کا فقرہ محسن اسد کے کانوں نے بھی سن لیا۔
''یہ سچ مچ آپ کی کاوش ہے فضہ عبداللہ۔''
محسن یکسر انجان بنا مجھ سے پوچھ رہا تھا جو کہ اس سانحے کا اصل ذمہ دار تھا۔ مجھے تو اس توہین پر سچ مچ رونا ہی آ رہا تھا۔
''اگر یہ آپ نے ہی بنایا ہے تو پھر انعام کی مستحق ہیں۔'' وہ اب بھی انجان ہی بنا تھا۔
''باخدا ایسا متنجن نہ آج تک کسی نے بنایا تھا نہ کوئی بنائے گا۔'' وہ جانے کس انداز میں کہہ رہا تھا۔
''اظہارِ وفا کے لیے ایسی غیر مناسب جگہ کا انتخاب نہ پہلے کسی نے کیا تھا اور نہ آئندہ کوئی کرے گا۔'' لبنیٰ نے ایک اور سرگوشی کر کے مجھے تنگ کرنے کی کوشش کی۔
''تمہارا کیا خیال ہے لبنیٰ! میں میز چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی جاؤں؟'' میں سچ مچ ناراض ہو گئی تھی لبنیٰ سے۔
''اوہ نو۔ نیور۔۔ مائی سویٹ فضہ عبداللہ! باخدا میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں بلکہ دعا ہے کہ تم مستقل اسی میز پر ہی کھانا کھاؤ۔ ہمیشہ ہی ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے۔'' اس کے لہجے میں شرارت کے ساتھ خلوص کی سنجیدگی بھی تھی۔ اس کے یہ الفاظ میرے من میں جل ترنگ سا بجا گئے۔

❀❀❀❀

صبح دم ابھی میں کمرے میں ہی تھی۔ ناشتے کی میز لگ چکی تھی اور لبنیٰ مجھے آنے کا کہہ کر باہر جا چکی تھی۔ میں آئینے کے سامنے کھڑی اپنا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔ تبھی آئینے کی سطح پر اچانک ایک چہرہ ابھرا تو میں نے یک دم پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

فضائیہ کی نئی نئی اُجلی یونیفارم میں وہ بے حد نکھرا نکھرا اور روز سے یکسر مختلف لگ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت و جامد سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ پی کیپ سے ذرا نیچے اس کی بڑی بڑی ساحر آنکھیں گاگلز کی اوٹ سے بھی والہانہ انداز سے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

بے حد شاندار لگ رہا تھا وہ نظر لگ جانے کی حد تک۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر میرے قریب آیا اور مجھے سیلوٹ دے مارا۔ دوسرے ہاتھ میں موی لفافہ تھا جس میں سے بیلے اور گلاب کے پھول شوخی کے ساتھ جھانک رہے تھے۔

اس نے لفافہ میری طرف بڑھایا۔

''فضہ عبداللہ کے لیے اپنی زندگی کے اہم ترین دن اس سے قیمتی کوئی تحفہ منتخب نہ کر سکا۔''

''مگر صبح ہی صبح۔۔۔؟'' میں بے حد حیران تھی۔

''جی ہاں، صبح ہی صبح۔ دیکھیے نا کسی مالی کا بیٹا تو نہیں ہوں کہ صبح ہی باغوں میں جا کر آپ کے لیے گجرا گوندھتا۔ رات کو لبنیٰ نے ایک پل کے لیے آپ کو تنہا نہ چھوڑا۔ میں نے گجرا ریفریجریٹر میں رکھ دیا تھا۔ لایا تو رات انارکلی سے تھا۔''

لگتا تھا محسن کو پھولوں سے بے حد پیار تھا۔ دوسری بار وہ مجھے تحفے میں یہ پھول دے رہا تھا۔

میں نے انہیں بالوں میں سجا لیا اور اس کے ساتھ ہی باہر چلی آئی۔ شام کو ہوسٹل واپس آنے تک وہ ہنوز میرے بالوں میں تھے اور اُن کی مہک مجھے محسن کی قربت کا احساس بخش رہی تھی۔

❁❁❁❁

امتحان ختم ہونے تک میں اور محسن اجنبیت کی ساری دیواریں عبور کر کے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ یوں لگتا کہ دوری تو کبھی تھی ہی نہیں۔ ازل سے ہم دونوں کا ساتھ تھا۔

اس قربت کو لبنیٰ کی شادی نے اور بھی جلا بخش دی جو رضا اسد کی ضد پر ہنگامی طور پر سلیبریٹ کی گئی تھی۔ لبنیٰ نے بے حد شور مچایا لیکن اس کے احتجاج کو ذرہ برابر اہمیت نہ دی گئی۔

عظمیٰ جی ان دنوں بس مکمل طور پر بیڈ پر ہی تھیں۔ لہٰذا تمام انتظامات میں مجھے ہی پیش پیش رہنا پڑا۔ محسن کے سب دوست مدعو تھے۔ ہم لوگوں نے بھی اپنے کالج کی کافی لڑکیوں کو مدعو کیا تھا۔

میری واپسی میں چند روز باقی تھے۔ امتحانوں سے فراغت کے بعد دل و دماغ ہر قسم کے بوجھ سے آزاد تھے۔ میجر حسن مجھے عزیز ترین بہن کی طرح چاہتے تھے۔ ان کے حکم پر میں نے یہ چند دن ان کے ساتھ ہی گزارے۔

ایک سہ پہر جبکہ شام کے سائے ابھی کچھ دور ہی تھے۔ عظمیٰ جی سب کے ساتھ لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ محسن ابھی ابھی ڈیوٹی سے آف ہو کر آیا تھا۔ یونیفارم میں ہی تھا چائے کی شدید طلب محسوس کرتے ہوئے ہم سب میں بیٹھ گیا۔ لبنیٰ، میں، ڈاکٹر رضا اسد اور خود میجر حسن اسد آنے والے بچے

کے نام کے بارے میں سوچتے ہوئے شدّ و مد سے اپنا اپنا موقف بیان کر رہے تھے۔ مختلف نام سامنے تھے۔ فیصلہ نہ ہوسکتا تھا کہ کون سا نام موزوں ترین ہے۔ لبنیٰ کی اپنی پسند تھی۔ رضا اسد کی علیحدہ رائے تھی۔ میجر حسن اسد بے چارے تو اپنا کوئی حق ہی نہ سمجھ رہے تھے۔ بس ہم لوگوں کے تجویز کردہ ناموں پر تبصرہ کر رہے تھے۔

''بس کہہ جو دیا ہے۔ فائنل نام ماورا ہی ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں فیصلہ سنا دیا۔

''ہمارے ہونے والے بھانجے صاحب کا نام طلحہ ہی ہوگا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' لبنیٰ نے کہا۔

''کیا بات ہے؟ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔'' محسن پریشان تھا۔

''بس احمقوں کی بحث ہے داناؤں کی سمجھ میں کہاں سے آئے گی۔'' عظمیٰ جی نے حصہ لیا گفتگو میں۔

''بھئی بات یہ ہے کہ گھر میں فرقہ واریت پیدا ہوگئی ہے۔ ایک فریق کا کہنا ہے کہ بیٹا ہوگا جس کا نام طلحہ رکھا جائے گا جبکہ دوسرے فریق کا موقف ہے کہ بیٹی ہوگی جس کا نام ماورا رکھا جائے گا۔''

''ماورا۔۔۔ لاحول ولا۔ یہ بھی کوئی نام ہے۔ کس نامعقول نے یہ نام سوچا؟'' محسن نے پیالی میز پر رکھی۔ میں نے اسے گھورا۔ لبنیٰ نے الزام دھرنے کے انداز میں کہا۔

''یہ محترمہ فضہ عبداللہ کو سوجھا ہے کل شام سے۔''

''ایک دم غیر دلچسپ، حسن بھائی! لوگوں کو آپ نے یہ اجازت کیوں دی کہ وہ آپ کے بچوں کے دنیا میں آنے سے قبل ہی ان کے الٹے سیدھے نام رکھ کر غریبوں کی پرسنالٹی خراب کریں۔'' وہ بھی حرفوں کا بنا تھا۔ مخالفت میں بولنے کا ڈھنگ جانتا تھا۔ میجر حسن سمیت سب ہنس پڑے اور میں جل بھن گئی۔

''اور جناب انہیں کہاں سے خبر ہوئی کہ بیٹی ہوگی۔ ہمیں تو بیٹا چاہیے۔ اپنے جیسا گبرو جوان۔'' اس نے اپنے آپ کو دیکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

''تو منہ دھو رکھیے۔ آپ کوئی غیب دان تو نہیں ہیں۔'' میں چڑ گئی۔

''ٹھیک ہے ہو جائے بیٹی لیکن یہ سن لیں کہ اس کا نام ماورا نہیں ہوگا۔'' اس نے بات ختم کی تو لبنیٰ نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں برتن سمیٹنے کے بہانے اٹھی اور برتن لے کر اندر ہی چلی گئی۔

شام ڈھل چکی تھی۔ اذانیں چہار سو گونج رہی تھیں۔ میں نے وضو کر کے جائے نماز کا رخ کیا۔

ابھی نماز پڑھ کر ہٹی ہی تھی کہ محسن وہیں آ گیا۔ قالین پر بیٹھتے ہوئے اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''دیکھو بیٹی ہونے کی دعا نہ مانگنا'' میں نے دعا مکمل کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
''مجھے حق ہی کیا ہے۔''
''ہاں، میں تو یہ قرارداد اسمبلی تک بھجوانے کی سوچ رہا ہوں کہ ہر انسان کو صرف اپنے بچوں کے نام رکھنے کا حق ہونا چاہیے۔'' ضبط کے باوجود ہنسی پھوٹ پڑی۔
''پگلی'' وہ سنجیدہ تھا۔ ''ناراض ہوگئیں۔'' اس نے جھک کر مجھے دیکھا۔
''باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں آپ کی۔''
''ارے بھئی تم سے کس نے کہا کہ اتنے پیارے نام لوگوں کو دان کرتی پھرو۔''
میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''ہم اپنی بیٹی کا نام ماورا رکھیں گے ٹھیک ہے نا۔ ماورا کا مطلب جانتی ہو۔ مجھے تو بہت پسند ہے یہ نام۔''
کیا تھا یہ شخص۔ وہاں کس مزے سے تنقید کر رہا تھا اور اب۔
''اف محسن! اللہ تم سے سمجھے۔'' لبنیٰ وضو کر کے باتھ روم سے نکلی۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔
''اچھا، اچھا تو یہ پیش بندی صرف اپنی خاطر تھی۔ بہت چالاک ہو بچو! سمجھ لیں گے تمہیں بھی۔''
محسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔
''ارے آپ کو کیا لبنیٰ بھابھی! آپ تو ویسے ہی بیٹیوں کے حق میں نہیں۔ یقین کریں ہم اپنے بیٹے کا نام طلحہ نہیں رکھیں گے۔''
میں صادق گنج لوٹ آئی، ہزاروں وعدہ ایفائی کے وعدوں سمیت سب لوگ مجھے چھوڑنے آئے۔ ایئرپورٹ پر پورا وقت محسن میرے ساتھ رہا۔
''میں انتظار کروں گا فضہ عبداللہ آخری سانس تک۔ ویسے تم بڑی ظالم ہو۔ کم از کم فون نمبر ہی دے دو۔''
''آپ اسی شہر لاہور میں ہی ہیں نا اسی ملک پاکستان میں، اگر آپ کسی اور ملک میں بھی چلے جائیں فضہ آپ کو ڈھونڈ لے گی محسن! مجھ پر یقین رکھیں۔''
''اوکے۔'' وہ دل پر جبر کر کے مسکرایا۔
صادق گنج کے در و دیوار بھی مجھے پا کر خوش تھے۔ کجا صادق گنج کے باسی۔ بابا جان ان دنوں اسلام آباد میں تھے۔ آتے ہی میں نے فون پر ان سے بات کی اور بتایا کہ ان کے حکم کے مطابق میں نے ایم۔اے کرنے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔
لبنیٰ کو اپنے بخیریت یہاں پہنچ جانے کی اطلاع بھی دی۔ محسن اسد گھر پر نہ تھا۔ اس سے بات نہ ہو سکی۔

دراصل ان سب لوگوں کے لیے میری ذات ایک معمہ تھی۔ وہ سب یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں کون تھی۔ کالج میں بھی میرا ایڈریس ملتان میں موجود ایک بہت پرانی قیام گاہ کا تھا۔ اگر انہیں علم ہوتا کہ میں نواب عبداللہ خان کی اکلوتی نورِ نظر ہوں تو شاید لبنیٰ عتیق کبھی میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی جرأت ہی نہ کر پاتی۔ میں چاہتی تھی کہ اب اپنا آپ ان سب پر عیاں کر دوں لیکن اس سے قبل میں بابا جان سے بات کرنا چاہتی تھی۔

بابا جان لوٹے تو آتے ہی انہوں نے ایک تقریب منعقد کی، میرے بخیر و عافیت گھر آجانے کی خوشی میں۔ جس میں سرفراز خان بھی شریک تھا۔ بڑی مدت بعد میں نے اپنے چچا کے بیٹے سرفراز کو دیکھا تھا۔ بھاری بھرکم سحر انگیز شخصیت کا مالک سرفراز خان بے حد خوبرو جوان تھا۔ بالکل رومی شہزادوں کی مانند سرخ و سفید اور جسیم۔ تقریب میں وہ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن میں بھلا کیسے توجہ دے پاتی۔ میرا دل، میرا دماغ اسد ولا کی رونقوں کی یاد میں تھا۔ جہاں زندگی ہر قسم کی تصنع اور بناوٹ سے پاک تھی، جہاں پُرخلوص دل تھے اور سچی مسکراہٹوں سے جگمگاتے چہرے۔

❁❁❁❁

''امی جان! پلیز آپ یہ بات من و عن بابا جان کو بتا دیجیے۔''

''فضہ بیٹی! خاندان میں آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

''میں آپ کی بیٹی ہوں امی جان! جسے آپ دنیا کے خزانوں پر ترجیح دیتی ہیں۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ مجھے ایک باشعور لڑکی ہونے کے ناتے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں اسے پسند کرتی ہوں۔''

''تمہیں علم ہے نا تم پیدا ہوتے ہی سرفراز خان کے نام لگا دی گئی تھیں۔'' امی جان نے مطلع کیا۔

''یہ سب زمانہ جاہلیت کی فرسودہ رسمیں ہیں۔ ہم نئے اور باشعور دور کی پیداوار ہیں۔ شادی میرا مسئلہ ہے۔ لڑکا اور لڑکی دونوں کا رضامند ہونا ضروری ہے۔ میں اس کے بغیر سہولت سے نہ جی سکوں گی۔ امی جان! پلیز آپ بابا جان کو قائل کر لیجیے۔ وہ ایک بار اس سے مل تو لیں، اسے دیکھ تو لیں۔''

''فضہ! تم نادان ہو۔ معاشرے میں اپنے باپ کی حیثیت کا اندازہ لگاؤ اور پھر کوئی ایسا فیصلہ کرو۔''

''کم وہ بھی نہیں ہے اس کے ڈیڈ می سفارت کار ہیں، آج کل جنیوا میں ہیں۔''

''میں نے ان سے کہا تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ایسے کئی سفارت کار شب و روز میرے آگے پیچھے پھرا کرتے ہیں۔ مجھے اس ماحول میں ان کے ساتھ جینا ہے۔ یہ کبھی نہ ہو سکے گا۔''

میں بے اختیار بالی عمر کی لڑکیوں کی طرح رونے دھونے لگی۔

''بس اسی دن کے خوف سے میں تمہارے باہر جانے کے حق میں نہ تھی۔ میں بہت جلد یہ معاملہ ان کے سپرد کردوں گی۔ بھگتتے رہیں خود ہی اپنی لاڈلی کو۔'' امی جان اس وقت مجھے دنیا کی ظالم ترین خاتون لگ رہی تھیں۔

میں نے ان کے پیر تھام لیے۔ یہ سعی کئی روز سے جاری تھی۔ لیکن بات بنتی نظر نہ آرہی تھی۔ میں نے محسن کے بارے میں تفصیلاً تو نہیں پھر بھی بہت کچھ بتا دیا تھا ان کو، لیکن معاملہ صفر ہی تھا۔ امی جان کا ذہن تو اس حادثے کو قبول کرنے پر ہی تیار نہ تھا جو محبت بن کر میرے جسم و جان پر گزر گیا تھا۔

اسی وقت بابا جان کمرے میں داخل ہوئے۔ آنسو مسلسل میری پلکوں سے گر کر میرا دامن تر کرتے چلے جارہے تھے۔

''فضہ!'' ان کی بھاری آواز کی کرختگی نے ایک بار تو میرا دل دہلا ہی دیا۔

''یہ سب کیا ہے؟ مجھے اپنے خون سے اس حماقت کی توقع نہ تھی۔''

میں نے اشک پینے کی جدوجہد میں ہی ان کی طرف دیکھا وہ قہر و غضب کا پیکر بنے تھے۔

''فضہ! میں نے تمہیں گریجویشن کی اجازت دے دی اس لیے کہ میں خود تعلیم نسواں کا حامی ہوں اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ ہم سے دور ہو کر تم جینے کی راہیں بھی خود ہی منتخب کرتی رہو۔ مجھے دکھ ہے کہ تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ جو شخص اپنے آپ کو نہ پہچان سکے۔ اسے جینے کا حق ہی نہیں ہے۔ تم نواب خاندان کی بیٹی ہو۔ لاہور میں، میں کبھی تم سے ملنے نہ آسکا۔ تمہیں اپنی اصلیت بتانے کی اجازت نہ دے سکا۔ اس لیے کہ مجھ میں عام لوگوں کی نظروں کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس محل کی بیٹیاں محل کے اندر رہ کر ہی زندگی بسر کرتی آئی ہیں۔ تمہاری خاطر، تم جو میری واحد اولاد میری نورِ چشم تھیں۔ میں نے وہ روایت توڑ ڈالی، لیکن اس کے بعد کوئی روایت نہیں ٹوٹے گی۔ جو کچھ ہوا اسے بھلانے کی کوشش کرو۔ رزلٹ آتے ہی ہم تمہاری شادی کا سوچ رہے ہیں کیونکہ سرفراز خان بھی انگلینڈ سے واپس آچکا ہے۔''

میں ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ بابا جان اسی طرح غصے کے عالم میں باہر نکل گئے۔

یہ سرد جنگ کتنے دن جاری رہی۔ اس کشمکش میں مبتلا میں اپنے مبتلائے محبت کو اپنی خیریت کی خبر بھی نہ دے سکی۔ میں نے بھوک ہڑتال کردی۔ خود کو اپنے کمرے میں مقید کردیا۔ تین دن اسی عالم میں گزر گئے۔ میری ضد اور ثابت قدمی نے بابا جان کو میرے کمرے تک آنے پر مجبور کردیا۔

ان کے چہرے پر پریشانیوں کی کئی سلوٹیں تھیں۔ وہ جھکے جھکے سے تھے۔

''فضہ! تم نے اپنے بابا کو یہ دکھ بھی دینا تھا۔ تم ہماری کمزوری تھیں۔ اولاد ہونے کے ناتے اس سے تم نے خوب فائدہ اٹھایا۔ جو تم چاہو گی وہی ہوگا مگر ایک شرط کے ساتھ۔ میرے خاندان میں جائیداد

ہمیشہ عورت کے نام ہی رہی ہے۔ اگر تمہاری شادی سرفراز خان کے ساتھ ہوتی تو نہ صرف میری بلکہ سرفراز کے بابا کی جائیداد بھی تمہارے نام ہوتی لیکن محسن اسد سے شادی کے وقت میں تمہیں اپنی تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداد سے بے دخل کردوں گا۔ اور اس کے بعد یہ سب کچھ میرے بھتیجے کے نام ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں شان وشوکت سے رخصت کرنے کا حوصلہ بھی پیدا نہ کرسکوں۔ ہوسکتا ہے اس کے بعد۔۔۔"

وہ رک گئے۔ "نہیں فضہ! شاید میں زندگی کے ہر موڑ پر تمہیں دیکھنے کی آرزو کرتا رہوں۔ تم ان لوگوں کو مطلع کردو۔ میں بھی آرزوؤں کی لاش دفنانے کے انتظامات مکمل کرتا ہوں اور یہ سب کچھ بہت جلد ہوجانا چاہیے۔"

ان کے شفیق چہرے پر اس وقت پیار کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نہ تھی۔ لیکن مجھے خبر تھی کہ ان کا دل اب بھی میری محبت سے معمور تھا۔ انہوں نے مجھے زندگی بخش دی۔

میں نے لاہور کے لیے کال بک کرائی۔ محسن اسد کے نام۔ بات ہوتے ہی انہوں نے عظمیٰ جی کا بیٹا پیدا ہونے کی نوید سنائی۔ پھر میں نے اسے بابا کی رضامندی کا بتایا۔

"اوہ گڈ گاڈ۔ میری دعائیں رنگ لے ہی آئیں۔ میں کب آؤں فضہ؟ پلیز جلدی سے مجھے بتاؤ کوئی دن۔ کوئی گھڑی۔" نہ جانے کیوں میں بجھی بجھی سی تھی۔

"جب دل چاہے محسن اسد۔" اب اسے کیا بتاتی۔ اس کی خاطر کتنے سمندر، کتنے دریا حالات کی تلخیوں کے عبور کرنا پڑے تھے۔

وہ دل کا حال مجھے سناتا رہا۔ "فضہ! تم بن ایک پل چین سے نہ گزار سکا۔ کہیں بھی قرار نہ آیا۔ نہ فضاؤں میں نہ زمین پر۔ سخت دشمن ہو میری۔ جانا ہی تھا تو سکون کی دولت تو بخش جاتیں۔ سکون تو صرف تمہاری قربت میں ہی مل سکتا ہے محسن اسد کو۔"

وقت ختم ہوگیا تھا۔ لائن کٹ گئی۔ باتیں ادھوری رہ گئیں۔ رات مستقبل کے بارے میں سوچتے ہی گزر گئی۔ آئندہ زندگی کا پورا نقشہ میرے سامنے آگیا۔

محسن اسد کے سنگ زندگی گزارنے کے تصور میں بابا کی دولت اور ان کی جائیداد کا خیال بھی تو ساتھ ساتھ تھا۔ مجھے تو محسن اسد کی جاب سے بھی کوئی لگاؤ نہ تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ شادی کے بعد محسن اسد کو کسی تگ ودو کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بس وہ تو زندگی کا ایک ایک لمحہ میرے سنگ گزارے گا۔ اپنے ملک میں یا ملکوں ملکوں۔ میں نے سوچا، بابا کی جاہ وحشمت سے جدا ہوکر میں صرف ایک عام سی عورت، ایک ہوا باز کی بیوی بن کر رہ جاؤں گی۔ جسے ہر ماہ مشاہرے کے طور پر چند ہزار مل جایا کریں گے جو میرے بابا کے قانونی مشیر کی تنخواہ کے برابر بھی نہ تھے۔ میں بے مایہ لوگوں کے مسائل سے آگاہ نہ تھی پھر بھی حالات کی تلخی میں نے محسوس کرہی لی۔ محسن کے ڈیڈی کے پاس گلبرگ کی اس کوٹھی کے علاوہ تھا بھی کیا جو ان تینوں بھائیوں کی ملکیت تھی۔ وہ اچھی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ تو اس میں انکل عتیق

کی تنخواہ کے علاوہ تینوں بھائیوں کی کمائی بھی ماہ بہ ماہ خرچ ہو جاتی تھی۔ غرض ان کی فیملی کسی طور پر معاشی لحاظ سے بابا جان کے پاسنگ بھی نہ تھی۔

یہ وہ حقیقتیں تھیں جہاں آ کر میری محبت کے جذبے تھوڑے تھوڑے پسپا ہونے لگے تھے۔ کمزور پڑنے لگے تھے۔

میں نے آنکھ کھول کر دولت ہی دولت دیکھی تھی۔ شہرت ہی شہرت پائی تھی۔ حکمرانی ہی حکمرانی تھی۔ میں شغلا اسد ولا کا کچن تو سنبھال سکتی تھی۔ لیکن عملاً محسن اسد کے سنگ ایک گھریلو عورت بن کر رہنا میرے لیے دشوار ہی تھا۔ خوب صورت الفاظ جذباتی دور کی ضرورت ہوں تو ہوں زندگی کے الجھے ڈورے دولت کی طاقت سے ہی سلجھ سکتے ہیں۔

میں جانتی تھی، بابا جان جو بات بھی کرتے تھے وہ آخری اور حتمی ہوا کرتی تھی۔

صبح میں نے پھر کال بک کرائی۔ محسن کے آفس کا نمبر میرے پاس تھا۔

''معمہ کیوں بنی ہوئی ہو فضہ عبداللہ؟ خدا کے لیے اتنے کڑے امتحانوں میں تو نہ ڈالو۔ اپنا فون نمبر اپنا اتا پتا تو دو۔ تم سے بات کرنے کو بھی ترس گیا ہوں۔''

''محسن اسد! کل بات ادھوری رہ گئی تھی۔ بابا جان نے مشروط شادی منظور کی ہے۔''

''کیسی شرائط جانِ من؟ جان مانگ لیں تب بھی فضہ کی قیمت ادا نہ ہو سکے گی۔''

''مہر میں گلبرگ کی کوٹھی سالم ہی، دس لاکھ نقد شادی ہونے سے پہلے ہی ادائیگی اور پچاس تولے سونا۔''

''فضہ! یہ کیسا مذاق ہے۔ تمہارے بابا ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔''

''یہ سچ ہے۔''

''میرے ڈیڈی کی مالی پوزیشن تم سے چھپی تو نہیں فضہ! کیا تم ان شرائط میں نرمی پیدا نہیں کرا سکتیں؟''

''یہ ناممکن ہے محسن اسد اور خود سوچو میں ان سے یہ کیسے کہوں؟ یہ سب تو اس جائیداد کا پچاسواں حصہ بھی نہیں جس کی میں اس وقت مالک ہوں۔''

''فضہ! صاف بات کرو۔''

''خود ہی انصاف کرو محسن اسد! کیا نواب عبداللہ خان کی اکلوتی بیٹی کا مہر اتنا بھی نہیں ہونا چاہیے۔ آخر میرے بابا کو اس معاشرے میں عزت کے ساتھ ہی جینا ہے۔''

''نواب عبداللہ خان وزیر داخلہ۔'' اس نے یہ الفاظ بڑی دقتوں سے ادا کیے۔

''آف کورس۔''

''اوہ فضہ! یہ تم نے کیا کھیل کھیلا میرے ساتھ۔ تم نے پہلے دن ہی بتایا ہوتا۔ تم نے دھوکا کیا محسن اسد کے معصوم دل کے ساتھ۔ میں ایک عام سا بندہ کب ایک وزیر کی بیٹی، ایک اعلیٰ خاندان

کی چشم و چراغ کے قابل تھا۔ کاش! تم نے پہلے دن ہی میرا راستہ روک دیا ہوتا۔ اپنے اور میرے درمیان حد مقرر کر دی ہوتی۔ آئی ایم سوری فضہ! میں قطعاً تمہیں پانے کا حق دار نہیں ہوں۔ میری خواہش کو ایک دیوانے کی آرزو سمجھ کر درگزر کر دینا پلیز فضہ میری جدائی خوشی کے ساتھ قبول کر لینا۔ لیکن یہ ضرر یاد رکھنا کہ تمہاری جدائی میرے دل کا ناسور بن جائے گی۔ اللہ حافظ ہمیشہ کے لیے۔''

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں کتنی دیر خاموش بیٹھی رہی۔ ان لمحوں میں، میں بہت سا سفر طے کر آئی تھی۔ گو محسن اسد کے پاس میری یادوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن دولت کی اہمیت نے محبتوں کے سارے احساس تک مجھ سے چھین لیے تھے۔

محسن اسد کا دل سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میں نے اسے لوٹا ضرور دیا تھا لیکن عمر بھر کسی پاؤ بھر گوشت کے لوتھڑے کی تمنا نہ کر سکی۔ اسی وقت اپنے فیصلے کی تبدیلی کی خبر سب کو سنا دی اور تھوڑے عرصے بعد سرفراز خان کو شریکِ حیات بنا کر زندگانی کا نیا سفر بھی شروع کر دیا۔

❁❁❁❁

آدمی ماضی سے وابستہ رہنا چاہے تو وہ قدم قدم پر اضطراب کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ میں نے دو سال کے اس عرصے کی ہر یاد ذہن سے محو کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ شادی ہوئے تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ ابھی تک میری گود میں کوئی پھول نہ کھلا تھا۔ میں تو آسائشوں کی دنیا میں گم تھی۔ نادر جواہرات، قیمتی ملبوسات میری زندگی تھے۔ مجھے جنون کی حد تک نایاب چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ میری تجوری میں دن رات قیمتی زیورات کا اضافہ ہوتا رہا۔ سرفراز خان کی سنگت میں میں اونچے اونچے جاندار قہقہے لگاتے ہوئے ایک پل کو بھی ماضی کی کوئی صدا نہ سن سکی۔ ایک بار بابا جان اسلام آباد سے صادق گنج آئے تو مجھے خاصے وقت کے لیے ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

''تم خوش تو ہو بیٹی؟'' ان کے لہجے کی نرمی محبتوں کی پھوار میں بھیگی تھی۔

''بہت خوش ہوں بابا جان!''

''بیٹی! بعض اوقات مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے اپنا فیصلہ سناتے وقت سخت دلی کا مظاہرہ کیا۔''

''نہیں بابا جان! آج میں سوچتی ہوں وہ ضد نادانی کے سوا کچھ بھی نہ تھی۔ مجھے تو کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ ہر چیز اپنی اصلیت کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔''

آج کل میں اپنی دنیا میں مگن تھی۔ حکمرانی کا احساس حاوی تھا مجھ پر، کبھی یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ سرفراز خان میرا ہونے سے قبل ہی کئی حصوں میں منقسم تھا اور روز بروز مزید تقسیم ہوتا جا رہا تھا۔

شانزہ ابھی دو سال کی ہی تھی کہ بابا جان اچانک ہارٹ فیل ہو جانے پر انتقال کر گئے۔ سرفراز

خان خاندان کا واحد مرد تھا۔ ان کی وفات پر اس نے تمام ایکٹیویٹیز سنبھال لیں تو حکومت کی مشینری میں حصہ لینا بھی ضروری سمجھا اور اس بہانے وہ گھر سے دور ہوتا چلا گیا۔

سرفراز خان کے ڈھنگ ہمیشہ سے ہی ایسے تھے۔ اس نے پہلے تو مجھ سے چھپ چھپا کر یہ کھیل جاری رکھے ہوئے تھے۔ بابا جان کی وفات نے اس کے حوصلے بڑھا دیے۔ اس نے ایک زرِ کثیر خرچ کر کے گلزار تعمیر کرایا۔ گلزار بھی کسی محل سے کم نہ تھا۔ جہاں دل بہلانے کو کئی پری رو چہرے موجود تھے اور میں ان کی موجودگی سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ احتجاج تو کبھی کیا ہی نہیں، میں نے آواز بلند کی نہیں۔ جن چیزوں کی مجھے ضرورت تھی وہ سب مجھے حاصل تھیں۔ میرے لیے یہی کافی سے زیادہ تھا کہ وہ سب میری ذات کے محتاج تھے۔ میرا بندھن سرفراز خان سے تھا ہی کب؟ میں تو صرف اس دولت عزت اور شہرت کی تھی، جن کے عوض میں نے محبت کو قطعی غیر اہم سمجھ کر بیچ ڈالا تھا۔

مجھے علم تھا یہ سب محرومیاں بڑی عورتوں کا مقدر ہوتی ہیں۔ میرے اردگرد بہت سی عورتیں ایسی تھیں جن میں سے ایک میری ماں بھی تھی، ایک سرفراز خان کی بہن بھی تھی۔ ہم تینوں عورتوں کو شاید کسی دل کی نہیں صرف حکمرانی کی ضرورت تھی۔ اپنی راجدھانی کی ملکہ کہلانے کی ضرورت تھی۔

بڑی مدت گزر گئی۔ ایک وقت تھا جب میں اپنی ماں کے دکھ سے ناآشنا تھی۔ آج خود شانزہ سے چھپنے کی خواہاں تھی لیکن یہ مختلف دور تھا۔ شعور اور آشنائی کا دور تھا۔ شانزہ بہت کچھ سمجھنے لگی تھی۔ وقت سے پہلے ہی جاننے لگی تھی۔ کئی بار اس نے مجھے جھنجھوڑا تھا، لیکن ریشم و کمخواب کے سائے میں سوئی میری روح بے دار نہ ہو سکی تھی۔ مگر اس عورت زہرہ نے جو واقعی اب میرے ذہن کے افق پر زہرہ ستارے کی مانند ہی چمک رہی تھی۔ مجھے اذیت و کرب سے دوچار کر دیا اور پھر محسن کی آمد نے تو میری روح کو بے لباس کر کے میرے سامنے کر دیا۔

محسن کب مجھے بھولا تھا؟ ہر دم یاد تھا۔ لاشعور میں آباد تھا۔ بس آرزوؤں اور امنگوں کے مختلف رنگوں نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ میں خاص عورت بن کر جینا چاہتی تھی۔ محسن اسد کی دنیا مجھے کیا دیتی۔ یہی ہو جاتا کہ اسے جرأت و بہادری کے مظاہرے پر کسی موڑ پر کسی تمغۂ جرأت، کسی ستارۂ جرأت یا زیادہ سے زیادہ نشانِ حیدر سے نواز دیا جاتا اور بس۔ یہ دولت اور شہرت کہاں سے ملتی مجھے۔ میں انسانوں کی اس بھیڑ میں کہیں کھو جاتی کہ اپنا نشان تک مجھے نہ ملتا۔ بس ان ہی آرزوؤں نے اپنی بالا دستی قائم کر کے محبت کا وہ لطیف احساس مجھ سے چھین لیا جس نے پورے دو سال میری روح پر اپنا قبضہ رکھا تھا۔

زہرہ نے وہ پردہ کھینچ لیا تھا، جو میری محبت اور شخصیت کے درمیان حائل تھا۔ جس جذبۂ رقابت کے نہ ہونے پر زہرہ کو حیرت تھی۔ ماورا محسن کو دیکھ کر ایک ان دیکھی عورت کے وجود کے احساس نے پور پور جلا دیا۔ شاید میرے تصور نے ہمیشہ محسن کو اسی موڑ پر ہی دیکھا، جہاں وہ مجھ سے بچھڑا تھا۔ شاید میں آج

تک یہی سوچتی رہی تھی کہ وہ میرے سوا کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ آج ماورا محسن کو دیکھ کر یقین کرنا پڑا۔ وہ کسی اور کا تھا۔ کسی اور سے وابستہ تھا۔

❁❁❁❁

شام کو تھکا ہارا ٹولہ واپس آیا تو میں اپنے کمرے میں کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ سب خوش تھے۔ شاہنواز اور ماورا سب سے آگے آگے تھے۔ شاہنواز نے قدرے جھکتے ہوئے جانے کیا کہا۔ ماورا کا مترنم قہقہہ محل کی خوشبو بھری فضاؤں میں گونج گیا۔

شاہنواز کی وارفتگی میں نے شروع کے لمحوں میں محسوس کر لی تھی۔ اس کا یہ انداز مجھے بے حد معیوب لگا۔ ماورا کسی بھنورے کے قابل ہرگز نہ تھی۔ میں شاہنواز کے بڑھتے قدم روک دوں گی۔ میں باہر نکل آئی۔ داخلی برآمدے میں وہ سب میرے قریب آ گئے۔

''آداب آنٹی۔ آپ کا مشورہ بہترین تھا۔ ہم نے خوب انجوائے کیا۔ واللہ اس جگہ کے حسن کا بھی جواب نہیں۔'' ذہین نے اظہارِ خیال کیا۔ جبین نے اس کی تائید کی۔

''ہمارا تو خیال تھا کہ رات بھی وہیں بسر ہو جائے۔ چاندنی کا لطف تو کھلی فضاؤں میں ہی آتا ہے۔ لیکن یہ شاہنواز بھائی خدائی فوجدار بنے رہے۔''

''چاندنی تو یہاں بھی ہو گی جبین بی بی! صادق گنج کی فضاؤں میں بھی محل کی چھت پر بھی، سامنے لان میں بھی اور اگر دیکھنے والی نظر ہو تو اس معصوم چہرے پر بھی۔'' آخری فقرہ میں نے سن لیا۔ جو اس نے صرف ماورا کو سنانے کی کوشش کی تھی۔ میں ڈر گئی، کانپ گئی۔ کیسے بچاؤں ماورا کو اس جال سے۔ نہ ماورا کو بتانے کا حوصلہ تھا اور نہ شاہنواز کو ٹوکنے کا۔ شاہنواز جو کہ شانزہ کا ہونے والا شوہر تھا۔ اس گھر کا مالک تھا۔ سرفراز خان کا اکلوتا بھانجا تھا۔

رات میں نے ماورا کو اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ میں اسے متنبہ کرنا چاہتی تھی۔ ہوشیار کرنا چاہتی تھی، وہ آئی اور اپنے ساتھ معصوم باتوں کا خزانہ بھی لیتی آئی۔

''آنٹی! کل آپ بھی ہمارے ساتھ تشریف لے چلیے گا۔ پاپا تو مما کا گھر میں رہنا پسند ہی نہیں کرتے۔ اکثر ان کا جھگڑا اسی بات پر ہو جاتا ہے۔ مما کو گھریلو دھندوں سے پیار ہے اور پاپا کو سیر و تفریح سے۔ کھینچ کھینچ کر انہیں ساتھ لے جاتے ہیں وہ۔''

میری روح گھٹن محسوس کرنے لگی۔ وہ دن مجھے بہ خوبی یاد تھے، جب ہوسٹل سے کسی نہ کسی بہانے محسن اسد مجھے اڑا لے جاتا تھا اپنے سنگ۔

''کیا قباحت ہے یار سیر و تفریح کرنے میں۔ چار دن کی زندگی میں اگر اتنی رنگینی بھی نہ ہو تو لعنت ہے۔'' اپنی بے وفائی کے باوجود میں تو پھر بھی مستحکم ہی رہی محسن اسد! کم از کم اتنا تو کیا میں نے کہ دل میں کسی کو ذرّہ برابر جگہ ہی نہ دی اور تم۔۔۔ تم نے تو جلد ہی سب کچھ بھلا کر نئی دنیا پوری رنگینیوں سمیت آباد کر لی۔ جس عورت کو تم بڑھاپے کی دہلیز تک آنے کے بعد بھی یوں چاہتے ہو، اسے اپنا آپ مکمل طور

پر سونپا ہی ہوگا تم نے۔'' اندر کوئی الاؤ سا دہک گیا۔

''آنٹی! انکل تو اسلام آباد میں رہتے ہیں آپ یہاں کیوں ہیں؟'' ماورا نے ایک اور تیر چلایا۔

اب اسے کیا بتاتی اسلام آباد کے منسٹر ہاؤس میں تو سرفراز خان کی اطالوی نژاد بیوی اس کے ساتھ قیام پذیر تھی۔ میرا وہاں کیا کام؟

''مجھے اپنے اس گھر سے ہی پیار ہے ماورا بیٹی۔''

شاید میں در پردہ یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے تو دولت و جاہ و حشمت سے پیار ہے جو مجھے یہیں میسر ہے۔

''حیرت ہے، پاپا تو ممّا کے بغیر شاید ایک دن بھی کہیں نہ گزار سکیں۔''

وہ ہر بات میں پاپا کا ذکر ضروری سمجھتی تھی۔

''اچھا!'' میں شکستگی کے احساس سمیت مسکرا دی۔ پھر میں نے تکلیف دہ موضوع بدلنا چاہا۔

''کل تم لوگ کس طرف جاؤ گے؟''

''جھیل پر جانے کا کہہ رہے تھے شاہنواز صاحب۔'' شاہنواز کے نام پر ماورا کی آنکھوں میں جو بے نام سی چمک آئی وہ مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''اچھا ہے۔ کافی خوب صورت جگہ ہے۔ اچھا وقت گزرے گا۔''

''آنٹی! کیا جھیل واقعی خطرناک ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''آنٹی! وہ شاہنواز کہہ رہے تھے ہر سال ایک نہ ایک آدمی اس میں ڈوب کر مر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی لاش بھی نہیں مل سکتی۔''

وہ خوف زدہ سی تھی اور اس عالم میں بھی اپنی معصومیت سمیت پیاری لگ رہی تھی۔

''نہیں غلط ہے یہ سب۔ ایسا تو آج تک نہیں ہوا۔ بس وہ مذاق کر رہا ہوگا تم لوگوں سے۔''

ابھی میں نے بات ختم ہی کی تھی کہ وہ آ گیا۔ اجازت طلب کر کے اندر آیا۔ اس کے مسکراتے چہرے کے رنگ جاندار قسم کے تھے۔

''مامی جانی! اس دن آپ نے موسمِ گل دینے کا وعدہ کیا تھا۔'' موسمِ گل ایک شعری مجموعہ تھا بہت ہی مشہور شاعر کا جو میرے کہنے پر شانزہ میرے لیے لائی تھی۔

''اوہ ہاں تم بیٹھو میں لاتی ہوں۔'' میں اسے جلدی ٹالنے کی خاطر اسٹڈی روم کی طرف گئی۔ میں جانتی تھی وہ یہاں صرف ماورا کے دیدار کی غرض سے آیا تھا۔ جانے کیوں مجھے یہ گوارا نہ تھا۔ کتاب لے کر میں واپس آنے لگی تو دروازے پر رک گئی۔

''وہ جھیل تو خطرناک نہیں۔ مامی جانی نے سچ کہا، لیکن اس علاقے میں دو اور جھیلیں ضرور خطرناک ہیں۔ اوّل تو ان میں کوئی ڈوبا نہیں لیکن جس دن ڈوب گیا، ابھرے گا ہرگز نہیں۔''

''وہ کہاں ہیں؟'' ماورا گھبرائی ہوئی تھی۔
''وہ آپ کے سامنے ہی ہیں۔''
''میرے سامنے؟''
''ہاں ہاں۔''
''مگر کہاں؟ کیا اس کمرے میں ان کی کوئی تصویر آویزاں ہے؟'' اس نے یقیناً اِدھر اُدھر دیکھا ہوگا۔
''تصویریں کیا وہ تو مجسم یہاں موجود ہیں۔''
''اللہ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔'' میں کمرے میں آ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
''یہ لو، لیکن ذرا جلدی لوٹانا۔ کیونکہ میں نے ابھی اسے پڑھا نہیں۔''
''او۔کے۔''
وہ اٹھ کھڑا ہوا کہ شانزہ نے کمرے میں قدم رکھا۔
''او ہو بھئی کیا بات ہے۔ آپ کے ہاتھ میں موسمِ گل۔۔۔ شاعری کا ارادہ ہے کیا؟''
''شاعری کا نہیں، شعر چرانے کا۔''
''وہ کیوں؟''
''خود ہی سوچ لو۔''
''میں سمجھی نہیں۔''
''بھئی سنا تھا کہ موسمِ گل کی بڑی مانگ ہے۔ سوچا ہم بھی پڑھ کر دیکھیں آخر اس میں ہے کیا اور بس۔''
''خوب سمجھتی ہوں آپ کو۔'' شانزہ ہنسی اور آگے بڑھ آئی۔
''ماورا! میں نے محسن کو فون کر دیا ہے۔'' میں نے چونک کر شانزہ کی طرف دیکھا۔ خبر نہیں وہ کس محسن کی بات کر رہی تھی اگر وہ محسن اسد کی بات ہوتی تو شانزہ اتنی ان سولائیزڈ تو نہ تھی کہ اس کا نام یوں لیتی۔
''اچھا۔ مجھے بتایا ہوتا میں بات تو کر لیتی۔''
''بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے انہیں مدعو کیا ہے۔ کل شام تک وہ یہاں آ رہے ہیں۔''
''کون بھیا؟'' ماورا کا لہجہ کھنکھنا رہا تھا۔
''تمہیں تو ہر دم بھیا کا خیال رہتا ہے۔ بھئی ساتھ میں ہمارے انکل اور آنٹی بھی تشریف لا رہے ہیں۔ کیوں ممّا ٹھیک ہے نا۔ اس طرح آپ لوگوں کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔'' میں جانے کہاں کھو گئی

تھی۔

''اوہ ہاں ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔'' دنیا گول تھی۔آخر کسی دن تو میرا اور اس کا سامنا ہونا ہی تھا لیکن۔۔۔

یہ ماورا جب بھی اپنے بھیّا کا ذکر کرتی ہے شانزہ چھوئی موئی کیوں بن جاتی ہے۔محسن اسد! کیا تمہارا کوئی بیٹا بھی ہے۔جس سے میری بیٹی نے اپنے احساسات وابستہ کر لیے ہیں۔'' یہ سوال میں خیالوں میں محسن سے تو کر رہی تھی لیکن دونوں بچیوں سے نہ پوچھ سکی۔

دوسرے دن حسب پروگرام وہ جھیل پر جانے لگیں تو سب لڑکیوں نے مجھے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا۔لیکن میں جانے پر آمادہ نہ ہوئی۔ناشتے کے بعد میں لان میں آ گئی۔شہتوت کے چھتنا درخت تلے کرسیاں بچھی تھیں اور میں صبح کا اخبار دیکھ رہی تھی۔آج سرفراز خان نے اسلام آباد جانا تھا۔نوکر تیاریوں میں مصروف تھے۔تبھی وہ گلزار سے نکل کر میری طرف آیا اور قریب پڑی کرسی پر ٹک گیا۔

''کہاں ہیں سب لڑکیاں؟'' اس کا پہلا سوال تھا۔

''تفریح کے لیے جھیل پر گئی ہیں۔''

''گڈ۔کل میں آپا جان کے پاس گیا تھا۔''

''کیسی ہیں وہ؟'' میں نے اخبار کا صفحہ پلٹا۔

''اچھی ہیں۔آج وہ آئیں گی تمہارے پاس۔''

''خیریت؟''

''بس ویسے ہی۔کہہ رہی تھیں اب انہیں گھر کی تنہائیاں کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے؟'' میں مسکرائی۔

''علاج تو ہے۔شانزہ کا ایم۔اے چھ ماہ بعد ہو جائے گا۔وہ چاہتی ہیں ان ہی دنوں میں شادی مقرر کر دی جائے۔تم جانتی ہو شانزہ نواز بھی ہماری بیٹی کی طرح ان کا اکلوتا لاڈلا بیٹا ہے۔شادی کی تیاریاں مکمل ہوتے بھی چھ ماہ لگ جائیں گے۔''

وہ شاید معاملہ خود ہی بہن سے طے کر آیا تھا۔صرف اطلاع دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔وہ آئیں گی تو بات ہو جائے گی۔''

''فضہ! اگر تم جہیز خریداری کے لیے جانا چاہو کہیں تو میں ویزا لگوا دوں تمہارا۔''

''ہو جائے گی خریداری بھی پہلے میں ان سے بات تو کروں۔'' میں خوف زدہ سی تھی۔دونوں سے ہی، شاہنواز سے بھی اور شانزہ سے بھی۔

''اچھا۔رات شانزہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے کچھ مہمان لاہور سے آئیں گے۔اگر وہ میرے جانے کے بعد آئیں تو ان کا خاص خیال رکھنا تمہارا فرض ہوگا۔تم جانتی ہو نا شانزہ اور اس کی خوشیاں مجھے

دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔''

اخبار کو سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔

گیارہ بجے موسم میں حدت سی آچکی تھی۔ جب شاہ نواز کی جیپ لان کے احاطے میں داخل ہوئی۔ عفت آرا اپنی دو چار ملازماؤں کے ساتھ آچکی تھیں۔ میں انہیں عزت واحترام سے ڈرائنگ روم میں لائی اور ہم احوال پوچھنے اور بتانے میں مصروف ہوگئے۔ عفت آرا زیادہ پڑھی لکھی خاتون نہ تھیں۔ لیکن روشن خیال ضرور تھیں اور مجھے بھابھی کے ناتے کم اور چچازاد ہونے کی حیثیت سے چھوٹی بہن کی طرح زیادہ چاہتی تھیں۔

''آپا! میں بھی آپ کی طرف آنا چاہ رہی تھی۔'' کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

''تو آئیں کیوں نہیں؟''

''بس ایک جھجک آڑے آتی رہی۔''

''بہن سے بھی جھجک۔ فضہ! تمہیں کیا خبر تم مجھے کتنی عزیز ہو۔ دنیا میں میرا سرفراز اور تمہارے سوا ہے بھی کون۔'' وہ آبدیدہ ہوگئیں۔

''آپا! جو دکھ میں نے اٹھائیں ہیں۔ جو دکھ آپ نے اٹھائے ہیں۔ کیا میری بیٹی بھی یہی دکھ اٹھائے گی؟ بس یہی پوچھنا تھا آپ سے۔'' عفت آرا نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''کیسے دکھ؟'' وہ انجان بن رہی تھیں۔

''حق تلفی کے دکھ۔ نارسائیوں کے دکھ۔ کیا آپ بے خبر ہیں کہ میرے ہوتے ہوئے بھی سینکڑوں عورتیں سرفراز کی زندگی میں آئیں اور آتی رہیں گی۔ شاہ نواز بھی اسی خاندان کا ایک مرد ہے آپا۔ شانزہ مجھ سے بے حد مختلف لڑکی ہے۔ پھر یہ زمانہ اور ہے۔ ان دونوں میں اگر نباہ نہ ہوسکا تو؟''

''فضہ! تم نے میرے بیٹے کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میں ماں ہوں۔ اسے جانتی ہوں۔ اس کی اچھائی یا برائی تم سے چھپا کر تم پر کوئی ظلم نہیں کروں گی۔ ان مشغلوں کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جو اس کے والد یا ماموں کے ہیں۔ ان ہاتھوں نے اس کی پرورش کرتے وقت یہ خیال رکھا تھا کہ اسے اس سارے ماحول سے جداگانہ تربیت دینا ہے۔ میرا بیٹا لندن میں چار سال گزارنے کے باوجود بھی کسی بد علت کا شکار نہیں ہوسکا۔''

''آپ ماں ہیں نا آپا! آپ تو نرم نگاہی سے جائزہ لیتی ہیں۔ کبھی تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کے بعد مجھے بتایئے۔''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں فضہ! اب تمہیں کیا بتاؤں کہ اسے تو اپنے پاپا اور ماموں سے نفرت ہے۔ اور تو اور اسے ان جاگیروں اور ساری جائیداد سے بھی نفرت ہے۔ وہ تو نوکری کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے روک دیا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ فضہ میرے بیٹے کو زندگی میں ایک چیز سے ہی پیار ہے۔ خواہ تم

اسے اچھائی سمجھو یا برائی اور وہ ہے شکار۔"

"خیر میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ میں شانزہ سے بات کروں گی۔ آپ شاہنواز سے پوچھیے تب ہی یہ سلسلہ آگے بڑھایا جا سکے گا۔" میں نے مصالحت کا انداز اپنایا۔

"ہاں سو فیصد حق بات کہی تم نے۔ میں آج ہی شاہ نواز سے بات کروں گی۔ ویسے فضہ! تم میرے بیٹے کے بارے میں اپنا ذہن صاف رکھو۔ جو کچھ تم سمجھ رہی ہو شاہ نواز وہ نہیں ہے۔"

میں معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے پی گئی۔ میرے اصرار کے باوجود وہ کھانے سے قبل ہی چلی گئیں۔ ان کے جانے پر ہی سرفراز خان بھی اسلام آباد کے لیے ملتان کی طرف روانہ ہو گیا۔ گرمی میں بے حد شدّت آ گئی تھی۔ برآمدے میں کھڑی اندر جانے کا سوچ رہی تھی کہ سفید رنگ کی مارک ٹو گیٹ پر رکتی نظر آئی۔ چوکیدار نے ادھ کھلا گیٹ مکمل کھول دیا۔ اور دوسرے لمحے گاڑی پورٹیکو میں آ رکی۔ میں نے یہ گاڑی آج سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ حیران ہو کر رک گئی۔

اگلا دروازہ کھول کر کوئی نوجوان باہر نکلا اور پچھلے دروازے سے میرو۔ مجھے یاد آیا میرو شہر گیا تھا۔ سودا سلف لانے کی غرض سے۔ یہ کسے ساتھ لے آیا۔ میرو تیزی سے میری طرف آیا۔ ساتھ ہی وہ نوجوان بھی۔ میرو نے شاید میرے بارے میں اسے بتا دیا تھا۔

"آداب۔۔" یہ نوجوان بڑا جانا پہچانا سا لگ رہا تھا مجھے۔ میں بغور اسے دیکھتی رہی۔ اس نے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھایا۔

"معزز خاتون! کیا میں صحیح جگہ پر نہیں پہنچا ہوں۔" میں نے کاغذ لے لیا۔ میرے گھر کا ایڈریس اس پر درج تھا۔

"ہاں بیٹے! یہ ایڈریس اس گھر کا ہی ہے۔"

"مجھے محسن حسن کہتے ہیں۔" وہ خود اعتمادی سمیت مسکرایا۔

محسن حسن کون تھا یہ؟

"میری سسٹر ماورا محسن کہاں ہو گی؟"

اوہ تو یہ ماورا کا بھائی تھا۔ لیکن اس کے نام نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ باپ بھی محسن اور بیٹا بھی محسن۔ یہ ناممکن تھا۔

"میرو ان کا سامان اندر لے جاؤ۔ یہاں بہت گرمی ہے بیٹا۔ پہلے اندر تو آؤ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

میرو نے ڈرائنگ روم کھول دیا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں اس کے لیے شربت گلاس میں انڈیلا اور اس کی طرف بڑھایا۔ گرمی کی تمازت سے سرخ ہوتے چہرے پر تھکن بھی بہ خوبی نظر آ رہی تھی۔

''شانزہ بتا رہی تھی کہ تمہارے ساتھ تمہارے مما اور پاپا بھی آئیں گے۔''

''جی۔کل شانزہ سے بات کرتے ہوئے مجھے یاد نہ رہا۔وہ نہیں آسکے۔کیونکہ آج میرے چاچو کی برسی تھی۔''

''اوہ!'' اظہار افسوس کے طور پر میں اتنا کہہ سکی۔

''معزز خاتون! یہ ہیلتھ منسٹر سرفراز خان کی رہائش گاہ ہے نا۔'' وہ استفسار کر رہا تھا۔انداز میں احساسِ بے گانگی تھا۔

''ہاں۔لیکن محسن حسن! تم تو اس گھر میں بیٹے کی حیثیت سے آئے ہو اس طرح کیوں پوچھا تم نے۔''

''جی نہیں۔آئی ایم ساری معزز خاتون! میرے سوچنے کا انداز ایسا کبھی نہیں رہا۔شاید اس گھر میں یہ میرا پہلا اور آخری قدم ہو۔''

میں گڑبڑا اٹھی۔یہ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ کیوں کہہ رہا تھا؟

''ماورا اور شانزہ اچھی دوست ہیں اور میرا خیال ہے تمہاری فیملی کو شانزہ سے کسی قسم کا کوئی گلہ نہیں۔''

''بس اسی لیے تو ایسا چاہتا ہوں تاکہ آئندہ بھی کسی قسم کا گلہ شکوہ پیدا نہ ہو سکے۔''

''بیٹے! تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔'' میں نے اسے بغور دیکھا۔لائٹ کریم کلر کے شلوار سوٹ میں چہرے پر تھکن اور غصہ لیے وہ بے حد بھلا لگ رہا تھا۔اس کی مقناطیسی آنکھوں کی کشش اسی جیسی تھی۔جس سے میں برسوں سے دور تھی۔جدا تھی۔وہ ایک دم ہنسا۔

''آپ نے سچ کہا۔سخت بے وقوف ہوں میں بھی۔بھلا آپ کو میرے یا میری فیملی کے ایسے کی کیا خبر۔میں تو ایسے گفتگو شروع کر بیٹھا تھا جیسے سارا قصور آپ کا ہی ہو۔''

''بیٹے! پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاپا۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔

''میرے پاپا کوئی اتنے مشہور آدمی بھی نہیں ہیں کہ آپ جیسی اہم اور معزز خاتون انہیں ضرور جانتی ہوں۔''

''تم بتاؤ تو سہی کیا خبر کہ ایسا ہو۔''

''لیفٹیننٹ جنرل حسن اسد میرے پاپا ہیں۔''

''تو وہ ماورا محسن تمہارے چچا کی بیٹی ہے نا۔لیکن یہ تمہارا نام محسن حسن کیوں ہے؟ یہ سب کیا ہے بیٹے؟ میں تو سچ مچ کئی دنوں سے الجھی ہوئی ہوں۔'' میں اس پر واضح ہو کر اس کی وضاحت چاہتی تھی۔

''ماورا میری سگی بہن ہے۔''

''لیکن اس کا نام ماورا حسن تو نہیں ہے۔''

وہ ایک دم رونے لگا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''معزز خاتون! آج میں نے یہاں آ کر غلطی کی۔ میں بے حد اپ سیٹ ہوں۔ ابھی میں نے ذکر کیا تھا اپنے چاچو جانی کی برسی کا۔ آج کے دن ان کا جہاز کریش ہو گیا تھا۔ وہ شہید ہو گئے تھے۔ میرے چاچو فلائٹ لیفٹیننٹ محسن اسد۔'' پل کے ہزارویں میں زمین و آسمان گھوم سے گئے۔

''نہیں نہیں۔'' میں زمین و آسمان کے درمیان شاید خود ہی گھوم رہی تھی۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اندر باہر شور سا برپا ہو گیا۔ جانے کہاں سے آنسوؤں کے خزانے باہر نکل آئے۔ وہ حیران و ششدر مجھے دیکھتا رہا۔ بلکتا ہوا، روتا ہوا پھر اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ یہ خبر آپ کے لیے باعثِ تکلیف تھی معزز خاتون! کیا آپ انہیں جانتی تھیں؟''

''ہاں۔ اپنی ایک دوست کی وساطت سے جو اس کے بھائی رضا اسد کی بیوی ہے۔''

''اچھا تو آپ لبنیٰ آنٹی کی دوست ہیں۔ لیکن ہم نے آپ کو کبھی دیکھا کیوں نہیں؟''

''بیٹے!'' میری آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

''ہماری دوستی ٹوٹ گئی تھی۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''محسن حسن'' عظمیٰ جی کا وہی بیٹا تھا یقیناً۔ جس کا نام رکھتے رکھتے اکثر میں اور لبنیٰ ایک دوسرے سے لڑ پڑتے تھے۔

''محسن! میرے دوست میرے عزیز مجھے یہ تو بتاؤ کہ تمہارے چاچو کب اس دنیا کو چھوڑ گئے؟'' میرے دل میں آگ سی جل رہی تھی۔

''پاپا کہتے ہیں بے شک شہادت کا رتبہ بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ محسن چاچو وطن کی خاطر جان قربان کر گئے۔ لیکن ہمیں تو ایک اور چیز رلاتی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''اب آپ کو کیا بتاؤں۔ وہ اپنے دل پر ایک گہرے صدمے کا اثر لے کر گئے اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔''

''کیسا صدمہ؟''

''ایک عورت کی بے وفائی اور دھوکے بازی کا، جسے وہ دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔'' اس نے رومال سے چہرہ صاف کیا۔

''معزز خاتون!'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ٹوک دیا۔

''محسن! تم بار بار یہ لفظ کہہ کر غیریت کا احساس دے رہے ہو۔ لبنیٰ کے ناتے میں تمہاری آنٹی ہی ہوں۔''

''اوہ۔ دراصل میں زبردست ٹینشن کا شکار ہوں۔ اور ویسے حد سے زیادہ صاف گو بھی ہوں۔ کیا سب کچھ آپ کو سچ سچ بتا دوں آنٹی؟''

''ضرور بتاؤ۔''

''میں اس وقت سے پریشان ہوں جب سے میں نے صادق گنج کے علاقے میں داخل ہونے کے بعد نواب زادہ سرفراز خان کا نام سنا ہے۔ ان کی حیثیت واہمیت کا اندازہ لگایا ہے کم از کم شانزہ جیسی لڑکی سے مجھے یہ امید نہ تھی۔''

''کیا کیا اس نے؟''

''آنٹی! اس نے اپنے ڈیڈی کی شخصیت کو مجھ سے چھپائے رکھا۔'' میں سوچنے لگی جانے میری بیٹی کو کیا مشکل درپیش تھی کہ اُس نے اپنا آپ ان لوگوں پر ظاہر نہ کیا۔ جبکہ سرفراز خان کی طرف سے ایسی کوئی ہدایت نہ تھی۔

''اور میں نہیں چاہتا کہ تاریخ ایک بار پھر اپنا آپ دہرائے۔ میں ایک مکمل انسان کی طرح جینا چاہتا ہوں۔'' وہ پھر الجھنے لگا تھا۔

''لیکن ٹھہریے۔ میری بات آپ کی سمجھ میں یوں نہیں آئے گی۔ میں نے آج تک جو بات کسی کو نہیں بتائی وہ میں شانزہ کی مما کو ضرور بتاؤں گا۔ پھر اس نے مجھے وہ تمام واقعات بڑی سہولت کے ساتھ سنا ڈالے، جو مجھ پر ہی بیت چکے تھے۔

''اس لڑکی نے محسن چاچا سے کھیل ہی رچایا تھا۔ نواب زادی تھی نا۔ لاہور کی رہائش کے دوران ایک دلچسپ مشغلہ اس کے ہاتھ آ گیا۔ دیکھیے نا آنٹی اگر وہ مخلوص ہوتی تو کم از کم اپنی حقیقت سے آگاہ تو کرتی۔ اپنا اتا پتا تو بتاتی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ عمر بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کر کے وہ واپس اپنے گھر چلی گئی۔ چاچا کے لیے اس کے بغیر ایک پل کاٹنا محال تھا۔ جانے کے دوسرے دن اس کا فون آیا تو چاچا کے قدم زمین پر ٹکے ہی نا۔ وہ میری پیدائش کا دن تھا۔ پندرہ ستمبر۔ دوسرے دن وہ حسب معمول ڈیوٹی پر گئے۔ پاپا اپنے یونٹ میں تھے۔ وہیں انہیں میرے چاچو کا فون ملا۔ انہوں نے کہا،

''حسن بھائی! خوش نصیب ہیں آپ لوگ، جنہوں نے منزل پائی۔ میں نے تو بڑا غلط انتخاب کیا۔ چاند کو پانے کی تمنا کی۔ فضہ کو مجھ سے ایسا کھیل کھیلنے کا حق نہ تھا۔ وہ بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہے۔ اسے پانے کا خواب دیوانے کی آرزو ہے۔ کچھ بھی ہو حسن بھائی! لیکن آپ کا بھیّا آپ کا محسن جیتے جی مر گیا ہے۔ جفا اور دھوکے کے زخم سجا کر شاید نہ جی سکے۔''

پھر کبھی وہ آ سکے نہ ان کی آواز سنائی دے سکی۔

وہ شہید ہو گئے۔ بہت بڑا مقام پالیا انہوں نے۔ لیکن پاپا اور رضا چاچا کے دل میں گھاؤ ڈال گئے۔ آج اس واقعے کو پچیس سال بیت گئے ہیں۔ لیکن ہر دم مجھے لگتا ہے میرے چاچو ابھی ابھی مرے ہیں کیونکہ ہماری چھوٹی سی فیملی میں ان کا نام ہمیشہ زندہ تھا اور زندہ رہے گا۔ وہ ایک مثالی انسان تھے۔ میرا نام تو طلحہ رکھا گیا تھا لیکن چاچو کے نام کو زندہ رکھنے کی خاطر سب مجھے محسن کہنے

لگے۔ چاچو کو ماورا نام بہت پسند تھا۔ چوتھے سال ماورا پیدا ہوئی تو سب نے مشترکہ فیصلے سے اس کا نام ماورا ہی رکھا۔ بلکہ ولدیت کے خانے میں محسن چاچو کا نام ہی لکھ دیا۔ کیونکہ یہ بھی ان کی ایک آرزو تھی۔''

میں سنتی رہی، سوچتی رہی۔ اس گھر میں جذبوں کی پذیرائی آج بھی اسی انداز میں کی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ سب مادہ پرست ہرگز نہ تھے میری طرح۔ مجھ میں یہ اعتراف کرنے کی جرأت پیدا نہ ہوئی کہ میں ہی فضہ عبداللہ تھی۔ میں ہی آرزوؤں کی قاتل تھی۔

محسن حسن پھر بولا۔

''اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ شانزہ نے میرے ساتھ ویسے ہی رویے اختیار کیے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے اپنے چاچو کی وجہ سے ایسی لڑکیوں سے نفرت ہے۔ بے شک میں مکمل ایمان داری سے شانزہ کو لائف پارٹنر بنانا چاہتا تھا لیکن آج اسے اپنے ذہن سے دور کرتے ہوئے مجھے کوئی ملال نہیں۔ اپر کلاس کی لڑکیاں مڈل کلاس کے لڑکوں کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں پلیز آپ ماورا کو بلوا دیں۔ میں اسی وقت واپس جانا چاہتا ہوں۔'' وہ انتہائی رکھائی کے ساتھ بولا۔

''دیکھو بیٹے! اس وقت تم شانزہ کے نہیں میرے مہمان ہو۔ اور لبنیٰ کے توسط سے مجھے عزیز بھی ہو۔ آئے کسی کی مرضی سے بھی ہو لیکن یہاں سے جانا میری مرضی کے مطابق ہوگا۔ انڈر اسٹینڈ۔'' میں نے دوستانہ ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اس لڑکے کی صاف گوئی نے مجھے متاثر کیا تھا۔ وہ نڈر اور بے باک تھا۔ یہ خوبیاں میرے دل میں گھر کر گئی تھیں۔ مجھے اس میں محسن اسد کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس کی ذات کو سامنے پا کر شاید میں یہ بھی بھول گئی تھی کہ محسن اسد اس دنیا میں نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کھانے کی میز پر تھے۔ میں اصرار کر کے ایک ایک چیز اسے کھلا رہی تھی۔ پھر میں نے اسے آرام کی غرض سے مہمان خانے میں بھیج دیا اور خود اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ آنسو جنہیں میں نے بڑے ضبط کے ساتھ باہر آنے سے روک لیا تھا۔ پھر بہہ نکلے۔ محسن اسد کی یادیں میرے چاروں اطراف جمع ہو گئیں۔ ایک حرف ایک ایک لفظ، اس کی محبت، اپنی جفا، اس کے غم، اپنی خوشیاں۔

''محسن! تم نے حقیقتاً اپنا آپ میرے نام لگایا تھا۔ کب کسی اور کے ہو سکے۔ میں واقعی جفاجو اور دھوکے باز تھی۔ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر بہانہ بنا کر تم سے دامن چھڑا لیا۔ میں تمہاری عظمتوں کے آگے سرنگوں ہوں۔ میرے تصور میں پہلے دن والا محسن اسد آ گیا۔

سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ موسم میں تھوڑی سی تبدیلی آ چکی تھی۔ آج لڑکیاں جلدی لوٹ آئیں۔ حسب سابق آج بھی وہ سب بے حد خوش تھیں۔ میں نے سب کو اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ شاہنواز ان کے

ساتھ نہیں تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تک نہیں۔ شانزہ نے اندر آتے ہی کہا۔
''ممّا! کوئی اطلاع تو نہیں ملی آپ کو؟''
''کیسی اطلاع؟''
''محسن کے آنے کی۔'' شانزہ یہ نام لیتے ہوئے پھر چھوئی موئی بن گئی تھی۔ میں اس کے دل کی حالت جان گئی۔
''آنٹی! آج تو ہم لوگ صرف محسن بھائی کی وجہ سے تفریح چھوڑ کر آئے ہیں۔'' یہ انیسہ تھی۔
''ہاں، وہ گیسٹ روم میں آرام کر رہا ہے۔''
''اور ممّا پاپا نہیں آئے؟'' ماورا نے بے تابی سے سوال کیا۔
''نہیں۔'' میں نے مختصراً کہا۔
''ممّا! خیریت ہے۔ آپ بہت زیادہ اپ سیٹ ہیں۔'' شانزہ کے لہجے میں تشویش تھی۔
''خیریت ہی خیریت۔'' میں نے کئی بار منہ دھویا تھا، لیکن میری آنکھیں گریہ وزاری کی چغلی کھا رہی تھیں۔
شام کی چائے ڈرائنگ روم میں پی گئی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے فون میرے قریب لا رکھا۔ لڑکیاں باتوں میں مگن تھیں۔ ماورا محسن سے محوِ گفتگو تھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ لائن پر عفت آرا تھیں۔
''یہ ماورا کون ہے فضہ؟'' ان کا پہلا سوال تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔
''شاہنواز نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔'' میں نے چند لمحے سوچ کر مدلّل جواب دیا۔
''میں اس سے نہیں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں۔''
''آپا! وہ ایک معصوم سی پیاری سی لڑکی ہے اور میری مہمان ہے۔''
''تم غلطی پر ہو فضہ۔ شاہ نواز تو اسے اپنی زندگی بتا رہا ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''
''آپ کو کیسے خبر ہے اس سب کی؟''
''وہ ابھی ابھی آیا ہے۔ میں نے اس کے سامنے شانزہ کا معاملہ رکھا وہ تو ایک منٹ کے لیے یہ بات سننے پر آمادہ نہیں تھا۔ صاف کہہ ڈالا کہ شادی کرے گا تو ماورا سے۔''
''آپا! اس خاندان کے مرد چند دنوں میں ہر عورت سے اسی طرح متاثر ہو جاتے ہیں۔'' میں نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔
''فضہ میرے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ میں سرفراز کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ وہ کب شاہنواز کی یہ حرکت قبول کرے گا۔ جبکہ شاہنواز نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ مجھے سنا دیا ہے۔''
''تو میں کیا کہہ سکتی ہوں آپا اس معاملے میں۔'' حالات بے حد الجھے ہوئے لگ رہے تھے۔ بات دونوں طرف سے ہی بگڑی ہوئی تھی۔

''خیر، میں سرفراز سے بات کرنے کی کوشش کروں گی۔ دیکھو فضہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ان لڑکیوں کو یہاں سے بھیج دو۔ معاملہ کچھ اور آگے بڑھ گیا تو ہم سے کسی کی راہ نہ روکی جا سکے گی۔''

میں پریشان پہلے بھی تھی۔ اب مزید بگڑ گئی۔ کیا چکر تھا یہ۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جب میں فون کر کے اٹھی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ میں شانزہ کے رہائشی کمروں کی طرف بڑھی۔

''پاپا کی دولت، ان کا اسٹیٹس، یہ شہرت اور خاندانیت میرے دل کو سکون نہیں دے سکتے۔ محسن حسن میں جانتی تھی کہ تم بوژروا طبقے کی لڑکیوں سے نفرت کرتے ہو۔ صرف اس بنا پر کہ ان میں سے ایک نے تمہارے چاچو کو دھوکا دیا تھا۔ خود مجھے بھی اس عورت سے ہمیشہ نفرت رہے گی۔ پیار کے انمول جذبے ٹھکرائے جانے کے لائق نہیں ہوتے۔ میں نے اپنا آپ تم سے چھپایا تو صرف اس لیے کہ کہیں تمہارے اندر موجود اچھے جذبے میرے لیے ختم نہ ہو جائیں۔ مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے محسن حسن! پاپا نے یہ دولت مجھے دی بھی تو میں اسے ٹھکرا دوں گی کہ میں نے اپنی ماں کو اس دولت کے سائے میں چین کا ایک لمحہ بسر کرتے کبھی نہیں دیکھا۔''

''اچھی لڑکی! تم تو ناراض ہونے لگیں۔ حقیقت ہر حال میں قائم رہتی ہے۔ نفی کرنے سے تم اپنی ولدیت کے خانے میں کوئی اور نام تو نہیں لکھ سکتیں۔ ہر حال میں نواب زادہ سرفراز خان کی بیٹی ہی رہو گی۔''

''اور یہ اتنا بڑا گناہ بھی نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔''

''جذباتی فیصلے بعض اوقات نقصان بھی دے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تم ساری عمر ایک پچھتاوے کا شکار رہو۔''

''باوجود اس کے کہ تم وکیل نہیں ہو۔ بحث میں تم سے جیتنا محال ہے۔'' شانزہ کی ہلکی سی ہنسی میرے کانوں میں گونجی۔

''باوجود اس کے کہ میں اپنا فیصلہ تمہارے خلاف دے چکا تھا تمہیں قبول کرتا ہوں نواب زادی شانزہ سرفراز۔'' وہ بھی ہنسا۔

میں واپس پلٹ آئی۔ کمرے میں دوسری لڑکیاں بھی موجود تھیں اور گفتگو میں وہ بھی حصہ لے رہی تھیں۔ اپنے کمرے میں جا کر میں نے ملازمہ کے ہاتھ شانزہ کو بلوا بھیجا۔

''بیٹھو شانزہ! مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔'' میرا غیر معمولی لب ولہجہ میری ذہین بیٹی کو چونکا گیا۔

''ممّا! اگر وہ بات شاہنواز سے متعلق ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ میں ایک لمحے کو انہیں اپنا ماننے پر تیار نہیں ہوں۔''

''اس کی وجہ؟ جبکہ اس کی ذات میں ایسی کوئی خامی بھی نہیں۔''

''یہ سچ کہا آپ نے۔ میں شاہ نواز بھائی کو بہت غلط سمجھتی تھی لیکن چند دن ان کے قریب رہ کر ان

کی اصلیت سے آگاہی ہوگئی۔"

"پھر یہ گریز کیوں؟"

"میں اپنے معاملات کی ذمہ داری اپنے اوپر ڈالنا پسند کرتی ہوں مما! گریز صرف اس لیے کہ جیون کی راہوں کا ہم سفر میں نے ایک اور بندے کو چُنا ہے جو میرا ہم مزاج، ہم ذوق ہے۔ اسی طرح شاہنواز بھائی بھی صرف ماورا کی ہم راہی میں خوش رہ سکتے ہیں۔ سگے چند دنوں میں ہی وہ حاصلِ حیات سمجھنے لگے ہیں۔ مما کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ لوگ دولت کے بے بنیاد فرق کو مٹا کر ہمیں اچھی زندگیاں گزارنے کا موقع دے دیں۔" وہ راست گوئی سے کام لے رہی تھی۔ میں اس جرأت پر حیران تھی۔

ان لمحوں میں میں نے عہد کرلیا۔ اپنی بیٹی کو وہ غیر محسوس خوشیاں دینے کا، جن سے دل شاد رہتے ہیں۔ میں نے عہد کرلیا سرفراز خان سے ٹکر لینے کا۔ معصوم دلوں کے ارمان پورے کرنے کا۔ شادی ہی تو زندگی کا اہم موڑ ہوتا ہے۔ جو پوری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے۔

اسی رات میں نے ٹیلی فون پر سرفراز خان سے بات کی۔

"سرفراز خان! ہمیں ایک دوسرے سے کوئی شکوہ نہیں۔ میں نے زر و جواہر اور شہرت کی جھوٹی خوشیوں کے سائے میں اور آپ نے عارضی سہاروں کے سائے میں زندگی گزار دی۔ لیکن اپنی بیٹی کو میں سچی خوشیاں دینا چاہتی ہوں۔ اس کی شادی جاگیر سے نہیں اس انسان سے ہوگی جسے اس کا دل قبول کرے گا۔"

میں منتظر تھی، اس کے سخت لہجے کی، اس کے سخت فیصلے کی۔

"کیا بات ہے فضہ؟ یہ تم دونوں خواتین نے میرے جاتے ہی ساز باز کرلی ہے شاید۔"

میں جان گئی دوسری خاتون کون تھی۔ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

"سچ سچ بتاؤ یہ تم دونوں کی آرزو ہے یا شاہنواز اور شانزہ کا فیصلہ۔"

"کیا آپا نے آپ کو اور کچھ نہیں بتایا؟"

"بتایا ہے لیکن صرف شاہنواز کے بارے میں۔ کیا شانزہ بھی۔۔۔"

"ہاں سرفراز خان! شانزہ کو جو حق اللہ کے قانون اور شریعت نے دیا ہے ہم اس سے وہ حق نہیں چھینیں گے۔"

"تم اپنے گھر کی مطلق العنان حکمران ہو۔ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار یقیناً تمہیں ہے۔"

"شکریہ سرفراز خان! یہ خوشی دے کر آپ نے تمام محرومیوں کا ازالہ کردیا۔ ورنہ مجھے ساری دولت آپ کی نذر کرکے یہ خوشیاں خریدنا پڑتیں۔ حتیٰ کہ جان دینا پڑتی تو دریغ نہ کرتی۔"

"یور میجسٹی، شانزہ صرف آپ کی ہی نہیں میری بیٹی بھی ہے۔" وہ موڈ میں تھا۔

"اور ہاں! شاہنواز نے تو اسی کامنی سی لڑکی کو ہماری بہو چنا ہے نا جس کا نام ماورا محسن تھا۔"

خلافِ توقع اسے ماورا یاد تھی۔

''جی ہاں۔''

''لیکن وہ نامعقول لڑکا کیا اس قابل بھی ہے کہ ہم بصد فخر اسے اپنا بیٹا کہہ کر لوگوں سے متعارف کرا سکیں۔'' اس کی حسنِ ظرافت جاگ اٹھی تھی۔

''خود ہی دیکھ لیجیے گا میں کیا کہوں۔''

''فضہ۔۔۔!''

''ہوں۔''

''تم نے شانزہ کو ہمیشہ گھر سے دور رکھا تو مجھے کبھی یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ میں ایک بیٹی کا باپ ہوں۔ لیکن یہ پانچ دن جو میں ایک نہیں کئی بیٹیوں کی سنگت میں گزار آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے اندر تک بدل دیا ہے۔ اب سرفراز خان وہ نہیں رہے گا جو آج سے پہلے تھا۔ وہ غفور الرحیم تو، توبہ کے دروازے ہر دم کھولے ہی رکھتا ہے۔''

میری آنکھیں بھر آئیں، تشکر کے احساس سمیت۔

❁❁❁❁

زیادہ عرصہ نہ گزرا، صرف چھ ماہ۔ ان چھ ماہ میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ داستان تو یہ بھی طویل ہے لیکن آپ کو تفصیل سے نہیں بتاؤں گی۔ میجر حسن اسد تک، جو اب بھی فوج میں اعلیٰ عہدے پر تھے، کیسے پہنچی۔ کیسے ان سب پیارے لوگوں سے معافی طلب کی۔ کیسے ان کے دلوں تک رسائی پائی۔ بس وہ سب فراخ دل تھے۔ میری ہر خطا بھلا ڈالی انہوں نے، اور حسبِ وعدہ محسن حسن یا شانزہ پر یہ ظاہر ہی نہ ہونے دیا کہ میں ہی وہ لڑکی تھی جس سے وہ دونوں شدید نفرت کرتے تھے۔

اس گھر میں چپہ چپہ، گوشہ گوشہ یادوں کا امین تھا۔ اس اسیرِ وفا کا جس نے وفا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ جس نے اپنا ہر کہا پورا کر دکھایا تھا۔ ڈرائنگ روم میں سجی اس کی بڑی ساری تصویر ہر نئی صبح کے اجالے میں ایک تازہ پھولوں کے ہار سے سجی رہتی تھی۔ پچیس سال گزر جانے پر بھی۔

میں اس کی عظمتوں کے آگے اپنی پستیوں سمیت سخت نادم اور شرم سار تھی، سرنگوں تھی۔

سرفراز خان اسلام آباد سے خصوصی طور پر شاہنواز کے بزرگ کی حیثیت سے حسن اسد کے پاس آیا۔ اس کا پرپوزل دینے، جسے بصدِ احترام انہوں نے قبول کیا۔ اگلے ہفتے وہ سب لوگ صادق گنج میں شانزہ کے لیے آئے۔ دونوں شادیاں مقرر ہو گئیں اور پھر انجام بھی پا گئیں۔

ذہنی طور پر میں پُرسکون ہو گئی۔ محسن حسن دوسری بار آیا تو محسن اسد کی ایک تصویر میرے گھر کے اس وسیع کمرے میں آویزاں کر گیا۔ جو میں نے اس کے اور شانزہ کے لیے نیا سجایا تھا۔

''ممّا! چاچو کے بغیر مجھے قرار نہیں آتا۔ اس لیے یہ تصویر یہاں لے آیا۔''

''اچھا کیا بیٹے۔''

اب کیا کہتی کہ میری

شہیدِ وطن کی نذر کرتی ہوں

آج کل میں سو

ایک ہار شہیدِ وفا

اور دوسرا اسیرِ وفا

Pakistanipoint
Waqar
Azeem

روز میں خود اپنے ہاتھوں ہار گوندھ کر اس

افہ کر دینا چاہیے۔

زہرہ آج کل بھی میر

ں حسن اسد کی تصویر دکھائی۔ شاید وہ اس کی

اہمیت سمجھنے سے قاصر ہو۔ لیکن اس ی

ے حضور نم تھیں۔

زہرہ بہت خوش ہے۔ گلزار کو سنسان دیکھ کر۔ اب گلزار میں کوئی عورت نہیں جو سرفراز کو اداؤں کے جال میں گرفتار کر سکے۔ وہ سارا پیسہ اس نے ان عورتوں کے نام لگا دیا ہے جو زہرہ کی طرح غیرت مند اور باحیا ہیں اور اس کا یہ عمل مجھے بھی سکون دیتا ہے۔